تاریخ نسیمی

بلوچ و بلوچستان

(7)

''تاریخی اغلاط نامے''

(حصہ اول)

الفت نسیم

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

www.balochiacademy.org

Email: balochiacademy@gmail.com

©بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

کتاب کا نام	:	تاریخی اغلاط نامے
مصنف	:	الفت نسیم
کمپیوٹر کمپوزر	:	عزیز جمالدینی
پرنٹرز	:	شوکت برادرز پریس، کراچی
تعداد	:	500
قیمت	:	400

ISBN: 978-969-9768-70-5

فہرست

نمبر شمار	موضوع	صفحہ
1	عرض ہے.....پیش لفظ.....	5
2	آری یاباری بیر	11
3	اعلمش روی	19
4	انکاریہ	27
5	باروہی	31
6	براہمی	34
7	بروھی	36
8	بُرزکوہی	40
9	بُرفت/بلفت	56
10	بگٹی	58
11	بلوچ تاریخ پر مفروضہ ترکی اور افغانی چھاپ	64
11	(الف)اورماڑہ	65
11	(ب)رئیسانی	69
11	(پ)زرکزئی	74
11	(ت)شال	81
11	(ج)شہزادہ	83
12	بلوچستان نام	87
13	بلیدہ	92
14	بولان	97
15	بیزنجو	101
16	پنجگور	108
17	تاریخ قلات پر آخوند محمد صدیق کے مفروضے	114
(الف)	قلات پر میروانی بالادستی	115
(ب)	رند سردار میر چاکر خان کا قلات پر حملہ	123
(پ)	میر مندو رند کی حکمرانی	129
(ت)	بی بی مہناز	132

(ج)	میر بجار کی رندوں سے لڑائی کی تیاری	134
(د)	میر بجار کا منگچر میں میر مندو کے بارے میں معلومات لینا	139
(ذ)	میر بجار کا قلات میں سیاہی رئیس کے پاس آنا	142
(ر)	میر بجار کا سوراب اور وڈھ میں بلوچوں کا قتل کرنا	167
(ز)	میر بجار کا قلات پر قبضہ اور بادیہ نشینی	174
(ژ)	مغلوں کی آمد	178
(س)	میر حسن خان کی حکمرانی	182
(ش)	لاولد میر حسن	186
(ص)	لاولد میر بجار	186
18	تخت سلیمان	188
19	تالپر	192
20	جام خاندان	198
21	جاموٹ اور کچھی کے جاٹ	206
22	چلتن	218
23	حلوائی	227
24	خاران	233
25	ڈوڈکی	243
26	ڈومبکی	247
27	رند قبیلہ۔۔۔علافی عرب؟	256
28	رئیس	272
29	ساجدی رسگھنائی	294
30	سردار خان گشکوری کے مفروضے	303
30	(الف) بُھو قبیلہ	303
30	(ب) جلال خان رند۔۔۔رند جڈ امجد	308
30	(ج) ماہری رمہیری	312
30	(د) میروانی قبیلہ	314
30	(ر) نمرودی رنہمردی	330
30	(ز) نوحانی قبیلہ	332
31	''سرزمین بلوچ'' کے مصنف مولائی شیدائی کے مفروضے	338
32	سُمالانی	349
33	سُہر قبیلہ	350
34	سیوی	354

35	شیخ حسینی	360
36	قبیلہ مری	362
37	قفص رکوچ رکوچ	372
38	قلندرانی	375
39	کتاب "بلوچستان" نامی کے اخبارنویس مصنّف کے مفروضے	376
39	(الف) مینگل	378
39	(ب) زرّک زئی	378
39	(ج) سہنک زئی	379
39	(د) رئیسانی	379
39	(ر) سرپرہ	380
39	(ز) احمدزئی	382
40	کمبرانی	385
41	کولواہ	392
42	کوہ نور ہیرا	395
43	کہیری	403
44	کیچ	408
45	گاجان	412
46	گدروشیاو بلوچ بدروچ وگدور	414
47	گزینی مری	419
48	لُمری رنومزی رنہمردی	424
49	مکران	433
50	مند	452
51	میران شاہ کا خضدار پر حملہ	454
52	میروانی، گرگیناڑی وغیرہ	456
53	مینگل	463
54	نال	473
55	والدہ میر بجار میروانی	476
56	یوروپی مصنّفین کے مفروضے	480

عرض ہے

''تاریخی اغلاط نامے'' وہ تاریخی مفروضے اور غلطیاں ہیں جو بلوچ اور بلوچستان کے موضوع پر تحریر کی گئی سینکڑوں مضامین اور کتب کے مطالعہ کے دوران ہمارے علم میں آئی ہیں اور جن کے بارے میں ہم بلوچ قوم میں دستیاب صحیح تاریخی روایات اور محققین کی صحیح تحقیقات کی بنیاد پر ان کی وضاحتیں کر سکتے ہیں۔ اور ان مفروضوں اور بے سروپا تحریروں کی اصلاح کر کے بلوچ تاریخ کو درست سمت میں ڈال سکتے ہیں اور تاریخ کے قاری کو بلوچ اور بلوچستان سے متعلق کئی موضوعات پر حقائق سے آگاہی دے سکتے ہیں۔ جنہیں بے شمار مصنفین اور راویوں کے سطحی، اختراعی اور دروغ گوئی پر مبنی سینکڑوں تحریروں اور تصنیفات نے اپنے وطنی اور قومی تواریخ سے بیگانہ کر دیا ہے۔

مندرجہ بالا تصنیفات کے خالق زیادہ تر غیر ملکی و ملکی مگر غیر بلوچ ہیں جن کا بلوچ کلچر، زبان اور ہزاروں سالوں پر محیط تاریخ پر دسترس تو اپنی جگہ، ان کا مطالعہ بھی گہرا نہیں ہے۔ ان کی تصنیفات میں خود ان کی اپنی تحقیق صفر دکھائی دیتا ہے۔ اور جو کتابی حوالے ان کی تصنیفات میں ملتے ہیں ان کتب کی اپنی معلومات محض سُنی سُنائی باتوں اور

خود ساختہ مفروضوں پر مبنی ہیں۔ جنہیں نئے مصنفین دھرا دھرا کر تاریخی سچ بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں تاریخی سچائیاں پس پردہ ہی رہتی ہیں اور تاریخ کے طالب علم کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا اور بے بنیاد مفروضے اُن کے ذہن پر ثبت ہوتے رہتے ہیں۔

بلوچ اور بلوچستان سے متعلق بے شمار وطنی، قومی، قبیلائی، علاقائی، سماجی، تہذیبی اور لسانی موضوعات کا گہرا مطالعہ اور ان کی مخلصانہ تحقیق اور عقدہ کشائی میں جو حقیقی نتائج ہمیں حاصل ہوئے ہیں ان موضوعات کو ہم ابجد کی ترتیب سے پیش کریں گے۔ جن معاونین نے اس تاریخی تحقیقی مصروفیات میں ہمارا ساتھ دیا ہے اور دامے، درمے، سخنے اور سفرے مدد کی ہے ان محسنوں کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

واجہ محمد امین بلوچ رودینی پنجگور، حاجی بہار علی بلوچ کراچی، پیر محمد رئیس گوارگو پنجگور، سلیمان پنجگور، ماسٹر محمد علی عارف شنبہ زئی پنجگور، صوفی جمیل احمد پنجگور، جمیل احمد کمبرانی آواران، واجہ فقیر جان رئیس وشبود پنجگور، میر دوست محمد پنجگور، میر غلام قادر رئیس گرمکان پنجگور، واجہ فقیر محمد بلوچ کوئٹہ، بابو یار جان چتکان پنجگور، ملک دادرحمان پنجگور، پروفیسر میر حسن گچکی پنجگور، میر محمود خان گچکی سوردو پنجگور، حاجی محمد عمر گرمکان پنجگور، بزرگوار غلام محمد، واجہ محمد حسین پنجگور، محمد خان گوارگو پنجگور، میر علی محمد رودینی پنجگور، کرم بیگ رئیس کچک پنجگور، میر نظر محمد گرمکان پنجگور، میر رحیم داد گرمکان پنجگور، صوفی عبدالصمد خدابادان پنجگور، رحمدل درازئی کیلکور پنجگور، عزت خان خضدار، حاجی کریم بخش کرد خضدار، حاجی

محبوب علی لاہڑی خضدار، سردار عبدالعزیز عمرانی خضدار، میر کلملی زرکزئی خضدار، عبدالسلام رودینی خضدار، سومار نقوانی خضدار، حاجی محمد حسن زہری خضدار، ولی محمد کرد خضدار، خدا بخش میراجی مینگل خضدار، حاجی نیک محمد مینگل خضدار، میر عبدالقادر مینگل وڈھ خضدار، مولوی محمد موسیٰ محمد حسنی خضدار، میاخان شاہی زئی خضدار، میر محمد حسن شاہی زئی خضدار، عبدالرزاق بیزنجو کراڑو خضدار، شیخ نور محمد ساسولی خضدار، پیر محمد سالانی سونارو خضدار، محمد صدیق لغاڑی سوراب، سردار قادر بخش میروانی مشکئے، چاکر عمرانی کولواہ، سردار عارف جان محمد حسنی مشکئے، میر محمد خدرانی ماڑی خضدار، امیر بخش باراں زئی مُولہ خضدار، گاجیاں جام خضدار، بلک گورین نال خضدار، حاجی الٰہی بخش ہیبوانی ساجدی مشکئے، سیٹھ مراد بخش پنجگور، میر عیسیٰ جہانگیرزئی پنجگور، حاجی عبدالعزیز بلوچ خضدار، سردار محمد بخش سیاہ پاد پارکو خضدار، میر شاہ سلیم حاران، میر نصرت اللہ سنجرانی چاغی، عزیز احمد سنجرانی چاغی، میر محمد ہاشم سنجرانی چاغی، میر شیر علی خان نوشیروانی حاران، سردار محمد یوسف خان ساسولی خضدار، عبدالحمید عباسی کراچی، جاموٹ عبدالغفور موسانی ریڑھی گوٹھ کراچی، میر محمد وسیم تالپر کراچی، نیاز علی بروہی شہداد کوٹ، حاجی بچل نظامانی جھڈو سندھ، جمن خان جمالی گوٹھ سہراب جمالی سندھ، بیبت خان مری نوشہرو فیروز سندھ، حاجی ملک احمد خان کاسی سریاب کوئٹہ، نیک محمد رند سبی، میر محمد یوسف نسکندی کراچی، میر ولی محمد ہوت کیچ، محمد ابراہیم جلیس نگوری کیچ، حاجی مراد جام شولیگ دشت کیچ، محمد امین جام دشت کیچ، مراد خان رند کیچ، میر دوست محمد سنگر کیچ، میر ڈرا اپسی کہن کیچ، واجہ سید

ابراہیم شاہ رودبن کیچ، حسین علی رئیس کونش کلات تمپ کیچ، عبدالقادر رئیس نذر آباد کیچ، بیگ محمد ہوت مند کیچ، عبدالمجید رئیس ملک آباد تمپ کیچ، میر عیسیٰ قومی تربت کیچ، عبدالرشید گورگیج کیچ، ملا احمد دشتی تربت کیچ، صوفی کریم بخش، بشیر احمد کیچ، کہدا کریم داد، رزائی کوہک دشت کیچ، مراد پٹیل تمپ کیچ، منیر احمد حسیر آباد کیچ، رحیم بخش گاجی زئی حسیر آباد کیچ، عبدالصمد بالگتری کیچ، فضل حسین پنودی کیچ، ملا مصطفی پنودی کیچ، شکیل شاہ بلیدہ کیچ، محمد موسیٰ رند سنٹ سر گوادر، محمد جان پیشکان گوادر، میر شیر محمد شنبہ زئی زامران کیچ، محمد اسحاق پیشکان گوادر، کہدا علی محمد رئیس، سردار میر محمد تمبرانی اورناچ خضدار، میر سنجر خان صوبدارانی جمالی، میر محمد نواز جمالی، میر شیر محمد صوبدارانی جمالی، میر برکت علی جمالی، امداد حسین جمالی، محمد ایوب صوبدارانی جمالی موندر کوٹ، محمد عظیم خان بارکزئی سرباز ایرانی بلوچستان، مولوی محمد کریم حسنی سرباز کلات ایرانی بلوچستان، محمد فاروق بڑ بلیدی راسک ایرانی بلوچستان، محمد الیاس بہرام زئی پیشن ایرانی بلوچستان، شفیع محمد بہرام زئی پیشن، خیر محمد کمالزئی میر، حاجی فیض محمد کمالزئی میر، میرزا کمالزئی میر، عبدالعزیز کمالزئی میر، محمد یعقوب میر اور محمد ابراہیم میر ایرانی بلوچستان، محمد نور سیاپاد پارکو خضدار، عتیق الرحمن ساجدی گریشہ خضدار، ملا نور محمد گاجیاں زئی گریشہ خضدار، سردار عبدالکریم ساجدی گریشہ خضدار، میر پسند خان ساجدی گریشہ خضدار، میر اللہ یار محمودانی گریشہ خضدار، میر شیر محمد کیازئی ساجدی گریشہ خضدار، میر دادرحمان ساجدی گریشہ خضدار، پڑدوک میروانی کوچہ ساجد خضدار، آغا ظاہر احمد زئی خضدار، آغا عبدالخالق احمد زئی خضدار، سردار عطا

محمد رودینی سوراب، سردار علم خان قمبرانی اور ناچ خضدار، میر محمد ابراہیم گرگناڑی گدر خضدار، قاضی حسن علی ساسولی خضدار، قاضی عبدالحمید شیرزاد خضدار، شیخ غلام قادر ساسولی خضدار، سردار محمد اسحٰق غدرانی خضدار، میر محمد اسحاق مردوئی خضدار، میر شاہداد باغبانہ خضدار، وڈیرہ محمد حسن انگاریہ کلمتی سونمیانی لسبیلہ، سردار محمد حسن بُرہ انجھل لسبیلہ، بی بی گنج حب لسبیلہ، قاضی عبداللطیف رونجھ لسبیلہ، حاجی چھتہ خان رند ساکران حب لسبیلہ، رجب علی رند حب لسبیلہ، جمن خان رونجھ بیلہ، مُلا احمد رونجھ بیلہ، خلیفہ خان محمد کلمتی شاہ نورانی لسبیلہ، عبدالعزیز لاسی حب لسبیلہ، عبداللطیف لاسی حب لسبیلہ، عبدالستار پٹواری حب لسبیلہ، عبدالحق بلوچ حب لسبیلہ، حاجی خالد بلوچ حب لسبیلہ، عبدالعزیز رند ساکران حب لسبیلہ، محمد مراد گجر حب لسبیلہ، بھیو گجر حب لسبیلہ، میکصال شیخ احمدی ہنگول لسبیلہ، شنگر شیخ احمدی ہنگول لسبیلہ، محمد داؤد لاہڑی کوئٹہ، فضل حسین بگٹی کوئٹہ، بنگل خان بگٹی کوئٹہ، محمد خان مری کوئٹہ، احمد شاہ مری کوئٹہ، شاذین مری کوئٹہ، میر محمود عزیز کرد کوئٹہ، نواب عبدالقادر شاہوانی کوئٹہ، ملک شیر محمد لاہڑی کوئٹہ، پیر محمد زہیرانی کوئٹہ، محمد نسیم لاہڑی کوئٹہ، میر فتح محمد زہیرانی لاہڑی کوئٹہ، ملک محمد پناہ کوئٹہ، حاجی غوث بخش قلندرانی کوئٹہ، عبدالحکیم قلندرانی کوئٹہ، شیر محمد سالانی کوئٹہ، نواب غوث بخش رئیسانی کوئٹہ، منیر احمد محمد شہی مستونگ، بکری محمد اسلم محمد شہی مستونگ، ملک خدا بخش محمودزئی دہوار مستونگ، ملک محمد رمضان بلوچ مستونگ، ٹھیکدار محمد عالم لانگو منگچر، میر عبدالخالق لانگو منگچر، سردار حبیب اللہ کبرانی مشکے خضدار، سیٹھ چھبیل داس خضدار، مہاراج لکھمی چند

قلات، سردار کیا خان ریکی حاران، عبدالواحد کمالزئی میر، عبدالغفور دہانی نوکیں دہ نسکند ایرانی بلوچستان، میران حسن داؤدی درزادہ، شنبہ بلوچزئی درزادہ سرباز کلات، محمد حسن آرامش پیردان، میاداد صالح زئی، میر صالح محمد خورد گیر ایرانی بلوچستان، سید اٹل شاہ بھاگ کچھی، صوبدار خان گشکوری سبی، جام میر غلام قادر عالیانی کراچی، محمد مراد آوارانی، محمد حسن زہری کیچ اور دیگر کئی مہربان جن کے اسماء ہماری یادداشتوں میں لکھنے سے رہ گئے ہیں۔

یہاں پر یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ متذکرہ بالا معاونین سے ہمارا رابطہ 1981ء سے 2012ء تک کے درمیانی عرصے پر محیط ہے۔ ان محسنین میں سے کئی اب دنیا میں موجود نہیں رہے لیکن جو علمی اور تاریخی یادداشتیں انہوں نے اپنے سینوں سے ہمیں منتقل کیا ہے وہ انمول ہے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

الفت نسیم۔ حب لسبیلہ بلوچستان

جولائی 2013

آری یا ہاری پیر

بلوچستان کے ضلع لسبیلہ میں بمقام بیلہ ایک قدیم عمارت موجود ہے جسے بعض لوگ پیر آری اور بعض لوگ "ہاری پیر" کہتے ہیں۔ آری پیر کے نام سے ڈریجی علاقے میں بھی ایک قدیم زیارت ہے۔ جہاں پر زمانہ قدیم سے لوگ اپنی مرادیں مانگنے کے لئے آتے ہیں۔ بیلہ کے پیر کو آری کم "ہاری پیر" زیادہ تلفظ کیا جاتا ہے۔ یہ "ہاری" یا آری پیر کون تھا۔ بیلہ میں دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک روایت بتاتی ہے کہ یہ مقبرہ یا زیارت مشہور مسلمان بلوچ جرنیل اور خلیفہ حجاج بن یوسف کی طرف سے مکران کے گورنر محمد ہارون کی ہے جو دیبل کی مہم میں محمد بن قاسم کے ساتھ تھا۔ جو دوران سفر علیل ہوئے اور بیلہ کے علاقے میں دوران قیام انتقال کر گئے تھے۔(12)

چونکہ محمد بن ہارون بیلہ کے علاقے میں فوت ہو گئے تھے اس لئے اکثر لوگ مذکورہ ہاری پیر کو اسی سے منسوب کرتے ہیں اور تحریروں میں بھی اسی روایت کو جگہ دی گئی ہے۔ جیسے کہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اپنی سندھی تالیف "بیلائیں جا بول" (1) (بیلہ والوں کی شاعری) میں خیال ظاہر کیا ہے کہ غالباً پیر آری کے نام سے مشہور و معروف مقبرہ پہلا مسلمان فاتح محمد بن ہارون کا ہے۔ جو کہ غلط ہے۔ معروف تاریخ و جغرافیہ نویس البلاذری نے لکھا ہے کہ محمد بن ہارون نے ارمابیل کے قریب

وفات پائی اور وہ قنبل میں دفن ہوئے (2) قنبل دراصل وہی مقام ہے جسے کئی عرب جغرافیہ نویسوں نے "قنبلی" لکھا ہے۔ ارمابیل یا ارمن بیلہ یعنی موجودہ بیلہ کے قدیم نقشوں میں قنبلی، بیلہ نہیں ہے بلکہ اس سے کافی ہٹ کر اور سمندر کے قریب ہے اگر ان نقشوں میں دیئے گئے مقامات کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ مقام بلاشک وشبہ قدیم کا ہیرہ یا کانھیارہ کوٹ یا اس سے قریبی کوئی جگہ ہوگا۔ لہذا بیلہ شہر میں موجود "آری یا ھاری پیر" کو محمد بن ہارون کا مقبرہ سمجھنا ایک غلط فہمی اور بے بنیاد روایت ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی نیم نام کر کے پکارا نہیں گیا تھا۔

جس دوسری روایت کی بات کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ بیلہ کا ایک جاموٹ حکمران تھا جس کا نام عاری جام تھا۔ جو کسی دوسرے ملک سے آیا تھا جس نے بادشاہی میں فقیری اختیار کی اور اپنے ایک مرشد کے کہنے پر اقتدار سے دست بردار ہوا اور اقتدار اپنے بیٹے جمشید جاموٹ کو دے دیا۔(3) اس کے پاس جتنی دولت اور خزانہ تھا اس کے تین حصے کئے۔ ایک حصہ جمشید کو خزانہ کے لئے دیا۔ دوسرا حصہ اس کے مہمانوں اور گھریلو خرچے کے لئے دیا اور تیسرا حصہ غریبوں اور مسکینوں میں خیرات کیا۔ حکمرانی چھوڑنے کے تیسرے سال قضائے الٰہی سے راہی ملک عدم ہوئے۔ اس روایت کے مطابق مذکورہ زیارت اسی عالی جاموٹ (4) کی ہے۔

اس روایت کے پیچھے جو تاریخ ہے وہ یہ ہے کہ میر عالی ہوت، جو جام ہوت بھی کہلاتا تھا، کیچ مکران کا حکمران تھا اور سسی پنوں رومان کے ہیرو میر پنوں جام ہوت کا باپ تھا۔ قبیلہ ہوت میں اس کا طائفہ نونک تھا (5) سسی پنوں رومان کے نتیجے

میں اس نے سردار میر باراں ہوت (6) کی سرکردگی میں ایک لشکر جمع کیا اور کیچ میں اپنا سہراب نامی بیٹے کو نائب بنا کر بیلہ کی طرف چل پڑا۔ بیلہ پر دھاوا بول کر اس پر قبضہ کیا اور جھجھور کی طرف پیش قدمی کرنے سے پہلے ایک بزرگ ہستی پیر کناڑہ کے پاس گیا (7) جنہوں نے انہیں آگے جانے سے منع کیا۔ اسی دوران اُسے سُنی پٹوں کی موت کی خبر ملی اور کیچ میں اپنے بیٹوں سہراب اور شیہک کے درمیان کشت وخون کرنے کی خبر پہنچی۔ اس نے کیچ کی طرف اپنے قاصد روانہ کئے اور کیچ کی حکمرانی سے دستبردار ہوئے اور بیلہ ہی میں اقامت گزین ہوئے۔ انہوں نے اپنے دربار میں پیروں اور فقیروں کو جگہ دیا اور ذکر وفکر میں مشغول رہا۔ چند عرصہ بعد اپنے ہمراہ لائے گئے بیٹے جمشید جام ہوت کے ہاتھ میں اقتدار دے دی۔ اور فقیروں کی صحبت میں گھرے رہے۔ تیسرے سال ان کا انتقال ہوا۔ پہلے ہی وصیت کی تھی کہ ان کے مقبرے پر کسی کو آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اُس کا مقبرہ ان کے مرشد اور بیلہ کی بزرگ ہستی پیر کناڑا کی پسند کی جگہ پر بنائی گئی۔ روایت بھی ہے کہ مذکورہ مقبرہ کی عمارت اُس کے حکمران بیٹے جمشید ہوت نے تعمیر کرائی ہے۔

بیلہ میں میر عالی ہوت کی حکمرانی کی تصدیق قدیم بلوچی شاعری سے بھی ہوتی ہے۔

"برزا اعظم خان انت جہلا تا کیچ کمبر انت
ڈھاڈرء میران ماں تلی سندھء عومر انت
بیلوء عالی ہوت ، سیوی ء چاکر انت"

ترجمہ :

بلوچستان کے بالائی علاقوں میں اعظم خان کی حکمرانی ہے جبکہ جنوب کی طرف سرحد کیچ تک میر کمبر (8) کی بالادستی ہے۔ ڈھاڈر (کچھی) میں میران رند، تلی سندھ (موجودہ علاقہ نصیر آباد و جیکب آباد وغیرہ) میں عومر (9) کی حاکمیت ہے۔ اور بیلہ میں عالی ہوت اور سیوی پر میر چاکر قابض ہے۔"

ایک اور نظم کے چند ابیات کے مطابق :

ڈزکء ہاشم خان ات ءُ سرحد کمبر آت
بیلوء عالی نوتک ءُ دلیء چاکر ات"

ترجمہ:

ڈزک (10) میں ہاشم خان کی حکومت تھی اور سرحد (11) پر کمبر حاکم تھا۔ جبکہ بیلہ میں عالی نوتک کی حاکمیت تھی اور میر چاکر کی شہرت دلی میں تھی۔"

مذکورہ بالا تاریخی جائزے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "عاری پیر" کا مقبرہ یقینی طور پر اسی حاکم بیلہ میر عالی ہوت کا ہے۔ اور اس کا تاریخی جرنیل محمد بن ہارون مکرانی سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

حواشی:

1۔صفحہ 13۔یہ کتاب لسبیلہ کی جدگالی زبان کی لوک شاعری پر مبنی ہے۔

2۔"فتوح البلدان" صفحہ 435

3۔جمشید کی اولاد ان کی نسبت سے "جمشیدی" کہلائے۔جو جامان لسبیلہ کا گھرانہ ہوتا تھا۔لیکن چند پشتوں کے بعد انہوں نے اس نام کو برقرار نہیں رکھا۔اور جاموٹ کہلائے۔اور پھر چند عرصے بعد انہوں نے اپنے کو "عالیانی" کا نام دیا۔روایات کے مطابق جام جمشید ہوت جو صرف جام ہوت بھی کہلاتا تھا کی تیسری پشت سے جام عالی خان جمشیدی کی نسل "عالیانی جمشیدی" کہلایا۔اور پھر جمشیدی پس منظر میں چلا گیا۔ سندھی تاریخ نویسوں نے پھر اس خاندان کا شجرہ نسب بھی بدل دیا ہے۔1901ء کی مردم شماری رپورٹ ہند جلد پنجم الف صفحات 111-110 میں جمشیدی جام خاندان کی تعداد صرف گیارہ نفوس درج ہے۔جو اس ہوت بلوچ خاندان کی اپنی نسل سے عدم دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے۔

4۔کچھ کا حکمران خاندان جسکے تاریخی تجارتی رابطے سندھ، گجرات کاٹھیاواڑ تک تھے اور جن کی رشتہ داریاں لسبیلہ کے جدگالوں سے تھے۔میر عالی ہوت کا گھرانہ جدگالوں سے رشتے ناطوں میں منسلک تھا اور قدیم بلوچی شاعری اور روایات کے مطابق ہوت قبیلہ کا جدامجد میر ہوت کی ماں جدگال تھی۔کچھ کے ان حکمرانوں کو سندھ اور لسبیلہ والے جام ہوت کہتے تھے۔چونکہ سندھی اور جدگالی میں "ت" کی جگہ "ٹ" بولا جاتا ہے اس لئے جام ہوت، اُن کے لہجے میں "جاموٹ" بنا۔

ہوت قبیلہ، مکران کے تاریخی قبیلہ رئیس کا سردار گھرانہ رہا ہے۔اور یہی سردار گھرانہ کے ہاتھ میں کچھ کی حکومت ہوتی تھی۔جسے ایران و مکران میں رئیس ہوت اور سندھ و لسبیلہ میں جام ہوت کہا جاتا تھا۔اسی لئے مکران اور لسبیلہ گزیٹر نے لکھا کہ رئیس اپنا تعلق لسبیلہ کے جاموٹوں سے بتاتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس سرزمین (مکران) کے قدیم ترین باشندے ہیں (بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر جلد ہفتم طبع 1907ء صفحہ 95)۔گزیٹر کا کہنا غلط ہے کہ رئیس، جاموٹ ہیں۔بلکہ جاموٹ قبیلہ رئیس ماخذ سے ہے۔جو ملک (مکران) میں سب سے بڑا قبیلہ شمار کیا جاتا ہے۔ (صفحہ 98)۔

سندھ کا صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی اور غلام محمد خانزئی نے اپنے اشعار میں میر عالی، اور شہزادہ پنوں کو "جام ہوت"، عاری جام اور جام پنوں کہا ہے۔

(دیکھئے سندھی ادب کی مختصر تاریخ از عبدالمجید میمن سندھی اور رسالو غلام محمد خانزئی اور کتاب "سچل سرمست")

5۔روایت یہ ہے کہ قبیلہ کا بنیادی نام "نودھ" تھا جسے بعض علاقوں میں "نوتھ" تلفظ کیا جاتا تھا۔ "نودھ" کا خاندان اپنے اس جدامجد کو اس کی زندگی میں پیار سے "نوتک" کہتے تھے۔اس طرح اس نام کی تین صورتیں مستعمل رہیں۔نودھ کے نام سے قبیلہ کی باقیات اب بھی لسبیلہ میں موجود ہیں۔اس کے علاوہ رندوں کی قلات میں ورود کے دوران بھی مستونگ میں اس قبیلہ کے گھرانے تھے۔1901ء کی مردم شماری

رپورٹ ہند میں لسبیلہ کے بلوچوں میں اس قبیلہ کے 139 نفوس کا اندراج ملتا ہے۔

6۔اس میر باران ہوت کے نام سے ہوت طائفہ "باران" تشکیل پایا جو سندھ اور ہندوستان کی سرحدی علاقوں تک جا کر آباد ہوا۔ جہلاوان اور کچھی میں بھی اس قبیلہ کی آبادکاری کے آثار ہیں۔ جہاں اس کے نام کے مواضع ہیں۔

7۔ کُناڑہ یا کونارہ، اس پیر یا بزرگ کا قبیلہ تھا۔اس کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ کونارہ قبیلہ لسبیلہ کے علاوہ کچھی اور قمبر (سندھ) میں بھی آباد تھا۔ غالباً جاٹ قبیلہ ہوگا۔ مذکورہ بزرگ جام عالی ہوت کا مرشد تھا۔ ان کی زندگی میں جام عالی ان کے مرید بنے تھے۔

8۔ یہ وہ میر کمبر رئیس ہیں جو علاقہ سرحد (موجودہ وقت میں ایرانی بلوچستان میں واقع ہے۔ جی پی ٹیٹ نے اپنی تصنیف "سیستان" میں لکھا کہ کرمان کے مشرقی اضلاع "سرحد" کہلاتا ہے) سے پنجگور تا حد کیچ تک کا حکمران تھا۔ اس کا مرکزی قلعہ پنجگور کے گچک میں تھا جو کمبر قلات کہلاتا تھا۔ وہ پنجگور کا باشندہ اور قبیلہ رئیس کے طائفہ "بورسوار" سے تھا۔ قلات سیوا کے حکمران کو جب سندھی اور بلوچ باغیوں نے تنگ کیا اور اس کی حکومت خطرے میں پڑ گئی تو اس نے مدد کیلئے میر کمبر کو آواز دی۔ جنہوں نے لشکر کشی کر کے قلات، سوراب اور زہری کے حاکموں سے اقتدار چھین کر خود حکمران بن بیٹھا (سفرنامہ سندھ و بلوچستان از ہنری پوٹنگر) سردار میر چاکر خان رند کے قلات سے بطرف سیوی جانے کے بعد یہ برسر اقتدار آئے (جنگ نامہ (فارسی) از نور محمد قاضی

گنجالوی) کمبر کے قبضے کے بعد قلات بنجارہ (نیچارہ) کا نام "قلات بلوچ" میں بدل گیا۔ (آئین اکبری از ابوالفضل) قلات سیوا، میر کمبر کے قبضے کے بعد "قلات بلوچ" کہلانے لگا۔ (انسائیکلو برٹانیکا، جلد سوئم، نہم ایڈیشن "اور نیلسن انسائیکلو پیڈیا، جلد سوئم)۔ میر کمبر رئیس کی نسل "خوانین قلات" ہیں۔

9۔ یہ عُمر نوحانی تھا۔ نصیر آباد اور جہلاوان اور کولواہ کے عمرانی اسی کی نسل سے ہیں۔ نصیر آباد اور قرب وجوار کے خطے کا قدیم نام "نلی" تھا اور یہ علاقہ سندھ میں شمار ہوتا تھا۔

10۔ دُزّک، موجودہ وقت میں ایرانی بلوچستان کے "سراوان" میں ہے۔

11۔ سرحد اُس زمانے میں ایک وسیع علاقہ ہوتا تھا جس کی مغربی حد کرمان سے لگتی تھی اور مشرق میں افغانی سرحد "رباط" تک ہوتا تھا۔ اپنی کتاب "سیستان" میں جی۔ پی۔ ٹیٹ نے لکھا ہے کہ کرمان کے مشرقی اضلاع "سرحد" کہلاتا ہے۔

(سیستان اردو صفحہ 50)

12۔ آثار اور روایت بتاتے ہیں کہ اسلامی فوج نے موجودہ کنڑ کے مقام پر پورالی کے کنارے پڑاؤ ڈالا تھا۔

اعلمش رومی

مذکورہ بالا نام رند بلوچوں کے نسب نامہ میں اُن کے جدامجد کی حیثیت سے آیا ہے۔ یہ نسب نامہ یا شجرہ سرداران رندان نے ''ڈومبکی دفتر'' (مسودات ڈومبکی) سے حاصل کر کے رائے بہادر ہتورام کو دیا تھا۔ جنہوں نے اسے اپنی تاریخ بلوچستان میں شائع کیا۔ اور پھر اسے مختلف تواریخ میں شائع کیا گیا تب اسے شہرت دوام مل گئی۔ اس شجرے میں اکثر نام غیر بلوچی اور خصوصاً ترکی نام ہیں۔ جیسے اعلمش، گل چراغ، سرخ تاج، عمتارہ، رند، لاشار، چاکر، شیہک، رامین وغیرہ۔ شجرہ نسب کا پہلا نام اور قبیلے کے جدامجد کا نام ''اعلمش رومی'' درج ہے۔ اس کے بارے میں ہتورام نے لکھا ہے:

" رند لوگ اپنے جداعلیٰ اعلمش رومی کو اولاد میر حمزہ (1) از خاندان قریش جس خاندان میں حضرت محمدؐ صاحب پیدا ہوئے تھے، بیان کرتے ہیں" (2)

آگے روایتاً لکھتے ہیں کہ

" جب بلوچ حلب سے کوچ کر کے کرمان میں آئے اُس وقت چہل و چار یعنی چوالیس فرقے تھے مگر سب کا بڑا سردار ایک اعلمش رومی تھا" (3)

مذکورہ روایت پر ایک دانشور عبدالغفار بلوچ نے تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ ''اگر حلب میں کوئی اعلمش رومی گذرا ہے تو حلب کی نسبت سے اُسے حلبی ہی کہلانا چاہیے تھا وہ رومی کیوں کہلایا۔' دیگر ترکی ناموں کے بارے میں بھی انہوں نے سوال اٹھایا کہ یہ ایرانی نام ہیں اور رومی تمدن پر ارمنی زبان کا اثر اتنا جلدی کیسے اثر پڑ گیا (4) جس کے جواب میں مولانا نور احمد خان فریدی نے لکھا ہے کہ۔

" امر واقعہ یہ ہے کہ اعلمش رومی وہ پہلے سردار تھے جو اگرچہ عرب تھے مگر ان کا خاندان صدیوں سے شام میں آباد تھا اور رومی تمدن قبول کر چکا تھا۔ جب اپنے پورے محاسن کے ساتھ جلوہ گر ہو گیا تو جہاں دوسرے قبائل حلقہ بگوش اسلام ہوئے وہاں اس کا قبیلہ بھی مسلمان ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے انہیں عربی النسل ہونے کی وجہ سے وادی بلوص میں آباد کیا اور اس مقام کو سرحدی چھاؤنی کا درجہ دیکر فوج کے ایک دستے کو متعین کیا۔ کچھ عرصے تک بلوچ قبائل بلوص اور اس کے مضافات میں سکھ چین کی زندگی برداشت کرتے رہے۔ مگر 61ء میں جب یزید کے ظالم گورنر عبیداللہ بن زیاد نے رسول اللہ ﷺ اور اس کے جگر گوشوں کو کربلا کے ریگزار میں شہید

کرڈالا تو اس حادثہ سے تمام عالم اسلام میں رنج اور غم کی لہر
دوڑ گئی۔۔۔۔۔۔۔۔اس وقت بلوچوں نے بلوص (حلب)
سے سکونت ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب یہ حلب سے
روانہ ہوئے ان کا سردار اعلمش تھا۔ رومی لقب انہیں
ایرانیوں نے دیا تھا"(5)

جناب مولانا صاحب نے مذکورہ بالا کا کوئی کتابی حوالہ نہیں دیا ہے کہ اعلمش رومی کے بارے میں مذکورہ بیانات کس تاریخی تصنیف میں مذکور تھے۔ یہ تمام قصے کہانیاں محض ذہنی اختراع ہیں۔ اگر اعلمش رومی عرب تھے اور بلوص کے باشندے بھی عرب تھے جیسے کہ اسی سلسلے میں آگے جا کر وہ لکھتے ہیں تو انہیں کسی عرب ملک میں جانے کی کیوں نہ سوجھی اور بلوچستان کی طرف کیوں چلے آئے۔ نیز یہ بھی ناممکن بات ہے عرب نژاد اعلمش جس کا نام بھی عربی نہیں ایرانیوں کے دیئے ہوئے خطاب "رومی" کو اپنے نام کا حصہ بنالیں اور پنا نسلی یا علاقائی قبیلہ گمنام رہنے دیں۔

درحقیقت مذکورہ تمام کہانی ایک مفروضہ ہے اور مفروضے کو تاریخی دوام حاصل نہیں ہوتا۔ جس نام کو رند شجرہائے نسب میں اعلمش لکھا گیا ہے وہ دراصل "اغلمش" ہے۔ بلوچ "غ" کی ادائیگی نہ کرسکنے کی وجہ سے اسے آلمش کہتے ہیں۔ کسی فارسی دان منشی نے اسے "اعلمش" تحریر کیا ہے۔ مذکورہ "اغلمش" ایک تاریخی ترک بادشاہ گذرا ہے۔ ترکی لغات میں اس نام کا ذکر ہے اور مشہور لغت

"اظہر اللغات" میں یہ نام ملتا ہے جس میں ہے کہ "یہ ترکستان کے ایک بادشاہ کا نام ہے"۔ جس کا دارالحکومت ترکی کا مشہور شہر اناطولیہ" رہا ہے۔ اناطولیہ کے جس موضع میں اس بادشاہ کا قلعہ اور محل تھا وہ موضع "روم" کہلاتا ہے۔ اور آج بھی موجود ہے۔ اس میں قدیم قلعہ کا کھنڈر "آلمش وژ" کہلاتا ہے۔ چونکہ آلمش یا اعلمش بادشاہ اناطولیہ کے موضع "روم" کا باشندہ رہا ہے اسی نسبت سے رند شجرہ نویس نے اس کے مخصوص شناخت کیلئے اسے "اعلمش رومی" تحریر کیا ہے۔ جو اس نام کی صحیح اور تاریخی شناخت ہے۔

یاد رہے کہ جب تیمور لنگ برلاس تاتاری نے اپنے خونخوار درندے لشکریوں کے ساتھ ترکی پر یلغار کیا اور اناطولیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور حکمرانوں اور ان کے کرتا دھرتاؤں کو گرفتار کرکے زنجیروں میں جکڑ لیا تو انہیں مذکورہ "اغلمش وژ" ہی کے نیم برباد شدہ حصے میں مقید کیا گیا اور اس کے ایک حصے کو مرمت کرکے اپنے گھوڑوں کا اصطبل بنوایا اور تیسرے حصے میں چاکروں، نقیبوں، جنگی طبلچیوں اور نوکروں کو رکھا تھا۔

مذکورہ تاریخی ترک شاہی شخصیت کا نام رندوں کے جدامجد کے طور پر ان کے شجرہ نسب میں آنا رند قبائل کا ترکی النسل ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ہے اور رندوں کو علافی عرب وغیرہ نسل کہنے والے مصنفوں اور محققوں کی تحریروں کے خلاف سب سے بڑی گواہی ہے۔ خود رندوں کی تاریخی شخصیتوں کے ترکی نام اور ان کی متکبرانہ شان اور رندوں کی قدیم باوقار تہذیبی روایات ان کے شاہی پس منظر کی بخوبی عکاسی کرتے رہے

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پندرھویں اور سولہویں صدی عیسوی کے اکثر غیر رند قبیلے بھی اپنے کو رندوں سے ہونے کے دعویٰ کرتے رہے ہیں۔

رندوں کے اکثر تاریخی ترکی نام جواب بلوچی تاریخی نام بن چکے ہیں اب بھی بلوچوں کے لئے معمے بنے ہوئے ہیں۔ رند، شیہک، ہوران، ہوت، جمعل، مارنک، میرنک اور دیگر بیسویں ناموں کے معنی آج بھی بلوچوں کو معلوم نہیں ہیں۔ پانچ سو سال سے ایک "شیہک نی" کے معنی بھی کوئی نہ جان سکا۔ ایک دو افلاطونوں نے اسے بگاڑ کر "شے حق" کہنا اور لکھنا شروع کیا ہے جو کئی مفروضوں کی طرح ایک بے معنی مفروضہ ہے۔ انہیں صرف اور صرف ترکی زبان ہی حل کرسکتی ہے جس کی یہ میراث رہے ہیں۔

جناب مولانا فریدی صاحب نے اعلمش رومی کی سرکردگی میں رندوں کی ہجرت کا بھی تذکرہ کیا ہے جو کہ ایک اور مفروضہ اور تاریخی تحقیق کاوش سے فرار کا نتیجہ ہے۔ ایک ملک کے بادشاہ کو ہجرت کرنے کی کیا پڑی ہے۔ اعلمش، میر جلال خان (5) سے نو (9) پشت (تقریباً 300 سے 350 سال کے درمیان) پہلے گذرے ہیں۔ یعنی جلال خان اعلمش رومی سے سینکڑوں سال بعد چند قبائل کو لے کر ایران میں داخل ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ زمانہ یزیدی کشت وخون کے سال ہوں جیسے کہ رندوں کی شاعری تذکرہ کرتی ہے۔ کیونکہ ترکی پر بھی یزیدی فوجوں نے کشت و خون کا بازار گرم کیا ہوا تھا۔ اُن دنوں ایران واحد سرحدی ملک تھا جو شیعہ مسلک میں

ہونے کی بنا پر یزیدی بربریت سے مامون تھا۔ یقیناً جلال خان اور اس کے قبائل یا گروہ عدم تحفظ کی بنا ئر پر ترکی سے نکل کر ایران کے سرحدی مقام "حلب" میں داخل ہوئے تھے۔ رند شاعر کے شارحوں نے اسی حلب کو شام کا حلب سمجھا اور تمام بلوچوں کو وہاں سے آنے والے لکھا۔ جی۔ پی۔ ٹیٹ نے بھی اپنی کتاب "دی فرنٹیئرز آف بلوچستان" میں کلمتی قبیلے کے بارے میں لکھتے ہوئے اسی حلب سے اندرون ایران رندوں کے داخل ہونے کی بات کی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مذکورہ ترک قبیلے یا گروہ اناطولیہ اور قرب و جوار کی تباہی کے نتیجے میں ایران میں داخل ہوئے اور بلوچستان میں بود و باش اختیار کرکے بلوچ بنے۔ جہاں پہلے سے بلوچ موجود تھے اور یہ ان کا صدیوں پُرانا ملک تھا جو "ملک بلوچ" کہلاتا تھا۔ (6)

حواشی :

1۔ اکثر رند نسل بلوچ قبیلے اسی روایت سے اپنی نسل بیان کرتے ہیں جو تاریخی طور پر غلط اور ایک مفروضہ ہے جسے سندھی تاریخ تحفت الکرام نے مشہور کردیا تھا۔ اس بارے میں تمام مسلمان اور غیر مسلمان مورخین و محققین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حضرت امیر حمزہؓ قریش کی کوئی نرینہ اولاد بچی نہیں ہے۔ تحفتہ الکرام نے تو ایک نہایت بھونڈے انداز سے حضرت امیر حمزہؓ کی دوران شکار کسی پری سے شادی اور اس کے نتیجے میں بلوچ نسل کی پیدائش کا ایک غیر حقیقی واقعہ بیان کیا ہے۔ جو کسی بھی صورت میں

قابل التفات نہیں ہے بلکہ توہین آمیز ہے۔علم سے بے بہرہ اس مصنف کو حضرت امیر حمزہؓ کے بارے میں معلومات ہیں اور نہ ہزاروں سالوں سے موجود بلوچ نسل کے بارے میں علم ہے۔اس کی جھوٹی روایت کو رند شاعر نے اپنی شعری تاریخی دفتر میں جگہ دیا دگر نہ رندوں کو بھی امیر حمزہؓ کے بارے میں علم نہیں رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس میر حمزہ کو حضرت امیر حمزہؓ سمجھا اور مشہور کر دیا گیا ہے وہ مکران کا ایک تاریخی حکمران اور ایک مشہور جنگجو اور فاتح شخص رہا ہے جس کا باپ زیاد اور قبیلہ رئیس تھا۔جس زمانے میں مکران کا ملک سندھ سے منسلک تھا اور عرب حکمرانوں کے ماتحت تھا۔جن کا دارالحکومت منصورہ تھا۔اُس زمانے میں میر حمزہ رئیس عرب حکمرانوں کی طرف سے حاکم مکران تھا جس کا دارلحکومت منصورہ میں آنا جانا رہتا تھا۔عرب سیاح اور مصنف مسعودی (سال وفات 8-957ء) نے 916-915ء میں ملتان اور سندھ کا دورہ کیا۔اسی دورے میں انہوں نے منصورہ کے عرب دربار میں حاضری دی جہاں سلطان ابومنذر عمر بن عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز ہبار بن اسود حکمران تھا۔اس کے دربار میں انہوں نے حاکم مکران میر حمزہ رئیس کو بھی دیکھا تھا۔جس کا تذکرہ مسعودی نے اپنی مشہور تصنیف ''مروج الذہب'' میں کیا ہے جس کا حوالہ خورشید احمد فاروق نے اپنی کتاب ''برصغیر اور عرب مؤرخین'' مطبوعہ نفیس اکیڈمی لاہور سال 1986ء صفحہ 159 اور اعجاز الحق قدوسی نے اپنی ''تاریخ سندھ حصہ اول صفحہ 286 پر دیا ہے۔ ''مروج الذہب'' میں مسعودی کے الفاظ مذکورہ دونوں کتابوں میں یوں نقل کئے گئے ہیں :

" میں نے سلطان منصورہ کے وزیر زیاد، اس کے دو بیٹے
محمد اور علی اور حمزہ نامی معزز و محترم رئیس حاکم کو بھی دیکھا"۔

اس طرح مسعودی کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر حمزہ رئیس دسویں صدی کی ابتدائی سالوں میں حاکم مکران تھے۔اور انہیں کی شہرت سے متاثر ہو کر بعض قبائل نے اپنا سلسلہ نسب اُن سے جوڑ دیا۔واضح ہو کہ قبیلہ ہوت بھی رئیس قبیلہ ہے۔اور رئیس قبائل کے شجرہ ہائے نسب میر حمزہ تک پہنچتے ہیں جیسے ہوت، احمدزئی خوانین قلات، میروانی وغیرہ۔لیکن رند قبائل کے کسی قبیلہ کا شجرہ میر حمزہ تک نہیں پہنچتا بلکہ اعلمش رومی پر ختم ہوتا ہے۔

2۔تاریخ بلوچستان از رائے بہادر ہتورام مطبوعہ منشی نولکشور، لاہور 1907ء، صفحہ 6۔

3۔ایضاً، صفحہ 10۔

4۔ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان شمارہ دسمبر 1960ء صفحہ 16۔

5۔جلال خان، رند نہیں کہلاتا تھا۔ بلکہ ایرانی زیر انتظام بلوچستان کے بلوچوں کی روایتوں کے مطابق اُس کا قبیلہ ''آرامش'' کہلاتا تھا۔خیال یہی ہے کہ قبیلہ ''آرامش''، اُن کے جدامجد ''اعلمش'' ہی کے نام سے تشکیل پا گیا ہوگا۔ایرانی زیر انتظام بلوچستان میں اب بھی یہ قبیلہ موجود ہے اور اپنے کو رندوں میں شمار کرتا ہے۔واضح ہو کہ ''رند'' قبیلہ کی تشکیل جلال خان کے بیٹے رند کی نسبت سے ہوئی ہے۔یعنی جب رند ولد میر جلال خان کی نسل کافی پھیلی تو وہ اپنے جد کے نام پر رند مشہور ہوئے۔

6۔''ملک بلوچ'' کے لئے ملاحظہ کیجئے موضوع ''یورپی مصنفین کے مفروضے''۔

انکاریہ

" انکاریہ" لسبیلہ ضلع کا اہم قبیلہ ہے جو اُن کی اپنی روایتوں کے مطابق پندرھویں صدی میں مکران کے علاقے کلمت سے نقل مکانی کر کے آئے تھے۔ اور کلمتی کہلاتے تھے۔ ان کا سرکردہ شخص رادھا کلمتی ہوتا تھا جس کے نام سے طائفہ رادھانی نے تشکیل پایا جو لسبیلہ کے کلمتیوں کا مرکزہ اور سردار گھرانہ تھا۔

لسبیلہ گزیٹر میں یوروپی مصنفین نے انہیں عرب سے آنے والا لکھا ہے اور صرف مرکزہ یا سردار خیل طائفہ رادھانی کو کلمتی کہا ہے۔ گزیٹر نے طائفہ اشرفانی کو سردار خیل بتایا ہے جو 1906ء میں تھا۔ کلمتی اشرفانی کو بعد کا سردار گھرانہ بتاتے ہیں اور اُسے رادھانی کا برادر طائفہ روایت کرتے ہیں۔

گزیٹر نے اپنے موقف کی وضاحت نہیں کی ہے اور صرف اتنا لکھا کہ

" قبیلے کا نام انکاریا ہے جو عرب سے آیا اور لسبیلہ میں بس گیا۔"(1)

" کلمتی " کا نام موضع کلمت کی نسبت سے ہے جو ساحل مکران پر ایک قدیم موضع ہے۔ خیال یہی ہے کہ یہ وہی کلامہ ہے جس کا ذکر سکندر اعظم کے سفرناموں میں ملتا ہے۔ یہ کوئی یک جدی یا مفرد قبیلہ نہیں ہے بلکہ مختلف قبائل کے طوائف سے مرکب ہے۔ کلمت پندرھویں اور سولہویں بلکہ سترھویں صدی کے وسط تک رندوں اور ہوتوں کا علاقہ تھا۔ اس لئے غالب خیال ہی ہے کہ قبیلہ کلمتی میں دونوں قبیلہ کے

طائفے موجود تھے۔ اس کے مرکزہ رادھانی اور اشرفانی طائفہ ہوت بلوچ نسل سے کہے جاتے ہیں۔ ان کے عرب سے آنے والی روایت دراصل اسی روایت کی جھلک ہے جو جام خاندان کے ضمن میں گزیٹر مصنفین نے بیان کیا ہے جس پر جام غلام قادر خان نے کہا تھا کہ ان کی روایتوں میں ہوت، بنی صلعم کے اجداد سے عبدالمناف کی نسل ہونے کی نسبت سے قریشی عرب ہیں(2) یقیناً انکاریہ کو کلمتی ہوت جانتے ہوئے گزیٹر کے مصنفین نے انہیں عرب لکھا ہے۔ لیکن مذکورہ روایت چاہے کسی بھی حوالے سے ہو بالکل بے بنیاد ہے۔

انکاریہ قبیلہ "کلمتی" بلوچ قبیلہ ہے کلمت مکران کے ساحلی علاقہ پسنی کا ایک چھوٹا بندرگاہ ہے جو بندر کلمت کہلاتا ہے۔ اس سے ملتا جلتا نام "کلامہ" ہے جس کا ذکر سکندر اعظم کی مہمات کے دوران نیارکس نے اسی ساحلی علاقے میں کیا ہے۔

کلمتی قبیلہ بنیادی طور پر "ہوت" قبیلہ ہے لیکن مکران گزیٹر میں ان کو رند بتایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ کلمتی اپنے کو رند بتاتے ہیں اور رند بھی انہیں اپنا مانتے ہیں۔ جبکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ جو صرف رندوں کی شہرت کی بنا پر کہا جاتا ہے۔ ایک اور یورپی مصنف میجر موکلر اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ یہ تعلق صرف باہمی شادیوں کی وجہ سے بتایا جاتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کلمتی جب لسبیلہ آئے تو بلفت قبیلہ نے ان کے آبادکاری کی مزاحمت کی اور یہ لڑائی طویل عرصے تک چلتی رہی لیکن کلمتیوں نے اپنے پاؤں علاقے میں جما لئے۔ کلمتیوں میں ایک آرٹسٹ طائفہ "رومی" ہوتا تھا جو مقبروں کے کتبوں پر نفیس نقش ونگار کا کام کرتا تھا۔ پسنی سے لے کر

تاحد ٹھٹھہ جہاں جہاں تک کلمتی پہنچے وہاں وہاں تک کلمتی ''رومی'' آرٹ نظر آتا ہے۔ جن جن قبروں اور قبرستانوں میں رومی نقش ونگار کے سنگی کتبے لگے ہیں وہ رومی قبریں کہلاتی ہیں۔ اکثر مقبروں کا مجموعہ کلمتیوں ہی کے مقتولین کے ہوتے ہیں جو مزاحمتی لڑائیوں میں مارے گئے ہیں۔ حب کے بھوانی کا رومی قبرستان پورا کلمتیوں کا ہے جو ایک منزل سے تین تین منزلوں تک ہیں۔ کلمتیوں کے مطابق ایک منزل والی قبریں عام لوگوں کی ہیں۔ دو منزلہ والی قبریں طائفوں کے سربراہوں کی ہوتی ہیں اور تین منزلہ والی قبریں قبیلہ کے سرداروں اور جنگجو بہادروں کی ہیں۔ اسی طرح کراچی کا چوکنڈی قبرستان اور ملیر کے کلمتی مقبرے تمام کے تمام منقش سنگی مختلف منزلوں کی قبریں ہیں۔ بعض مقبرے دیگر قبیلوں کے بھی ہیں جن پر رومی آرٹسٹوں کے تاریخی شاہکار ہیں۔ جو رومی آرٹسٹوں کے بعد زندہ نہ ہوسکا۔ رومی آرٹسٹوں کے آخری چند لوگ شاید معمولی لکھ پڑھ جان گئے تھے۔ کیوں کہ اٹھارویں صدی کی چند ایک قبروں کے منقش سنگی کتبوں پر مرنے والے کا نام مع ولدیت کے کندہ پایا گیا۔ ایسے سنگی کتبے حب کے موالی اور ملیر اور چوکنڈی قبرستانوں میں اور چند ایک منگا پیر میں دیکھے گئے ہیں۔ شاہ نورانی کے ایک مقبرے کے کتبے پر آرٹسٹ کا نام ''سرمان کلمتی رومی'' کندہ پایا گیا۔ ''سرمان'' سلیمان کا کلمتی تلفظ ہے۔

طائفہ ''رومی'' بنیادی طور پر ایرانی بلوچستان کے رندوں میں موجود چودھویں اور پندرھویں صدی کا طائفہ ہے۔ جس کی تاریخی نسبت تُرکی کے شہر انا طولیہ میں واقع موضع ''روم'' سے ہے۔ جو رندوں کے جداعلیٰ ''اغلمش رومی'' کا شاہی مسکن

تھا۔ ''اغلمش'' تُرکستان کا ایک مشہور بادشاہ گزرا ہے۔ تاتاری فاتح تیمور لنگ برلاس نے جب ترکی پر قبضہ کر کے انا طولیہ کے اسی موضع میں قیام کیا تو اغلمش کا قلعہ ''اغلمش وِژ'' اچھی حالت میں تھا جسے تیمور نے ترکی کے حکمرانوں، سرداروں اور جنگجوؤں کا قید خانہ اور اپنے چاکروں اور گھوڑوں کا اصطبل خانہ بنایا تھا۔ اور وہاں سے نکلتے وقت اسے توڑ پھوڑ دیا تھا۔

قبیلہ کلمتی کا لسبیلہ میں نیا نام ''انگاریہ'' مشہور ہوا جو ''انگار'' (کوئلہ کا بلوچی) کی نسبت سے ہے۔ روایت ہے کہ ان کے پہلے گروہ نے جنگلوں میں لکڑی سے کوئلہ (انگار) بنانے اور لوہاروں کو بیچنے کا کام شروع کیا تھا۔ جو انگار کی نسبت سے انگاری کہلائے۔ انگاری سے انگاریہ یا انگاریا کی ترکیب عرب اقتدار کی وجہ سے متعارف ہوا ہے جیسے شامی سے شامیہ، سعودی سے سعودیہ، ترکی سے تُرکیہ وغیرہ۔ اس طرح ''انگاریہ'' کے نئے نام نے علاقائی نام ''کلمتی'' کو پس منظر میں پھینک دیا۔

حواشی:

1۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئرز، لسبیلہ ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 1997ء صفحہ 458۔

2۔ اس روایت کو موضوع ''جام خاندان.....'' کی ذیل میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

باروہی

" باروہی" کی مفروضہ اصطلاح انگریزی دور کے ہندو بیوروکریٹ رائے بہادر ہتورام نے اپنی کتاب "تاریخ بلوچستان" میں اپنائی ہے اسے "براہوئی" نام پر منطبق کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> " روہی پہاڑ کو کہتے ہیں اور فارسی کا "با" بمعنی ساتھ ہونے کے ہیں۔ اس طرح لفظ "باروہی" یعنی پہاڑ والا" یا پہاڑوں میں رہنے والا" کے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ قدیم وقت سے پہاڑوں اوران کے دامن میں رہتے ہیں اس لئے باروہی اور پھر کثرت استعمال سے بروہی کہلائے۔"(1)

ہتورام کا مفروضہ "با+روہی" دوزبانوں سے ملکر بنا ہے۔ "با" جیسا کہ اُس نے کہا ہے فارسی کا لفظ ہے اور "روہی" سندھی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی "پتھر" کے ہیں۔ دنیا میں کوئی نام ایسا نہیں ملے گا جس کا ایک حصہ کسی ایک زبان سے لیا جائے اور دوسرا حصہ کسی دوسری زبان سے اخذ کر کے ایک نام بنا دیا جائے۔ یہ تشریح

بذاتہ اپنی خود ساختگی اور بے بنیاد ہونے کی دلیل ہے۔ پہاڑوں میں رہنے والوں کیلئے ایک عام اصطلاح کوہستانی ہر جگہ مستعمل اور مروج رہا ہے۔ اس کے لئے دوزبانوں کا سہارا لینے کی کسی کو ضرورت نہیں پڑتی۔ جہاں تک قوموں کے اسماء کی کثرت استعمال سے بگڑنے کی دلیل ہے جو اکثر یوروپی مصنفین کا موقف ہوتا ہے تو یہ بالکل غلط استدلال ہے۔ نام کثرت استعمال سے نہیں بدلتے بلکہ کسی سابقہ قوم کا نام کافی عرصے بعد کسی نئی آنے والی قوم کے استعمال میں اگر آئے تو ممکن ہے کہ اُس میں معمولی سا فرق ہو جائے اور وہ بھی لہجہ کی ادائیگی کی وجہ سے ورنہ ایسا ہونا ممکن نہیں اور یہ ناکام مورخین اور مصنفین کا ایک بہانہ ہوتا ہے جو تحقیق کی بھول بھلیوں میں جانے سے گھبراتے ہیں اور اسی استدلال سے اپنا کام آسان کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ کے قاری کو گمراہ کرتے ہیں۔

ہتورام کے "باروہی" کے مفروضے کو "بلوچ قوم کی تاریخ" کے مصنف جناب سردار خان گشکوری نے بھی اپنایا جس نے لکھا ہے کہ آج بھی سندھ کے لوگ بروہی کے معنی قلات کے پہاڑوں کے لوگ لیتے ہیں (2) شاید موصوف کو معلوم نہیں کہ کسی زمانے میں تمام سراوان بشمول کوئٹہ کے "کوہستان" کہلاتا تھا۔ اسی نسبت سے سراوان کے لوگوں کو پہاڑوں کے رہنے والے سمجھا جاتا تھا لیکن اس کیلئے باروہی نام وجود نہیں رکھتا تھا۔ درحقیقت ہتورام نے یہ خیال انگریز رائیٹر چارلس میسن سے اپنایا تھا۔ جو ایسے کئی مفروضوں کے موجد ہیں۔ براہوئی تاریخ کا واحد ماخذ براہوجدگال جنگ ءِ شیئر کی بلوچی رزمیہ داستان ہے جس میں پوری براہوئی تاریخ سمائی ہوئی ہے۔

براہوا تحادیہ جدگال قبائل کے خلاف ایک بلوچ اتحادیہ تھا۔جس میں تمام بنیادی قبیلے جو براہوئی کہلائے، کے جدامجد بہ نفس نفیس شامل تھے۔تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں ''براہوا تحادیہ (براہوئی) کی تاریخ'' اور کتاب ''براہو جدگال جنگ ءشمیر''۔

حواشی:

1۔تاریخ بلوچستان، از رائے بہادر ہتورام، تلخیص وتعارف از سلیم اختر مطبوعہ۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ،

2۔بلوچ قوم کی تاریخ، جلد اول، اردو ترجمہ، انور رومان۔

براہیمی

براہوئی تاریخ اور وجہ تسمیہ کے ضمن میں پہلا شوشہ مرحوم میر گل خان نصیر نے مشہور کر دیا۔ اور اپنی تاریخ نویسی کو مشکوک اور داغدار کر دیا۔ دوسرا مفروضہ بلوچوں کے نامی گرامی خان جناب میر احمد یار خان نے مرحوم گل خان نصیر سے متاثر ہو کر قائم کیا۔انہوں نے ''بروہی'' نام کو ''براہیمی'' کی تبدیل شدہ صورت کہا :

> '' کوہ البُرز کا بلوچ طائفہ اپنے سردار میر ابراہیم کی قیادت میں سیستان وتُوران میں داخل ہوا۔قلات میں جب یہ لوگ پہنچے تو ان کا بزرگ میر قمبر خان تھا لیکن میر ابراہیم کے نام کی نسبت سے یہ لوگ براہیمی کہلائے جو دراوڑی سے اختلاط کے بعد بگڑتے بگڑتے براہوئی یا بروہی بن گئے۔''(1)

براہوئی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> '' اس کا نام بلوچوں کی نسبت یعنی البُرز کوہی سے ہو کر یا ابراہیمی سے بگڑ کر بروہی بنا''(2)

خان صاحب نے بھی براہیمی کا من گھڑت نام اپنا کر ثابت کیا کہ ان میں جستجو اور تحقیق کرنے کی صلاحیت اور جرات نہیں تھی۔ براہیمی اصطلاح کو انہوں نے

"بروہی" اور براہوئی" ناموں سے قریب تر پا کر یہ مفروضہ قائم کیا۔ جس طرح انہیں "براہیم" کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ اس قمبر کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے جسے وہ مبینہ البرز کوہی طائفے کا قلات میں داخل ہوتے وقت سربراہ لکھتا ہے جسے وہ میرابراہیم کہتے ہیں وہ خود انہی کے اجداد میں سے ایک تھا جو پنجگور کے خطے کا باشندہ اور قبیلہ رئیس سے تھا۔ کسی البرز وغیرہ کا مہاجر نہیں تھا۔ اور نہ کہ کسی البرز سے کبھی کوئی طائفہ قلات وغیرہ میں آیا ہے۔ خان صاحب کا بیان کردہ "دراوڑوں کی زبان" بھی اس کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ یہاں کسی دراوڑی زبان کا وجود نہیں رہا۔ انہوں نے دراوڑی زبان کا خیال یوروپی مصنفین کی براہوئی زبان کے بارے میں لکھی گئی تحریروں سے اخذ کیا ہے۔ یوروپی مصنفین نے بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ یہاں کوئی دراوڑی زبان بولی جاتی تھی بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ براہوئی زبان پر دراوڑی زبانوں کی چھاپ ہے۔ مختصراً جناب خان احمد یار خان بلوچ کا مذکورہ براہیمی نظریہ بھی ایک بے بنیاد موقف اور اسکی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ براہوئی تاریخ وہی ہے جو "برز کوہی" مفروضے کے تحت بیان کیا گیا ہے اور اسکی دھرانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

حواشی :

1۔ مختصر تاریخ بلوچ وخوانین بلوچ، ص 7 اور "ان سائیڈ بلوچستان" پیش لفظ ص XIV۔

2۔ ایضاً۔

بردی

" براہوئی قبائل کے لئے "بردی" کے نام کو "بروہی" بتانے والے مورخ ومحقق جناب سردار خان گشکوری صاحب ہیں جو "دی ہسٹری آف بلوچستان اینڈ بلوچ ریس" اور ازمنہ بلوچ" کے مصنف ہیں۔ انہوں نے براہوئی تاریخ کے ضمن میں لکھا :

> " ابن حوقل کا قبیلہ بروہی سے متعلق تذکرہ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس نے دسویں صدی میں بروہیوں کو دوسرے سو قبائل میں سے ایک قبیلہ بتایا ہے جو کوچ و بلوچ اور دیگر قبائل کے ساتھ صوبہ فارس اور اس کے گرد ونواح کے علاقوں میں رہتے تھے۔ "

آگے لکھتے ہیں کہ :

> " موجودہ دور کے مورخ کیلئے یہ حیرت انگیز بات ہوگی۔ ساتھ یہ امر بھی کچھ تعجب انگیز نہیں کہ انگریز مورخین جو تحقیق وتدقین کی وادیوں میں سرگردان رہتے ہیں ان کی نظر بھی ابن حوقل کے اس بیان پر نہیں پڑ سکی ہے۔ حالانکہ سر ولیم روز لے نے 1800ء میں اس کا ترجمہ فارسی سے

انگریزی میں کر دیا تھا۔ یہ لوگ ناحق بروہیوں اور ان کی
زبان سے متعلق مخمصے میں پڑے رہے اور اس مسئلہ کو اور
بھی الجھا گئے۔"(1)

محمد ابوالقاسم ابن حوقل نے اپنی تصنیف "المسالک والممالک" میں صوبہ فارس کے علاقہ جات میں قبائل زم درمانیان وزم کرمانیان کے ساتھ ساتھ ایک بلوچ قبیلہ "زم بردھی" کا بھی ذکر کیا ہے۔ جسے جناب گشکوری نے "زم بردھی" کی بجائے "زم بروھی" بنا دیا۔ شاید اس تبدیلی سے انہیں اپنا بروھی مسئلہ کا حل سہل نظر آیا۔ لیکن یہ بات کسی طور بھی قابل یقین نہیں ہے کہ گشکوری صاحب نے "زم بردھی" قبیلہ کے نام کو سمجھا نہ ہو۔ کیوں کہ ابن حوقل کا متذکرہ قبیلہ ایک تو بلوچ قبیلہ ہے اور دوسرا یہ کہ یہ قبیلہ اس کے اپنے ہمسایہ علاقہ نصیر آباد اور جیکب آباد و سکھر میں بھی صدیوں سے موجود ہے۔ ابن حوقل کی کتاب میں یہ نام واضح اور صاف تحریر ہے۔ اور ولیم روزلے کی انگریزی ترجمے میں بھی مترجم نے صاف BURDHEE لکھا ہے۔ دونوں مقامات پر یہ "بروھی" نہیں پڑھا جا سکتا۔ نیز انگریز محققین بھی اتنے کورے نہیں تھے کہ ایک واضح نام اور معلوم قبیلہ کو سمجھ نہ سکیں۔ اور "بروہی نی" کا نام ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے جسے انہوں نے بیسوی مقامات پر ڈھونڈنے کی سرگردانی کی ہے۔

.....

1۔ "آزمندہ بلوچ" از میر سردار خان گشکوری۔

مختصراً یہ کہ گشکوری صاحب اس نام سے جو کام لینا چاہتے تھے وہ ناکام ہو گیا۔ تب شاید وہ اپنی انگریزی تاریخ میں یہ ریمارکس لکھنے پر مجبور ہوئے :

" براہوئی کی اصل تاریخ کا ایک معمہ ہے، یہ
ایک خاص گروہ کی نمائندگی کرتا ہے جن کی اصل بھی تک
پردے میں ہے۔"(1)

بلوچ قبیلہ "بردھی" یا بردی" نویں دوسویں عیسوی میں کرمان کے آس پاس رہتے تھے۔ موجودہ بلوچستان کے مکران میں رند اور اس کے اتحادی قبائل کے ورود سے بہت پہلے "بردی" قبیلہ ضلع گوادر کے جیوانی میں آباد تھا۔ اور دیگر بلوچ قبائل کی بطرف سندھ روانگی کے دوران بردی قبیلہ کے بھی کئی گھرانے سندھ چلے گئے۔ جہاں جگہ جگہ ان کی آبادیاں ہیں۔ انگریز مصنفین نے اسے اور بلیدی قبیلہ کو ایک ہی قبیلہ لکھا ہے۔ جو غلط ہے بلیدی، چند ایک قبائلی طائفوں کے گھرانوں کا مجموعی نام ہے جو مکران کے علاقہ بلیدہ سے ہجرت کر گئے تھے اور بلیدہ کی نسبت سے بلیدی کہلائے۔ جبکہ "بردی" ایک خاص قبیلہ ہے جو روایتوں کے مطابق نسلاً عرب ہے۔ چند ایک عرب ملکوں میں بھی اس کے گھرانے موجود ہیں۔

.....

1۔ دی ہسٹری آف بلوچستان اینڈ بلوچ ریس۔ ص 265

قدیم بلوچستان کی تاریخی روایتوں میں "بلوچی" کے نام سے چند بچے کھچے اور سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد کے علاقوں میں منتشر قبیلے ملتے ہیں۔ یہ متحدہ مکران کے خطے میں واقع ایک قدیم بلوچ ملک، جو عربی تاریخوں میں مذکورہ "ملک بلوچ نی" کہلاتا تھا۔ کے باشندے ہوتے تھے۔ جو ملک بلوچ کی نسبت سے "بلوچی بلوچ" کہلاتے تھے۔ اُن میں "بردی" قبیلہ کا نام بھی آتا تھا۔

بُرزکوہی

بُرزکوہی کی اصطلاح کا مفروضہ سب سے پہلے بلوچی زبان کے ملک الشعرا اور تاریخ نویس میر گل خان نصیر نے بلوچوں کے "براہوئی قبائل" کیلئے اختراع کیا۔ چونکہ کسی مورخ اور محقق سے براہوئی تاریخ کا عقدہ نہیں کھلا تھا اور ہر ایک نے انہیں ان کی موجودہ زبان کی عینک سے دیکھا اور زبان کو محض سطحی نظر سے جانچ کر اسے ایک بگڑی ہوئی دراوڑی زبان کہا اور اسی حوالے سے براہوئی بولنے والوں کو مختلف بکھرے ہوئے نسلوں سے جوڑ دیا۔ لیکن "براہوئی" کی وجہ تسمیہ بیان نہیں کر سکے۔

مرحوم گل خان نصیر نے نوشیروان کی افواج کی بلوچوں کے خلاف جارحیت کے واقعہ کے بیان میں کوہ البرز کے نام کو اپنے مقصد کیلئے اُچک لیا۔ جسے ابوالقاسم فردوسی نے اپنے تاریخی شاہنامے میں تفصیلاً تذکرہ کیا ہے۔ اس تذکرے میں کوچ بلوچ اور دیگر بلوچ قبائل کے خلاف نوشیروانی افواج کی قتل وغارت گری کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس تاریخی واقعہ کو بنیاد بناتے ہوئے میر گل خان نصیر نے لکھا :

> " بروہی یا براہوئی دراصل بُرزکوہ (البرز) کے
> کوچ بلوچ قبائل تھے جو نوشیروان کے تاخت وتاراج
> سے جان بچا کر سطح مرتفع قلات میں اپنے سردار میرو کی

سرکردگی میں ہجرت کر کے آئے تھے۔ چونکہ یہ لوگ بُرز
کوہ سے ہجرت کر کے آئے تھے اس لئے یہاں
"سیوائی قبائل" میں بُرز کوہی کے نام سے مشہور ہوئے جو
مقامی زبانوں کے تلفظ اور لہجے سے رفتہ رفتہ بروہی،
براہوئی یا براہوی ہو گیا۔"(1)

گل خان نصیر کا یہ کہنا سراسر غلط اور مفروضے پر مبنی موقف ہے کہ کرمان سے لے کر مکران کے ساحل تک پھیلے ہوئے کوچ و بلوچ، نوشیروان کی فوجی غارتگری کے نتیجے میں اُلٹ پٹ کر سینکڑوں میل دور کے ایسے علاقے میں ہجرت کر کے آئے جہاں وہ بالکل اجنبی تھے۔ واضح ہو کہ کوچ و بلوچ دو قومیں نہیں تھیں جیسے کہ مصنفوں نے اس قدیم اصطلاح "کوچ و بلوچ" کے درمیانی "و" کو فارسی زبان کا "و" سمجھ کر اسے "اور" کے معنی پہنا دیئے اور انہیں دو قومیں قرار دیں۔ درحقیقت یہ "و" بلوچی زبان کا "و" ہے جس کے معنی "کا، کے، کی اور سے وغیرہ کے ہیں۔ اور "کوچ و بلوچ" سے مراد "بلوچ قوم کا کوچ (قبیلہ)" ہے نہ کہ "کوچ (قبیلہ) اور بلوچ قبیلہ(6) چونکہ تمام مصنفین فارسی بولنے والے یا عربی دان ہوتے تھے اور ان کے تصور میں بھی یہ نہیں تھا کہ اس اصطلاح کا استعمال بلوچی میں ہوا ہے۔ حالانکہ بعض عرب جغرافیہ نویسوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ کوچوں کی زبان فارسی نہیں ہے۔ جیسے کہ شریف ادریسی نے لکھا ہے کہ :

"قفص (کوچ کا معرب) کرمان کی واحد قوم ہے جو فارسی نہیں بولتے۔"

کرمان سے لے کر ساحل تک جو کوچ بلوچوں کے پہاڑ کہلاتے تھے ایک ہی غیر فارسی زبان "بلوچی" تھی۔ جس کے دو لہجے زمانہ قدیم سے مستعمل تھے۔ جن میں "و" "ی" سے بدل جاتا تھا۔ اور یہ صورتحال آج بھی قائم ہے۔ جس لہجے کے لئے ہم نے لفظ بلوچی استعمال کیا ہے کوچ بلوچوں کے زمانے میں اور اس سے پہلے یہ کرد بلوچوں کی زبان تھی اور کُردی کہلاتی تھی۔ اسی کردی بلوچی کو طہران کے فارسی بان پہلوی کی ایک بولی کہتے تھے۔ جس زبان کا ذکر شریف ادریسی نے کیا ہے اس وقت اُسے "کوچی" کہتے تھے۔ کُرد بلوچ اِسے "و" کی بجائے "ی" سے ادا کر کے "کیچی" کہتے تھے اور کوچ بلوچوں کو "کیچ بلوچ" کہتے تھے(7) ان کیچ یا کوچ کا علاقہ ایک وسیع علاقہ ہوتا تھا۔ نزہتہ المشتاق میں اُن کے علاقے کی حدود اس طرح بیان ہوئے ہیں :

" اُن کے پہاڑ خلیج فارس تک پہنچتے ہیں۔ شمال کی
طرف بحرمان (کرمان) تک، جنوب اور مشرق کی
طرف سمندر تک اور مکران کے صحرا تک، مغرب کی طرف
سمندر اور ملک بلوچ(8) ماتبان اور ہرمز تک۔

کتاب "سیستان" کے مصنف جی۔ پی ٹیٹ نے عرب جغرافیہ دانوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ کوچوں کا وطن جیرفت کے جنوب سے لے کر مکران کے ساحل

تک شمال میں خراسان تک اور مغرب میں فارس تک تھا۔ انہیں علاقوں میں وہ تاخت وتاراج کرتے تھے۔ اسی خطے کے پہاڑوں کو عرب جبال قفص (کوچ کا معرب) یعنی کوچ کے پہاڑ کہتے تھے۔ اتنے بڑے علاقے کا کوئی مرکزی مقام یا دفاعی مرکز تو یقینا ہوا ہوگا جس کا تذکرہ ان غیر مقامی تذکرہ نویسوں یا جغرافیہ نویسوں نے کہیں نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے ان کے اندرونی علاقوں اور ان کے طرز زندگی کا بذات خود مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ کوچ بلوچ کا مرکزی مقام وادی کیچ تھا جو اس بلوچ قوم کے نام پر تھا اور اس کا مضبوط قلعہ جس کے وسیع آثار آج بھی موجود ہیں ان کا مضبوط پناہ گاہ تھا۔ جو آج بھی اسی قوم کا نام لئے ہوئے ہے کیچ بی کی وادی میں ان کا ایک قلعہ اور بھی تھا اور ''کوچ قلات'' کہلاتا تھا اب وہ قلعہ تو نہیں ہے لیکن وہ مقام ایک گاؤں کی صورت میں آج بھی موجود ہے اور موجودہ وقت میں ''کوش قلات'' کہلاتا ہے۔ ان کے علاوہ اسی خطہ کیچ میں قدرے مغرب کی طرف اسی کلومیٹر کے فاصلے پر اسی قوم کا ایک قلعہ ''کوش قلات'' ہوتا تھا۔ آجکل کے مقامی لوگ اسے ''کونش قلات'' کے لہجے میں بولتے ہیں۔ ادائیگی کا یہ فرق علاقے میں متعدد ترک، عرب، جاٹ، گجر وغیرہ قبائل کی آمد اور آبادکاری کی وجہ سے ہوا ہے جو آج بلوچ قوم کے مختلف قبیلوں میں مدغم ہو چکے ہیں۔

نوشیروان نے اسی علاقے کے شمال اور مغربی پہاڑیوں میں کوچ بلوچوں کے خلاف مہم بھیجی اور ان کا قتل عام کرایا۔ جس کے نتیجے میں ان کے گروہ کرمان اور جیرفت کے حاکموں کی دسترس علاقوں سے نکل کر اپنے مرکز کیچ کے اطراف چلے آئے۔

نہ کہ میر گل خان نصیر کے کہنے کے مطابق برز کوہ وغیرہ سے سیدھا قلات وسوراب کے ترک علاقوں کی طرف چلے گئے اور وہاں برز کوہی کہلائے۔ اگر وہ کسی برز کوہ سے آتے اور برز کوہ سے اپنے کو نسبت دیتے تہ برز کوہی کا لفظ سوراب میں نہیں کیچ بی کے علاقے میں وجود رکھتا۔ جس کا کہیں بھی کوئی وجود نہیں ہے۔ اس لئے میر گل خان نصیر اور اس کے نقالوں کا مذکورہ موقف ان کی خودساختہ اختراع اور ایک بے بنیاد پروپیگنڈہ ہے کوئی تاریخ نہیں ہے۔

اس کے ساتھ انہوں نے دوسرا مفروضہ ''سیوائی قبائل'' متعارف کرایا اور یہ نہیں بتایا کہ یہ سیوائی قبائل کون کون سے قبیلے تھے۔ اور ان کی زبان کونسی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''مقامی زبانوں'' کی بھی بات کی ہے۔ لیکن ان مقامی زبانوں کے بارے میں نہیں بتایا کہ کون کونسی زبانیں تھیں۔ متذکرہ بالا بیان میں انہوں نے برز کوہی لشکر کا سرکردہ شخص ''میرو'' نامی کو بتایا جبکہ اپنے اسی کتاب کے صفحہ 269 پر وہ ''میرو'' کو بھول گئے اور اس کی جگہ کسی میر قمبر کو اپنے مفروضہ لشکر کا سردار لکھا۔ اور اسی کتاب کے صفحہ 267 پر وہ اپنے ''سیوائی قبائل'' کو بھول جاتے ہیں اور اس کی جگہ ''کوشانی خاندان'' لکھتے ہیں۔ اور صفحہ 36 پر ''مقامی زبانوں'' کی بجائے ''کوشانی باشندوں کی زبان'' کی بات کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہ ان قبیلے کون سے یا وہ کیسی زبان تھی اور کس زمانے میں بولی جاتی تھی اس کے آثار کہاں ہیں اور اب وہ زبان کہاں بولی جاتی ہے، ان سوالوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

اپنی دوسری کتاب "تاریخ بلوچستان" میں وہ "سیوائی قبائل" کی جگہ "سیوائی دراوڑ" کی من گھڑت اصطلاح استعمال کرتے ہیں (2) مذکورہ موقف میں مفروضہ "برزکوہی مہاجر لشکر" کے جس سربراہ کو وہ "میرو" لکھتے ہیں وہ سوراب کا باشندہ اور میروانی بلوچ قبیلہ کا سردار تھا جو سردار گھرانہ "براہو" کی نسبت سے میرو براہو کہلاتا تھا اور سوراب کے موضع "نغاڑ" میں قبیلہ کے قلعہ میروانی میں رہائش پذیر تھا۔ اور کسی برزکوہی لشکر کا سرکردہ نہیں تھا اور نہ کہ باہر سے آیا تھا۔ اور دوسری جگہ پر وہ اسی لشکر کے سرکردہ کو قمبر لکھتے ہیں اور اُسے قمبر کے بارے میں بھی معلومات نہیں ہیں۔ ایک قمبر قبیلہ کا رئیس تھا اور پنجگور کا باشندہ اور وہاں کا حاکم تھا جس کے تحت موجودہ ایرانی بلوچستان میں واقع علاقہ "سرحد" کی حاکمیت بھی تھی اور جس نے لشکر کشی کر کے قلات اور زہری کے قلعوں پر بالادستی قائم کی جس کا تذکرہ ہنری پوٹنگر اور آئین اکبری میں ابوالفضل نے کیا ہے۔ یہ قمبر، قلات کے خوانین بلوچ کے اجداد سے اور موجودہ خوانین قلات کے سلسلہ کا بانی اور پہلا خان بلوچ ہے (اس کے وقت "خان" کی اصطلاح خوانین میں مروج نہیں تھی)

دوسرا قمبر قبیلہ کا کہدائی تھا اور کولواہ کے کہدائی سردار سلیمان کا بیٹا تھا جو بڑا بہادر اور لڑاکو شخص تھا۔ یہ التازئی خوانین میں کسی کا داماد تھا۔ اس نے جدگالوں اور میروانیوں کے درمیان لڑی جانے والی تاریخی جنگ میں اُس وقت کے معزول خوانین کے شہزادوں کی جمع کی گئی لشکروں کی کمان کی اور جدگالوں کے خلاف میروانیوں کی مدد

کی۔ اُس کے اتحادی اور کمان میں لڑنے والے اُس کی نسبت سے قمبرانی کہلائے۔

مختصراً میر گل خان نصیر کا متذکرہ لغزشوں سے بھرپور بیانات سراسر بے بنیاد، من گھڑت اور فرض کردہ ہیں جو تاریخی واقعات اور حقائق کے برعکس ہیں جن سے تاریخ قلات اور براہوئی تاریخ کے طالب علم تذبذب کا شکار اور گمراہ ہوتے ہیں۔ "براہوئی" نام کا "ان کے خودساختہ اصطلاح بُرزکوہی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ کہ تاریخی نام اس حد تک بگڑتے ہیں۔ مذکورہ نام ابتداء سے "براہوئی" ہے جسے صرف سندھ کے لوگ "بروہی" تلفظ کرتے ہیں۔ اور یہ نام کسی بھی مفروضہ نام سے بگڑ کر نہیں بنا ہے۔ ہم نے اپنی پچھلی تصنیفات میں براہوئی کی پوری تاریخ بیان کی ہے۔ پھر بھی مختصراً اسے یہاں دھرایا جاتا ہے تاکہ "بُرزکوہی" کا مفروضہ ہونا ثابت ہوجائے۔

تقریباً 1630ء اور 1635 کے درمیان جہلاوان میں چراگاہوں اور خشکابہ اراضیات کی ملکیتوں پر دو قبائل کے درمیان لڑائی شروع ہوئی۔ یہ قبیلے بلفت اور میروانی تھے۔ جن کے کئی طائفے بیلہ سے قلات تک کے درمیانی پہاڑی علاقوں اور وادیوں میں صدیوں سے رہتے آئے تھے۔ میروانی نسبتاً بعد کے آنے والے تھے جو علاقہ پنجگور کے جنوبی اور مغربی میدانی علاقوں کے باسی تھے اور نسلاً رئیس قوم سے تھے۔ جن کے سردار خیل

خاندان شجرہائے نسب مکران کی تاریخی شخصیت میر حمزہ رئیس تک پہنچتے ہیں۔ جسے قبیلائی شاعری اور قبیلائی روایتوں نے بنی صلعم کے ہمعصر حضرت امیر حمزہ پر منطبق کیااور قریشی ہونے کا بے بنیاد دعوی کیا۔

بلفت (3) قبیلہ اور اُس کے طائفے میروانیوں سے پہلے علاقے میں رہتے تھے اور جٹوں (سندھیوں) کی زبان بولنے کی وجہ سے جدگال کہلاتے تھے۔ بلوچ ہر اُس بلوچ کو جدگال کہتے ہیں جو اپنی زبان کو چھوڑ کر سندھی بولتے رہے ہیں۔ یہ لفظ اصل میں ''جٹگال'' ہے یعنی جٹوں کی بولی بولنے والے۔ سندھی کو بلوچ جٹ کہتے ہیں اور ان کی زبان کو جٹکی۔ جٹگال پھر جدگال اور بعض جگہوں پر ''جغدال'' کہلاتے ہیں۔

متذکرہ متنازعہ ملکیتوں پر دونوں قبیلوں کے درمیان کئی مرتبہ جھڑپیں ہوتی رہی ہیں۔ جن میں زیادہ تر جانی و مالی نقصان جدگالوں کو پہنچا ہے اور ان کے کئی لوگ گھرانے ہجرت کر کے بیلہ اور ہُولا کی پہاڑیوں میں جا بسے تھے بعض سندھ اور کچھی کے اطراف تک بھی پہنچ چکے تھے۔

اسی قبیلائی کشمکش کے دوران جدگالوں کے ایک بڑے لشکر نے میر چھٹا بلفت اور شکر جام زئی کی سرکردگی میں ناگہاں سوراب واطراف کے میروانیوں پر دھاوا بول دیا۔ اور نغاڑ کے میروانی قلعے پر بھی بھرپور حملہ کر دیا۔ میروانی سردار میر عمر براہوا اپنے بھائیوں اور عزیزوں کے ہمراہ مقابلے پر نکل آیا۔ لیکن اس اچانک حملے میں اپنے بھائی قلندر براہو کے ساتھ مارا گیا۔ قلعے میں موجود اکثر مرد مقتول ہوئے۔ میر عمر کی بیوی ماہناز اپنے ایک نابالغ بچے بجار کو لیکر قلعے سے بچ نکلی۔ اور اپنے عزیزوں کے پاس پشین جا پہنچی۔ وہ پشین کے خواجہ سیدوں (4) سے تھی۔

ماہناز نے اٹھارہ سال تک وہاں بجار براہو کی ایک بلوچ ماں کی طرح تربیت کی اور اُس کے ذہن میں جدگالوں کے حملے اور قتل و غارت گری کو نقش کرا کر اُسے اپنے باپ اور قبیلہ کا انتقام لینے کیلئے تیار کیا۔ تقریباً تیس اکتیس سال کی عمر میں بجار ماں سے اجازت لے کر بطرف سوراب آیا اور اپنے گھرانے اور قبیلہ کو جنگ کیلئے تیار

کیا۔ اس نے دیگر ہمسایے قبائل سے بھی مدد مانگی۔ کئی بلفت گھرانے ملکیتوں اور رشتہ داروں کی وجہ سے اپنے مادر قبیلہ سے کٹ کر بجار براہو کے ساتھ بندھ گئے۔

میر بجار براہو کو اپنے قبیلہ میروانی اور دیگر قبائل سے ستائیس قبائلی سرکردہ شخصیتوں کی حمایت حاصل ہوئی جنہوں نے اپنی بساط کے مطابق سردار خیل طائفہ براہو کو دوران جنگ مسلح لشکر مہیا کئے جو جدگالوں کے خلاف لڑتے رہے اور ان کی آبادیوں پر یلغار کرتے رہے تا آنکہ وہ بیلہ کی حدود میں بھاگ گئے۔ اس شکست کے نتیجے میں دونوں قبیلوں میں علاقائی حد بندی اور جنگ بندی ہوگئی۔

براہو میروانیوں کے حمایتی شخصیتیں درج ذیل تھیں۔

1۔ قبیلہ نکیب کی طرف سے گوشونغاڑی اور گزین نغاڑی۔ 2۔ سردار خیل براہو طائفے سے گرگین براہو، ہالہ ولد قلندر براہو، ٹوہو ولد قلندر براہو، صلاحی وحالد جلمب زئی، میران جلمب زئی قبیلہ جلمب زئی کی طرف سے۔ قبیلہ ساسولی بلفت کی طرف سے حاجی سوپک

ساسولی، گواراں ساسولی، قبیلہ نوشیروانی کی طرف سے ملک دوستین اور ملک دینار نوشیروانی، قبیلہ سیاہ پاد کی طرف سے زنگی سیاہ پاد اور سہراب، قبیلہ بیزنجہ بلفت کی طرف سے حمل بیزنجہ، نندہ بیزنجہ، قبیلہ عمرانی رند کی طرف سے عمر بزدار، قبیلہ رخشانی سے تھمر ہوتک، قبیلہ کہدائی کی طرف سے میر کمبر کہدائی، قبیلہ رئیس توک کی طرف سے دُڑک رئیس اور زرک رئیس، قبیلہ موسیانی زہری کی طرف سے آدم موسیانی، قبیلہ محمد حسنی کی طرف سے زیرک محمد حسنی، قبیلہ ذگر کی طرف سے سُماعیل ذگر، سابق خوانین قلات کے قبیلہ ایلمانزئی کی طرف سے میر احمد ایلمانزئی، میر مہراب ایلمانزئی اور میر شاہ بیگ ایلمانزئی۔

درج بالا جنگی اتحادی اور ان کے لشکر میروانی قبیلہ کے سردار خیل طائفہ براہو کے اتحادی ہونے کی نسبت سے پھر ایک نئے نام ''براہوئی'' سے شہرت پاگئے۔ یہ نئے قبیلے اتحادی شخصیتوں کے نام سے تشکیل پاگئے جو بلوچ قبائلی نظام کے مطابق یوں تھے :

1۔ نغاڑی۔ 2۔ گرگیناڑی۔ 3۔ قلندرانی۔ 4۔ ہالہ

زئی۔ 5۔صلاحی۔ 6۔حالدانی۔ 7۔میران زئی۔

8۔سوپک۔9۔گوارانجو۔10۔زنگیانی۔11۔جملانی۔

12۔نندوانی 13۔عمرانی۔14۔جمرانی (تمبر اڑی)،

15۔کمبرانی۔ 16۔ڈزرک زئی۔ 17۔زڑک زئی۔

18۔آدمانی۔ 19۔زیرکانی۔ 20۔ سُمالانی ۔

21۔احمدزئی۔22۔شاہ بیگ زئی۔

مندرجہ بالا قبیلے میر بجار براہو کی سربراہی میں میروانی سردار خیل براہو کے جنگی اتحادی ہونے کی نسبت سے نئے نام ''براہوئی'' سے متعارف ہوئے۔جنہیں براہوطائفے کے فتح کئے ہوئے مقبوضات میں سے اُن کی خدمات کے عوض اراضیات دی گئیں۔مذکورہ جنگ 1665ء میں ختم ہوگئی۔اسی فتح کے نتیجے میں سابق خوانین قلات کے شہزادوں میر احمد و میر مہراب وغیرہ کے حصّے میں اُن کا سابقہ علاقہ انہیں دیا گیا۔اور باغبانہ، خضدار، کرخ و چکو میں انہیں اراضیات دی گئیں۔1666ء میں میر احمد ایلتازئی اپنے سابقہ آبائی ریاست قلات میں برسراقتدار آئے۔مختصراً یہ کہ براہوئی قبائل اور براہوئی وجہ تسمیہ اور تاریخ کے ضمن میں میر گل خان نصیر وغیرہ کا ''بُرز کوہی'' کا مفروضہ ایک بے بنیاد اور من گھڑت کہانی اور شوشہ کے علاوہ کچھ نہیں۔تاریخی بلوچی رزمیہ داستان ''براہو جدگال جنگ و شیئر'' نے دنیا کے سامنے براہوئی تاریخ کو آشکار کرکے تمام مفروضوں کا قلع قمع کردیا ہے۔(5)

حواشی :

1۔ بلوچستان، قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں۔ص 36۔

2۔ '' تاریخ بلوچستان'' دوسرا ایڈیشن ص 2۔

3۔ بلفت (سندھی میں بُرفت) قبیلہ کا جدامجد نہمردی قوم کی ایک تاریخی شخصیت ''ابوالفتح'' نامی بلوچ تھا۔جس کا ذکر راجھستان کے جام خانوادوں کی دستاویزات میں مذکور ہے بلوچ اپنے لہجے میں ابوالفتح کو بلفت کہتے تھے۔ہتورام نے اپنی تاریخ میں اور جسٹس خدابخش بجارانی مری نے اپنی کتاب ''بلوچستان تاریخ کے آئینے میں'' اسے ایک قدیم نسلی بلوچ قبیلہ بتایا ہے۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اپنی کتاب ''جنگ نامہ'' میں روایتوں کے مطابق اس قبیلہ کو مکران سے آیا ہوا قبیلہ بتایا ہے۔راجھستان کے جام نگر کے نوابان کے دستاویزات میں قبیلہ کو ''بلفت راج نوسمہ'' بتایا ہے یعنی سمہ اتحادیہ میں نیا شامل شدہ۔ان دستاویزات کے مطابق ابوالفتح بلوچ مسلمان سپہ سالار محمد بن ہارون مکرانی کے خانوادے سے تھا۔جس نے اپنے سردار کو قتل کرکے وہاں سے تیس نفر کے ساتھ قلات آیا۔یہاں قلات نیچارہ کے حاکم یا سردار مورک کو قتل کرکے بلوچوں کے ایک صحرائی یا سیرائی قبیلہ کو بالادستی دلانے میں مدد کی۔اس نے اپنے والد سردار یوسف نہمردی کی رضامندی کے برخلاف ایک لونڈی سے شادی کی اور کوہستان میں رہائش پذیر نہمردی بلوچوں کے پاس چلا گیا۔کچھ عرصہ بعد پھر جام نگر چلا گیا اور وہاں کے حاکم کا نائب مقرر ہوا۔وہاں ایک سمہ عورت

سے دوسری شادی کی۔ مگر حاکم سے اختلافات کی بنا پر ہجرت کر کے کوٹری میں ایک ندی کے کنارے اپنے لوگوں کے ساتھ آباد ہوا۔ یہ مقام پھر ان کے نام پر ''بلفت'' مشہور ہوا۔ جو بلفت قبیلہ کا مرکز ٹھہرا۔ وقت کے ساتھ ساتھ پھر یہ قبیلہ اکثر جدگال قبائل کا مرکزی اور سردار خیل قبیلہ بنا۔ ان کی نسل بہت پھیلی اور اس کی بیسویں شاخیں وجود میں آ گئیں۔ کیرتھر کی پہاڑیوں سے لیکر قلات اور مری بگٹی علاقے کے درمیانی وسیع خطے میں اس قبیلے کے آثار جابجا پھیلے ہوئے ہیں۔ (کمبران و بلوچستان کے چند تاریخی گوشے)

4۔ یہ پورا تاریخی واقعہ تاریخی بلوچی رزمیہ داستان ''براہو جدگال جنگ و شیئر'' میں بیان ہوا ہے۔ اس میں خواجہ قبیلہ کو مہناز کے حوالہ سے ''سید نسل'' سے کہا گیا ہے۔ اور اُسے ''سیدزادی'' کہا گیا ہے جبکہ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کی تاریخ اعظمی اور چند دوسری کتابوں میں خواجہ قبیلہ کو تُرک قبیلہ کا طائفہ کہا گیا ہے۔ اور غالباً حقیقت بھی یہی ہے۔

5۔ مذکورہ ''براہو جدگال جنگ و شیئر'' کے نام سے بلوچی رزمیہ داستان مکمل کتابی صورت میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے چھاپی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تصنیفات از ''ایک نظم ایک تاریخ'' ''براہوئی کون؟'' میں بھی رزمیہ داستان معہ ترجمہ و تشریح کے شامل ہے۔

6۔ آج بھی بلوچی زبان میں ''ڈ'' کا استعمال اسی طرح موجود ہے مثال کے طور پر خرزر، خواب خرگوش، شاہ قلندر، شاہ جہان، چشم ظاہر، صدق دل وغیرہ الفاظ کو بلوچی

میں ہَرڈر، واب ڈگر گوشک، شاہ ڈقلندر، شاہ ڈجہان، چم ڈظاہر، سِتک ڈدل یا دل ڈستک بولا جاتا ہے۔

اسی طرح بلوچی کی مذکورہ دو بولیوں میں ''ڈ'' کا ''ی'' میں بدل جانا عام سی بات ہے۔ مثلاً بوت سے بیت، حور سے حیر، نور سے نیر، ڈور سے دیر، دھوت سے دھیت، بوتہ سے بیتہ، زوت سے زیت، ہوت سے ہیت، ہوتان سے ہیتان، معلوم سے معلیم، گندُم سے گندیم، ہورت سے ہیرت، کورد سے کیرد (کُرد) بعلوص سے بعلیص (بلوچ) نیتال سے نوتال (ہندی قبیلہ جو بلوچستان میں آباد ہوا) سُوت سے سیت، (سود، فائدہ) سسوس سے سیس (قدیم کُرد بلوچ طائفہ، جسے شیث اور شیث بھی لکھا گیا ہے) اور سینکڑوں الفاظ۔ اسی طرح کوچ سے کیچ ہے۔

7۔ نلک بلوچ قدیم زمانے سے موجود رہا ہے۔ تحریر میں اس کا ذکر پانچویں صدی عیسوی کے لگ بھگ ملتا ہے۔ قدیم ترین بلوچی کہانیوں میں اس کا نام آیا ہے۔ ملکہ بلقیس کی بلوچی کہانی میں آتا ہے کہ ہندوستان کو جاتے ہوئے اُس نے بلوچ ملک سے دو دیو سپاہی اپنی حفاظت کے لئے ساتھ لے لئے۔ اور آگے بے غم ہو کر سفر کیا۔ اسی طرح کوئی سیف الملوک جب بدیع الجمال (بدو جمال، بلوچی میں) کو پانے کیلئے کوہ لوگاں یعنی مکانوں والا پہاڑ (بیلہ کا شہر روغاں یعنی گھروں یا مکانوں کا شہر، بلوچی میں گھر کو لوگ اور لوغ کہتے ہیں۔ جکھی یا سندھی میں ''ل'' کی جگہ ''ر'' استعمال ہوتا ہے جیسے ''بلوچ سے بروچ'' بلوچکی سے بروچکی، تلوار سے ترار وغیرہ) جا رہا ہوتا

ہے تو ملک بلوچ کے بادشاہ کا مہمان بنتا ہے اور راہبری کے لئے ایک بلوچ سرمان اس کی راہبری کرتا ہے۔ سرمان وہاں بدو جمال کے ایک عاشق دیو ''گوکل دیو'' سے مقابلہ کرتا ہے اور مارا جاتا ہے۔ مذکورہ ملک بلوچ کا مرکز قدیم ہرمز کے جنوب اور مغرب میں موجودہ کچھی اور گوادری دشت کا علاقہ رہا ہے۔ اسی علاقے کے موضع سنٹ سر میں خدائی کا دعویٰ کرنے والا مشرک بادشاہ نمرود بلوچ کا قلعہ واقعہ تھا جس کا دیوہیکل ملبہ آج بھی نمرود قلات کے نام سے موجود ہے۔ قلعہ کے مشرقی پہلو کے جلے ہوئے سوختہ قطعہ کو وہ مقام بتایا جاتا ہے جہاں نمرودی سرداروں کے فیصلے کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کیلئے کئی دنوں تک آگ جلائی گئی۔ اسی حوالے سے اس قطعہ کو جواب ایک خشک ندی کی صورت میں ہے، سنگلیں ڈور یعنی جلی ہوئی ندی '' کہتے ہیں۔ یا تو یہ وسیع و عریض خطہ ''بلوچوں کا قدیم وطن ہونے کی نسبت سے ملک بلوچ کہلاتا تھا یا پھر نمرود بلوچ کی نسبت سے ملک بلوچ کہلاتا تھا۔

شریف ادریسی اور دیگر نے ''ملک بلوچ'' کی نشاندہی تو کی ہے لیکن اس کے حدود اربعہ کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہیروڈوٹس یونانی مورخ نے ڈورسکس کے میدان میں یورپ کے خلاف جنگ میں شاہ ایران زرکس کی فوجوں میں شامل ''شیر ببر کی کھالوں میں ملبوس گندی رنگ کے جس گدروشیائی بلوچ فوج کا ذکر کیا ہے وہ اسی ملک بلوچ کے جوانمرد تھے۔

بُرفت

بُرفت قبیلہ بلوچستان کے ضلع لسبیلہ، کراچی کے قریب تھانہ بولان خان اور محدود پیمانے پر پورے سندھ میں پھیلا ہوا ہے۔ کسی زمانے میں یہ بہت طاقتور اور بڑا قبیلہ ہوتا تھا۔ اور بلوچستان کے مولہ کی پہاڑیوں سے لے کر قلات اور مری بگٹی کوہستانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ تاریخ میں یہ قبیلہ کیمیا گری میں بھی نام آور تھا۔ بلوچستان میں یہ نام ''بُلفت '' ہے۔ بُرفت دراصل اسی بلفت کا سندھی لہجہ ہے۔ سندھی میں کئی الفاظ کا ''ل'' ''ر'' میں ادا کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ بلوچ کو وہ ''بروچ''، بلوچی کو بروچکی، تلوار کو ترار کہتے ہیں۔ نام بُلفت اصل میں ''ابوالفتح'' کا بلوچی لہجہ یا ادائیگی ہے، بلوچ اپنے خانہ بدوشانہ زندگی میں عربی ناموں کو اپناتے تو تھے لیکن انہیں صحیح ادا نہیں کرسکتے تھے۔ جیسے کہ ''ابوالفتح'' کو بُلفت بنا دیا۔ ابوبکر کو وہ ''بوبرگ'' اور ''بیبرگ''، عثمان کو ہوتمان''، بہاؤالدین کو ''بہادین'' اور بادین'' غلام محمد کو غلامند، در محمد کو دُرمند'' ادا کرتے تھے۔

بُلفت قبیلہ کو ''برفت'' لکھتے ہوئے یوروپی مصنفین نے بغیر کسی تحقیق کے اسے ''عرب نسل اور عددی لحاظ سے غیر اہم بتایا ہے۔ اور مزید لکھا ہے کہ یہ ''سندھ کے ایک قدیم حکمران خاندان سمہ کی اولاد ہیں۔''(1) حالانکہ نہ یہ عرب نسل ہے اور نہ

کہ غیر اہم قبیلہ ہے۔ شاید یہ بلوچستان کا واحد قبیلہ ہوتا تھا جس کے سب سے زیادہ طائفے ہوتے تھے آج وہ طائفے بڑے قبائل کی شکل میں سندھ اور بلوچستان کے سندھی اور بلوچ اقوام میں موجود ہیں اور اہم قبائل میں ان کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے کئی قابل قدر شخصیتوں کو جنم دیا ہے۔ ان میں سے بُرہ، مُٹھیڈ، گنگہ، جھوکیہ، بیزنجہ، مردوئی، ساسولی مرکزہ، سیاہ پاداوران کے بیسویں طائفے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے کئی طائفے مینگل، جاموٹ، ساسولیوں وغیرہ شامل ہیں۔ چونکہ بلفست قبیلہ پر بحث ہو چکی ہے اس لئے اسے یہاں پر دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے موضوع ''بیزنجہ'' کا اشاریہ نمبر" 6 لُمری/لومڑی کا اشاریہ نمبر 4، ''برزکوہی'' کا اشاریہ نمبر 3 ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

....

1۔ گزیٹیئرز آف بلوچستان ڈسٹرکٹس، ڈسٹرکٹ لسبیلہ مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997، موضوع ''بُرفت''۔

بگٹی

بلوچستان میں مری اور بگٹی ساتھ ساتھ ایک خطے میں رہتے ہیں۔ اگرچہ دونوں قبیلے اپنے کو بنیادی طور پر رندوں سے منسوب کرتے ہیں لیکن باقی بلوچستان بشمول ایرانی بلوچستان دونوں قبیلوں کے کوئی آثار نہیں ہیں نہ ان کے کوئی گھرانے دوسرے مقامات پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ حالانکہ اکثر قدیم رند طائفے پورے بلوچستان میں نظر آتے ہیں سوائے بعد کے تشکیل شدہ طائفوں کے جو رندوں کے مکران سے نکلنے کے بعد وجود میں آئے۔ بگٹیوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے موجودہ مساکن بلیدئی بلوچوں سے ہتھیالئے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بگٹی علاقے میں بلیدئی پہلے سے آباد تھے اور بلیدئی قبیلہ مشرقی اور مغربی بلوچستان کے علاوہ ایرانی بلوچستان میں جگہ جگہ آباد ہیں۔

" قبیلہ کے مرکزہ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا
کہ کب علاقے میں اس کا پھیلاؤ ہوا لیکن یہ کہا جاتا ہے
کہ یہ ایرانی بلوچستان کے بگ سے آئے ہیں۔"(1)

یوروپی محقق لانگ ورتھ ڈیمز نے لکھا ہے کہ بگٹی قبیلہ مختلف عناصر سے ملکر قبیلہ بنا ہے اور اصلاً رند نسل ہے جو میر چاکر خان رند کے چچازاد ''گیاندار'' کی جدیت سے ہے۔ گیاندار کے لڑکے راہجہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس کے نام سے راہجہ طائفہ ہے لیکن یہ نام ہندی الاصل معلوم ہوتا ہے"۔(2)

جہاں تک بگٹیوں کے ایرانی بلوچستان کے بگ سے آنے کی بات ہے وہ غلط ہے۔اس لئے "بگ" سے بگی تو بن سکتا ہے لیکن بگٹی نہیں۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے یہ ترکی کے کردوں میں موجود قبیلہ "بگتائی" سے ہوں جو کسی قدیم دور میں وہاں سے ہجرت کر کے آئے ہوں گے۔اگرچہ یہ تاحال مصدقہ نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کا امکان ہے۔کیونکہ رند قبائل کی اصلیت بھی ترکی کے اناطولیہ کے ترکوں سے ہے۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بگٹی، ترکی کے بگتائی کردوں سے ہوتے تو ترکی سے قلات تک کے طویل علاقے میں رند قبائل کے برعکس ان کے ایک گھر کی آبادکاری کے آثار کیوں نہیں ہیں، نہ بگتائی کے نام سے اور نہ بگٹی کے نام سے۔اس طرح اس مفروضے سے بھی اتفاق کرنا مشکل ہے۔لیکن ایک چیز یقینی ہے کہ کسی زمانے میں غالباً رندوں کے مشرقی بلوچستان آنے سے قبل بگٹی مرکزہ کا اسی نام کا چھوٹا سا قبیلہ سیوستان کے کوہستان میں کہیں موجود تھا۔اور مری اور بگٹی دونوں "کُردگال "(3) کہلاتے تھے۔اس کی باقی شاخیں باہر سے آ کر ملنے والے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے کہ نوتھانی قبیلہ ہے جسے لس بیلہ سے آنے والا بلوچ قبیلہ کہا جاتا ہے اور لس بیلہ میں اِسے جام عالی ہوت کی نسل سے روایت کیا جاتا ہے۔نوتھانی قبیلہ موجودہ وقت میں لس بیلہ اور خضدار ضلع میں بھی موجود ہے۔جو اپنے کو بگٹی نہیں کہتے۔اسی طرح مسوری قبیلہ ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ لس بیلہ کے قبیلہ "مَسور" ہی کا کوئی بچھڑا ہوا گروہ ہو اور مسور قبیلہ کی نسبت سے مسوری کہلاتا ہو اور نوتھانی ہی کے ساتھ نقل مکانی کر

گیا ہو۔نیز اسی نام کا قدیم ہندی قبیلہ تھا جو ہند کے دہرہ دون کے قریب کہستان میں تیرھویں صدی میں آباد تھا۔وہ شہر آج بھی "مسوری" ہی کہلاتا ہے۔چونکہ یہ پہاڑی سلسلے کی اونچائیوں پر آباد ہے اور اس کے سرسبز درخت اور نظارے دُور سے نظر آتے ہیں۔اس لئے جب جواہر لال نہرو دہرہ دون کے جیل میں قید تھا تو ہر شام کو جیل ہی کی کھڑکیوں سے گھنٹوں مسوری شہر کے نظاروں کو دیکھتا تھا۔اس نے "مسوری" شہر کی دلکشی کے بارے میں اپنی بیٹی کو لکھے گئے خطوط میں بھی بتایا ہے۔(4) کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مذکورہ ہندی قبیلہ کا کوئی گروہ وہاں سے نقل مکانی کر کے سیوستان کے انہی پہاڑیوں میں چلا آیا ہو اور پھر بگٹیوں کا حصہ بن گیا ہو۔جبکہ انہی علاقوں میں بیسویں ہندی اور کشمیری قبیلوں کی آبادکاری کے بے حساب آثار آج تک باقی ہیں۔یہی مسوری قبیلہ سندھ میں آباد ہے جہاں مشوری کہلاتے ہیں۔سردار گھرانہ "راہیجہ" ہے جس کے نام کی ترکیب، جیسے کہ ڈیمز نے کہا ہے، ہندی اور جدگالی ہے۔راہی یا راہو، ہندوانہ نام ہے، ایسے نام کئی ہیں جو ہندیوں اور بلوچوں میں مشترک ہیں اور ان کا ماخذ آریائی معلوم ہوتے ہیں۔مثلاً راہو، چندن، ہوت، بالا، دَلو، رامن، سونی، رادھا، وغیرہ۔ "راہیجہ" ایک الگ قبیلہ بھی ہے اور بولان، کچھی اور نصیر آباد، جیکب آباد میں پھیلا ہوا ہے۔بعض جگہوں پر اسے "راہوجہ" بھی کہتے ہیں۔یہ بھی ایک مخصوص روایت بتائی جاتی ہے کہ "راہیجہ" کا جد امجد "راہو" جو مشرقی بلوچی تلفظ میں "راہی" بن جاتا ہے۔ایک جٹ تھا جسے کچھ لوگ ہندو بھی بتاتے ہیں اور ایک گھومنے

پھرنے والا کاروباری تھا جو اپنا مال بیچتا تھا اور پھر سرداروں کے مہمان خانوں میں رہتا تھا اور پھر لوگوں سے اُن کے بھیڑ بکریوں کے بال اور اون خرید کر سندھ جا کر فروخت کرتا تھا۔ یہ جٹ یا ہندو راہی کو ایک نامعلوم بگٹی سردار نے اپنا منشی اور کاردار رکھا جو پھر کسی وقت مسلمان ہو کر اس قبیلہ کا حصہ بنا۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس راہی کا ''راہیجہ بگٹی'' سے کوئی تاریخی تعلق بنتا ہے یا نہیں۔ بعض اوقات سیدھے سادھے بلوچ کوئی نام سن کر بھی بغیر اس پر غور کئے یا پوچھے اُسے اپنے کسی بچے پر رکھ لیتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ''راہیجہ'' کے والد نے یہ قبیلائی نام سن کر اپنے بیٹے پر رکھا ہو۔ جیسے کہ کئی پٹھانوں نے اپنے بیٹوں کے نام کابل خان اور پشتونستان خان رکھا ہے۔ میرا اپنا ایک دوست ''سوات خان یوسف زئی'' نامی ہے۔

بگٹیوں کا ایک اور طائفہ ''نوحکانی'' ہے جس کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ اصل بگٹی مرکزہ ''نوحکانی'' ہے جو خاران کے موضع ''بکت'' سے نقل مکانی کر کے موجودہ بگٹی علاقے میں آئے اور ''بکت'' کی نسبت سے پہلے بگتی اور پھر ''بگٹی'' کہلائے۔ لیکن یہ بھی قابل قبول نہیں لگتا۔

ایک اور روایت خود بگٹیوں سے منسوب ہے یہ ہے کہ بگٹی نام پانے سے پہلے یہ لوگ ''زرکان'' کہلاتے تھے اور علاقہ دُکی کے موضع ''بگٹ'' میں آباد تھے۔ جب بگٹ سے نقل مکانی کر کے موجودہ کوہستان میں آئے تو یہاں کے بلیدیوں میں ''بگٹی'' کہلائے۔ اس روایت میں کافی وزن ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بگٹی کا مرکزہ

''زرکان'' قبیلہ ہوتا تھا۔ اب یہ دیکھنا کہ زرکان کون تھے اور ان کا نسلی سلسلہ کس بڑے قبیلہ سے منسلک ہے، اس نقطہ پر تا حال کسی نے تحقیق نہیں کی ہے۔ البتہ زرکانی نام کا ایک قدیم موضع کوہ سلیمان کے قریب شیرانی قبیلہ کے شمال میں کسی زمانے میں موجود تھا۔ جس کے اب آثار تو نہیں ہیں لیکن اُس موضع کا نام اب وہاں کی ندی کے نام کی صورت میں زندہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دور میں زرکانی وہاں آباد تھے۔ موجودہ وقت میں یہ چھوٹا طائفہ بگٹیوں کے راہیجہ شاخ میں موجود ہے۔

یہ موقف کہ زرکان یا زرکانی قبیلہ ہی بگٹی قبیلہ کا مرکزہ ہے زیادہ حقیقت کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ جو کوہ سلیمان کے دامن سے لورلائی کے بگٹ میں آ کر آباد ہوا اور جب چند وجوہات کی بنا پر بگٹ سے نقل مکانی کر کے موجود پہاڑی علاقے میں آ کر بس گیا تو اس کا سابقہ قبیلائی نام پس منظر میں چلا گیا اور موجودہ علاقے میں اپنے سابق مقام بگٹ کی نسبت سے بگٹی مشہور ہوئے۔ اور ان میں ایک چھوٹا گروہ کسی سبب اپنے قبیلائی نام کے ساتھ موجود رہا جو اب راہیجہ میں ایک پھلی کے طور پر ہے۔

بگٹیوں میں موجود ایک طائفہ کلپر ایسا ہے جو قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ ایرانی بلوچستان میں بھی موجود ہے اگرچہ چند گھر ہیں۔ وہاں ان کے نام سے ایک قدیم موضع ''کلپر کہن'' (کلپر کاریز) ہے جو قلعہ بلوچ سے اندازاً تیس کلومیٹر پر وڑک جانے والے راستے پر واقع ہے لیکن ایرانی بلوچوں کے اس طائفے کو کسی بگٹی قبیلہ کے بارے میں علم نہیں ہے۔

مندرجہ بالا جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ بگٹی نام والے مرکزہ کے اردگرد جتنے بھی طائفے ہیں ان میں سے سوائے زرکانی کے کوئی ایک بھی بنیادی بگٹی مرکزہ کی نمائندہ نہیں ہے اگرچہ ان سب نے ملکر ایک مستحکم اور پائیدار بگٹی فیڈریشن کی بہترین آبیاری کی ہے۔

حواشی:

1۔بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر مری بگٹی کنٹری مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 624۔

2۔ایضاً صفحہ 625۔624۔

3۔کُردگال کے لئے ملاحظہ کیجئے موضوع ''مری'' کا اشاریہ نمبر 8 اور میر بجار کا قلات میں سیاہی کے پاس آنا کا اشاریہ نمبر 12۔

4۔دیکھئے جواہر لال نہرو کی کتاب ''تاریخ عالم پر ایک نظر'' حصہ اول، اُردو ترجمہ از طاہر منصور فاروقی۔

بلوچ تاریخ پر مفروضہ ترینی اور افغانی چھاپ

یوروپی مصنفین نے اپنی سیاسی و انتظامی ودفاعی پالیسیوں کے نقطہ نظر سے بلوچستان کے طول وعرض کا سفر کیا اور مختلف لوگوں اور قبائل سے گھل مل گئے اور علاقے کی جغرافیائی ساخت، زبان، تہذیب وتمدن، رسوم ورواج اور قبائل اور ان کی روایتی تاریخ، سماجی، معاشرتی اور مذہبی طور طریقوں کے بارے میں وسیع معلومات حاصل کیں۔ ان کا مقصد علاقے اور عوام الناس کے بارے میں جاننا اور اُن کی نفسیات اور طور طریقوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی جڑیں پیوست کرنا تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر کسی قسم کی تحقیقی کاوش ان کا مطمع نظر نہیں تھا۔ اس لئے ان کی نگارشات اور معلومات میں غلطیاں اور کمزوریاں ہونا قدرتی اور لازمی امر ہے۔ اور اس چیز کا انہیں بھی احساس تھا اس لئے انہوں نے اپنے مرتب کردہ گزیٹیئرز کے پیش لفظوں میں واضح طور پر لکھا کہ وہ جو کچھ پیش کررہے ہیں وہ حتمی تاریخ کا درجہ نہیں رکھتیں۔ ان معلومات کے حصول کیلئے انہوں نے قبائلی سرداروں، تھوڑے پڑھے لکھے گائیڈوں اور اپنے بعض مقامی ملازموں اور جان پہچان والوں کا تعاون حاصل کیا اور اپنی نجی محفلوں اور دعوتوں میں سنی گئی روایتوں اور قصہ کہانیوں کو بھی اپنے جمع کردہ معلومات کا حصہ بنایا۔

بعض بلوچ قبائل اور مواصفات کے بارے میں ان کی تحریروں سے یہ بات

بخوبی عیان ہوتی ہے کہ گزیٹیئر پارٹی میں کچھ نہ کچھ افغان اور خصوصاً ترین گائیڈ یا مددگار یقیناً شامل رہے تھے جنہوں نے جگہ جگہ بلوچ تاریخی واقعات اور قبائل پر افغان اور خصوصاً ترینی چھاپ لگوادی اور نہ صرف گزیٹیئر پارٹی کو گمراہ کیا بلکہ بلوچ تاریخ اور بلوچ قبائل کی تاریخ اور نسب کو مشکوک و متنازعہ بنانے کی غلیظ کوششیں کیں۔ اگرچہ تاریخ ہمیشہ کیلئے مفروضے اور غلط بیانیوں کی پرورش نہیں کرتی اور کسی نہ کسی مرحلے پر انہیں اپنے دامن سے جھٹک کر پھینک دیتی ہے اور سچائی کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ لیکن یہ حرکت اپنی جگہ ایک مکروہ، بے ایمانہ اور قابل مذمت عمل ہے۔ یہاں ہم ایسے موضوعات کا جائزہ لیں گے اور ان کی حقیقت پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ایسی کوششیں تاریخی حقائق کی پردہ پوشی کے خلاف قلمی جہاد ہوتی ہیں جو تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنے کیلئے ضروری ہوتی ہیں:۔

الف۔ اورماڑہ:

مکران کا ساحلی گاؤں اور موجودہ ضلع گوادر کی تحصیل اور ماڑہ بھی یوروپی گزیٹیئر پارٹی کے افغان گائیڈ یا معاون کی زہریلی دروغ گوئی سے بچ نہ سکا۔ اور اس بلوچی نام کو بھی کسی دربہ در "ارمڑ" افغان سے منسوب کیا گیا۔ اور قبیلہ "اورماڑی" کو مذکورہ "ارمڑ" کی نسل کہا گیا۔ یہ بھی لکھا گیا کہ اس کی نسل ابھی تک اورماڑہ میں موجود ہے۔

اورماڑہ ہی کے ایک تعلیم یافتہ شخص نے "اورماڑہ" پر "ان سائیڈ اورماڑہ" نامی کتاب لکھی۔ لیکن وہ بھی اپنے ہی گھر کی تاریخ اور اس کی تاریخی روایتوں کا کھوج لگانے میں کامل رہا اور اسی دروغگوئی کو حوالہ بنا کر اس کی مزید تشہیر کا باعث بنا۔ بعض تاریخی سچائیاں روایتوں میں چھپی ہوتی ہیں اور بعض اوقات وہ روایتیں متعلقہ شہر یا اس میں اس وقت رہنے والوں میں نہیں ملتیں لیکن اس کے ہمسایوں میں ملتی ہیں یا ان سابق باشندگان میں ملتی ہیں جو اب کسی اور مقام میں منتقل ہو چکے ہوتے ہیں۔ تاریخ کے طالب علم کو ان کے پیچھے پیچھے جانا ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم بلوچ پڑھے لکھے لوگ صرف زبان کے غازی بن گئے ہیں۔ ہم میں عملی ذمہ داری کا فقدان ہے۔ یہ غیر ذمہ داری ہمیں اپنے وطن، زبان، تاریخ اور ثقافت سے بیگانہ کرتی جارہی ہے جس کے تدارک کرنے کا ابھی تک ہم میں احساس بھی پیدا نہیں ہوا ہے۔

بات ہورہی تھی اورماڑہ کی جس کی وجہ تسمیہ کی ایک مفروضہ اور بے بنیاد تشریح کی گئی ہے۔ جسے ہم مذمت کے ساتھ مسترد کرتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ نام "اورماڑہ" نہیں ہے جسے کسی ارمڑ سے منسوب کیا جائے۔ ویسے بھی "ارمڑ" سے "ارمڑی" تو بن سکتا ہے لیکن "اورماڑہ" نہیں بن سکتا۔ چاہے اس لفظ میں جتنا بھی بگاڑ آجائے۔ یہ نام "ہورماڑہ" ہے۔ ہور جو عربی میں "حور" ہے کے معنی "خلیج" یا "کھاڑی" کے ہیں۔

دوسری بات یہ سچائی ہے کہ ایرانی بلوچستان کے ساحل تیز سے لے کر اور

ہنگول تک بلکہ اس سے بھی آگے تمام ساحلی علاقہ پر پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی سے ایک تاریخی غُرغُرکمان نژاد بلوچ قبیلہ رئیس بالادست رہا ہے اور اس بیلٹ پر اکثر گاؤں اسی قبیلہ کے رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ یہ قبیلہ مکران میں ''بیج وار'' یعنی ''بنیادی'' قبیلہ کہلاتا ہے۔ اس قبیلہ کے جو لوگ یا طائفے، سمندری روزگار سے وابستہ ہوئے وہ ''مید'' کہلائے یعنی مچھیرے۔ اسی قبیلہ کا ایک طائفہ ''ماڑہ'' تھا جو صدیوں سے اس ''ہور'' یعنی خلیج پر آباد تھا۔ اسی لئے یہ مقام ''ہور ماڑہ'' کہلایا یعنی ''ماڑہ قبیلہ کا خلیج'' اس میں کسی ''اُرمز'' وغیرہ کا عمل دخل نہیں رہا ہے۔ مذکورہ ''ماڑہ'' قبیلہ کے بعض لوگ یہاں سے نقل مکانی کر کے بلوچستان کے کچھی میں علاقہ ''ٹاکری'' کے آس پاس بس گئے جہاں وہ آج بھی اسی نام سے قبیلے کی صورت میں موجود ہیں۔ وہاں وہ اب بھی جھکی میں ''ماچھی'' یعنی ''مید'' کہلاتے ہیں اور وہاں کے جاموٹ قبیلہ کا ایک حصہ ہیں۔ واضح رہے کہ قبیلہ ''جاموٹ'' بھی رئیس قبیلہ ہے۔ (1)

اب آئیں اُس اُرمز کی طرف جسے افغان لکھا گیا ہے۔ اور ماڑہ کی آبادی میں ایک دو خاندان موجود ہیں جو اپنے کو ''ارمز'' کی نسل بتاتے ہیں اور ان کا الگ سے کوئی قبیلاتی نام نہیں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ''اُرمز'' کون تھا۔ اور کہاں سے آیا تھا۔ گزیٹر پارٹی کے افغان معاون نے اسے اپنے طور پر افغان لکھوایا تھا۔ یورپیوں نے اسے ایک روایت کی حیثیت سے لکھا اور اس کی تحقیق کرنا ان کے کام کا حصہ نہ تھا۔

'' اُرمز'' ایک ہندی جاٹ طائفہ تھا جو جاٹوں کی بلوچستان سے تا حد عراق کسی زمانے میں پھیلنے کے دوران اس مقام پر آباد ہو گیا تھا۔ شاید ان کی اکثریت مزید آگے چلی گئی تھی اور چند گھر اور ماڑہ میں رہ گئے تھے۔ یہ طائفہ موجودہ وقت میں بھی انڈیا، کشمیر میں موجود ہے اور اسی اُرمز قبیلہ کا ایک گروہ صوبہ سرحد کے پٹھانوں میں بھی جا کر شامل ہوا ہے۔ یہ افغان یا پٹھان نسل سے نہیں ہے اور ان کی زبان بھی الگ ہے جو اُرمڑی کہلاتی ہے۔ دی کاسٹس آف پنجاب ''کا مصنف ڈینزل ابسٹن لکھتے ہیں کہ ''اُرمڑ ایک ہند کی نسل ہے۔ جو پنجابی کی ایک قسم کی بولی بولتے ہیں جو اُرمڑی کہلاتی ہے۔ اس کے گرائمر کی منظوری کیلئے حال ہی میں (1881-1880ء) سرکار کو لکھا گیا ہے'' (2) اس طرح ثابت ہوا کہ ارمز کا افغانی خیال ایک مفروضہ اور دروغ گوئی تھا۔

جہاں تک ''اورماڑہ'' کے قبیلہ ''اورماڑی'' کی بات ہے۔ اور ماڑہ والے اسکی دو تشریحیں کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اس قدیم ''ہور ماڑہ'' کے رہائشی ہیں جو اصل مقام ''ہور'' سے نکل کر موجودہ گاؤں میں بس گئے اور قدیم مقام کی نسبت سے اس نئے شہر میں متعارف ہوئے اور اُسی نام کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ دوسرا ایک گروہ اور ماڑہ کے قبیلہ اُمراڑی (عمرانی کا جدگالی لہجہ) کا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ یہ قبیلہ اُمراڑی ہے جسے چند باہر سے آنے والے آبادکاروں نے اُرماڑی تلفظ کیا اور جو غلط العوام ہو گیا۔ بہرحال اب وہاں عمرانی بھی ہیں جو اُمراڑی

کہلاتے ہیں اور اُورماڑی بھی ہیں جو اپنے کو اُمراڑیوں سے قدیم تر بتاتے ہیں ان کا تعلق ''اُرمڑجاٹ'' خاندان سے نہیں ہے۔

حواشی :

1۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، جلد ہفتم، سال طبع 1907ء صفحہ نمبر 95۔

2۔ دی کاسٹس آف پنجاب ازڈیزل ایبسٹن، اُردو ترجمہ بنام ''پنجاب کی ذاتیں'' از یاسر جواد صفحہ 193۔

ب۔ رئیسانی

رئیسانی قدیم بلوچ قبیلہ رہا ہے۔ اور اس کا تاریخی تعلق علاقہ پنجگور سے رہا ہے جہاں ان کی قدیم جائدادوں کا سُراغ ملتا ہے۔ میر نُلا محمد رئیسانی اور اُن کے بعد سردار اسد اللہ خان اپنے زمانے میں متعدد مرتبہ اپنی قدیمی جائداد کی جستجو میں پنجگور جاتے رہے ہیں۔ اور رشتے ناطوں میں بھی انہوں نے ہمیشہ پنجگور سے اپنا تعلق جوڑے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نسلی محبت اور لگاؤ کا قدرتی جذبہ ہوتا ہے۔ پنجگور کی قوم ''رئیس'' کی تاریخ روایتوں کے مطابق جب پنجگور کے علاقہ پروم سے رئیسوں کا پہلا دستہ اُس وقت قلات کی طرف چلا گیا جب قلات پر میر چاکر رند کی بالادستی اور وہاں کی خوشحال زندگی کی باتیں مکران تک پھیل گئیں۔ اُن کے مطابق اس چھوٹے سے کاروانی دستے میں دو نامی گرامی رئیس شخص شامل تھیں۔ ایک میر ہیبتان (ہیبت خان) رئیس اور دوسرا میر زنگی خان رئیس تھا۔ یہ دونوں رئیس قبیلہ کی شاخ عمرزئی سے تھے۔ قلات

پہنچنے پر میر چاکر نے انہیں چھپر اور منگچر میں زمینیں دیں۔ اور سراوان خطے کا بیرک دار (جھنڈے کا مالک) بنایا۔ اُن دنوں تک یہ رئیسانی نہیں کہلاتے تھے۔ بلکہ اپنے مادر قبیلہ کے نام پر رئیس کہلاتے تھے۔ چند سال بعد جب میر کبیر رئیس نے سیوا قلات کے حکمران کی دعوت پر پنجگور سے لشکر کشی کی اور آکر قلات وزہری کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا۔ تو ان کے ہمراہ قبیلہ رئیس کا لشکری دستہ بلوچ قومداری نظام کے جنگی دستور کے مطابق ''رئیسانی'' کہلایا۔ سردار میر چاکر خان رند نے پنجاب جانے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے اپنے سُسر میر مندہ پھور رند کو اپنا نائب بنایا۔ جنہوں نے سراوان کا بیرک جو سردار چاکر خان نے میر ہیبت خان رئیس کو دیا تھا، اُن سے واپس لے کر شاہوانی رندوں کو دیا۔ جسے میر کبیر رئیس نے سراوان اور جھلاوان کی تشکیل کر کے پھر اُسی ہیبت خان کے حوالہ کیا۔ اس وقت قبیلائی نیا نام ''رئیسانی'' کا استعمال شروع ہوا اور میر ہیبت خان ہی اب رئیسانی کہلاتا تھا۔ ''دوسرے سرکردہ شخص میر زنگی رئیس کو سردار چاکر خان رند نے شال (کوئٹہ) میں دشت کے کُرد بلوچوں کی مدد کیلئے بھیجا جن کی کاسیوں سے لڑائی تھی اور انہوں نے سردار چاکر خان سے مدد کی درخواست کی تھی۔ اس بارے تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا لیکن کوئٹہ پشین گزیٹر میں اس قدر ایک اشارتی نوٹ موجود ہے :

" بلوچ تحصیل کوئٹہ کے جنوبی حصوں میں منتشر ہیں۔ تقریباً تمام شمار کنندہ رند ہی تھے ان میں سے کافی بلوچ (1) کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔ جو میر چاکر کے ایک

ہم عصر زنگی بلوچ کے ساتھ آیا تھا" (2) ان کے سرکردہ میر ہمیدان اور میر زنگی دونوں قبیلہ کے نام کی نسبت سے رئیس کہلاتے تھے۔ قلات وزہری کے سابق قابض قبیلے جدگال وغیرہ کے خلاف لڑنے کے بعد اسی لشکر نے بلوچ نظام قومداری کے جنگی دستور کے مطابق آنی کے لاحقہ کے ساتھ "رئیسانی" کا نام پایا اور پھر وہی میر ہمیدان رئیس اور میر زنگی رئیس، میر ہمیدان رئیسانی اور میر زنگی رئیسانی کہلائے۔ بلوچی نظام قومداری کی رُو سے "رئیسانی" کے معنی رئیسوں یعنی قبیلہ رئیس کا ایک رئیس یا ایک شخص۔

مندرجہ بالا قاعدے سے ثابت ہوتا ہے کہ گزیٹر میں روایتاً جسے "رئیس" کہا گیا ہے اور جس کا مرکزہ احمدون کے سپین ترین افغانوں کو کہا گیا ہے وہ کوئی شخص نہیں تھا بلکہ رئیس قبیلہ تھا اور مذکورہ اشخاص رستم، سراج، راہوسین اور سیاہی، کسی رئیس کی اولاد نہیں تھے بلکہ قبیلہ رئیس سے تھے (3) لیکن ترینی جھوٹی روایت کے برعکس ان کے خاندان کی احمدون و پشین وغیرہ میں رہائش و آبادکاری کا ثبوت موجود نہیں۔ اور گزیٹر نے بھی نہیں لکھا ہے کہ مذکورہ بالا چار شخصیتوں کے خاندان یعنی رستم زئی، سراج زئی، راہوسین زئی اور سیاہی زئی میں ایک گھر بھی پٹھان علاقے میں موجود ہے۔ رئیسانیوں کے چند خاندان جن کا ذکر گزیٹر دسٹرکٹ لورلائی میں کیا گیا ہے وہ لاسیانی، ماربانی سیمانی، اور موسیانی ہیں۔ جن کے جدّوں کے نام الیاس، ماریب، موسیٰ وغیرہ ہیں جو سو فیصد بلوچی نام ہیں اور ان کا قبیلائی نظام جس کا لاحقہ "آنی لی" ہے بھی پٹھان قبیلائی نظام (5) سے متصادم اور بلوچی قبیلائی نظام کے مطابق ہے۔ جو ثابت کرتا ہے کہ یہ دو چار قبیلوں کے کچھ گروہ مال چرائی کیلئے پٹھان علاقے میں چلے گئے

اور وہیں بس گئے۔ چونکہ یہ واقعتاً بلوچ طائفے تھے اور ان کی شکل وشباہت اور بلوچی نام اور قبیلائی نظام سب بلوچ شناخت کے تھے اس لئے تورترینوں نے اپنے ان ہمسایوں کو اپنے سے الگ اور ممیز کرنے کیلئے انہیں سپین ترین یعنی سفید رنگ کے ترین کا نام دیا ہے۔ ان ثبوتوں پر مزید یہ ثبوت کہ صرف یہی متذکرہ طائفے ہی سپین ترین کہلاتے ہیں جو رئیس الاصل ہیں۔ دسٹرکٹ گزیٹر کوئٹہ پشین میں تورترینوں کی تعداد 1901ء کی مردم شماری میں 6172 اشخاص تھی۔ جبکہ سپین ترین صرف 135 تھے جن میں سے صرف 81 اشخاص تحصیل پشین میں تھے۔ یہ تعداد کا فرق بھی اس کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ یہ کم لوگ اپنی اکثریت سے بچھڑنے والے مہاجر ہیں۔ کیونکہ ہمیشہ اکثریت اپنے مساکن میں جم جھکی ہوتی ہے اور ایک اقلیت ہی بھٹک سکتی ہے۔ لورلائی دسٹرکٹ گزیٹر ان کی بلوچ ہونے کی بھی تصدیق کرتا ہے۔

" ترین جو کچھ بھی ہیں لیکن خوش شکل لوگ ہیں اور
افغانوں کی بجائے بلوچوں سے زیادہ مشابہ ہیں۔" (4)

مزید یہ کہ اگر مذکورہ رئیس کو ایک شخص تسلیم کریں تو پھر بھی وہ افغان نہیں بلوچ ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ انگریز محقق لانگ ورتھ ڈیمز نے اس کا پورا شجرہ نسب چھاپ دیا ہے۔ اور اُسے رند سردار میر چاکر خان کا بھانجا بتا دیا ہے۔ (3) مندرجہ بالا تجزیہ تاریخی، و منطقی دلائل نے گزیٹر پارٹی کے ترین گائیڈ یا معاون کو جھوٹا ثابت کیا ہے۔

حواشی :

1۔بلوچ سے مراد شاید ''بلوچ خان'' نامی کوئی ہوگا۔

2۔ڈسٹرکٹ گزیٹر کوئٹہ پشین مطبوعہ گوشہ ادب، ری پرنٹ 1997ء صفحہ 854۔

3۔لالہ ہتورام نے اپنی تاریخ بلوچستان میں رئیسانیوں کا جو شجرہ نسب دیا ہے اُس میں ''رئیس'' نامی کوئی شخص نہیں ہے۔ نیز رئیسانی کیلئے ملاحظہ کریں پچھلے صفحات میں موضوع ''میر مندو رند کی حکمرانی'' کا اشاریہ نمبر 1 اور موضوع ''میر بجار کا منگچر پہنچنا اور میر مندو کے بارے میں معلومات لینا''۔

4۔ڈسٹرکٹ گزیٹر بلوچستان: لورلائی ڈسٹرکٹ، مطبوعہ ایضاً صفحہ 558۔

5۔پٹھانوں کا اپنا قبائلی نظام ''خیل'' کے لاحقہ سے ہوتا ہے۔ جیسے محمد خیل، زرخیل، سنزرخیل، مندوخیل وغیرہ، افغانوں میں قبیلہ جد کے مفرد نام سے تشکیل پاتا ہے جو ترک قبائلی نظام سے اخذ کردہ ہے۔ جیسے کہ کاکڑ، مہمند، ترین، دومڑ، ناصر، خروٹ وغیرہ۔ مذکورہ قاعدے پٹھانوں اور افغانوں کے اپنے قدیمی خطے کے بنیادی قبائلی قاعدے تھے۔لیکن جب وہ اپنی خانہ بدوشانہ زندگی میں بلوچ خطے میں پہنچے جہاں ان کا واسطہ نئی قبائلی تمدن سے ہوا۔جس میں مختلف مدارج کا قبائلی سسٹم تھا۔جس کا ابتدائی یونٹ ''زئی'' ہوتا تھا یعنی کسی کا خاندان اور اس کے لوگ تو انہوں نے بھی بلوچ کے ''زئی'' کو اپنایا۔

سن عیسوی کی تیسری صدی کی اول نصف سے آٹھویں صدی کی ابتدائی

سالوں کے درمیانی عرصے میں مستونگ کے شمال اور شمال مشرقی خطوں میں ''بلوص'' کے نام سے بلوچوں کا ایک قدیم مُلک ہوتا تھا۔ جسے بعض تواریخ میں بیلوس اور بعض میں ''بلیوس'' لکھا گیا ہے۔جس کا پہلا دارالحکومت قندھار اور بعد کا بُست تھا جو بعد میں الرمج کہلایا۔ یہ مُلک سینکڑوں بلوچ قبائل کا وطن تھا۔سب سے بڑا شاندار قبیلہ کرد ہوتا تھا اور دیگر قبائل کے بیسویں لکڑیا طائفے ہوتے تھے۔اور دُور دُور تک پھیلے ہوتے تھے۔جن کے آثار اُن کے ناموں کی صورت میں آج بھی نظر آتے ہیں۔ان قبائل اور ان کے طائفوں کے مُشتے از خروارے نام درج ذیل ہیں۔

گنج۔شال۔کُرد۔چلتن کرد۔بلخ۔کندہار۔ہیرمند۔دَرنگ (زرنگ اور زرنج میں بھی تلفظ کیا جاتا تھا۔زرنج، غالباً اس کا معرب تھا) سوس/سیس کُرد (شیث، سیش، شوش اور شیث میں بھی حلفظ ہوتا تھا)، زند، زیبار، سبز، بشام، مری، زرکان، گوران کُرد، سیاہ، سلیمان کرد، کاسا، نمروذ، مزاری کرد، وغیرہ جن کے ذیلی قبیلوں کی تشکیل ذئی کے لاحصہ سے ہوتی تھی جو موجودہ وقت میں بھی اُسی طرح جاری وساری ہے۔ چنانچہ پٹھانوں نے بھی اسی بلوچی سسٹم کو اپنالیا۔

پ۔ زرکزئی

انگریزی گزیٹر پارٹی کے پٹھان معاونین نے رئیسانی قبیلہ کی طرح چیف آف جھلاوان زرکزئی کو مستونگ کے ژڑخیل لکھوادیا تھا اور اس کی توضیح اس طرح کی :

" روایت کے مطابق ایک زرخیل ترین افغان زرک کی
اولاد ہے جو افغانستان سے زہری علاقہ میں آیا۔ موسیانیوں
کی جدگالوں کو علاقہ بدر کرنے میں مدد دی اور موسیانی
سردار میر بوہیر کی ایک لڑکی سے شادی کی۔"(1)

اس مفروضہ روایت کو پھر رائے بہادر ہتورام نے اپنی تاریخ بلوچستان میں جگہ دی ہے۔ انہوں نے لکھا :

" بہ ایام سرداری میر زہری موسیانی کے مسمی زرک
زرخیل افغان مورث اعلیٰ قوم زرک زئی کا بمعہ قریب
یک صد نفر لشکر قوم کو لے کر علاقہ مستونگ سے علاقہ
زہری میں آیا۔ چونکہ ان دنوں میں میر زہری موسیانی نے
وہ ملک تازہ اقوام لاسی اور چھٹہ (2) سے چھین لیا تھا
اور اب تک ملک کے اوپر بہت نزاع و جنگ و جدل
تھی۔ اس واسطے میر زرک کو اپنے ساتھ شامل کرلیا۔
(3)"

مذکورہ کہانی میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ اس طرح ہے کہ علاقے پر قدیم زمانے سے جاٹ اور جدگال قبائل چھائے ہوئے تھے۔ جب رند قبائل علاقے میں آئے تو جاٹ اور جدگالوں نے مزاحمت کی اور یہ لڑائی طول کھینچ گئی۔ تاوقتیکہ میروانیوں کا

زمانہ آیا۔ اور پھر یہ لڑائی میروانیوں اور جدگالوں کے درمیان چلتی رہی۔ لڑائی میں تیزی ایک اُس وقت آئی جب بُلفت قبائل کی سرکردگی میں جدگالوں نے سوراب کے میروانی قلعے پر دھاوا بول دیا۔ اور میروانی سردار میر عمر مع بھائی اور دیگر عزیزوں کے مقتول ہوا۔ دوسری مرتبہ لڑائی کا بھرپور زور اس وقت دیکھنے میں آیا کہ میر عمر کے بیٹے بجار نے جدگالوں کے خلاف لشکر جمع کرنا شروع کیا۔ اور بیسویں بلوچ اور کئی جدگال شخصیتوں نے میر بجار کو مسلح لشکروں کی مدد دی۔ موسیانی قبیلہ نے بھی آدم موسیانی کی قیادت میں لشکر مہیا کیا۔ یہی لشکر موسیانیوں کے آدم کی نسبت سے "آدمانی" کہلایا اس وقت زرک جو کوئی زرخیل ترین نہیں تھا اور نہ افغانستان کا مہاجر تھا، مستونگ میں زرخیلوں کے ہاں تھا اور قلات کے ایلتازئی رئیسوں کے کہنے پر میر بجار براہو کا جنگی اتحادی بنا۔ وہ قبیلہ کا رئیس توک تھا اور محمد تاوہ کا رہنے والا تھا۔ اُس کا ایک جد مادر بھائی بھی تھا۔ جس کا نام ڈُرک تھا۔ وہ بھی جنگ میں شامل تھا۔ براہو جدگال جنگ کی رزمیہ داستان کے مصرعہ 145 میں اُسے قبیلہ رئیس سے کہا گیا ہے۔ رئیس قبیلہ میں اس کا طائفہ "رئیس توک"(4) تھا۔ زرک کے تین بھائی اور تھے۔ جن کے نام شاہو، محمد اور متذکرہ ڈُرک۔ ڈُرک الگ ماں سے تھا جبکہ باقی ایک ماں سے تھے۔ ان کے باپ کا نام "منگسوئی" تھا۔ مذکورہ نام ہی تصدیق کرتا ہے کہ وہ پٹھان یا افغان نہیں تھا۔

یہ سوال کہ زرک، مستونگ میں زرخیلوں کے پاس کیوں چلا گیا تھا۔ کا جواب درج ذیل ہے۔

موضع محمد تاوہ کے مسجد میں مستونگ کا ایک پیش امام محمد حسن زرخیل تھا جسے
تنگسو نے بمعہ اہل وعیال وہیں رکھا تھا۔ جو محلے کے بچوں کو قرآن پاک پڑھاتا بھی
تھا۔ اُس کی شناسائی کی وجہ سے تنگسو اور اس کے لڑکوں کا بھی اُن کے خاندان کے
پاس آنا جانا تھا۔ جب زرّک کا باپ تنگسو فوت ہوگیا تو بیٹوں میں وراثت پر ناچاقی اور
لڑائی ہوئی۔(5) اور زرّک نے ناراض ہوکر بڈ پروشی کا اعلان کیا۔(6) اور مستونگ
جاکر اسی پیش امام کے پاس جارہا۔ کچھ عرصہ بعد بھائیوں میں صلح ہوگئی۔ لیکن اسی
دوران دوسرا واقعہ وقوع پذیر ہوا۔ میروانیوں اور مینگلوں میں وڈھ میں اراضیات کی
ملکیتوں پر لڑائی ہوئی جس میں مینگل قبیلہ کا سردار شاہی مارا گیا۔ جس کا بدلہ لینے کیلئے
شاہی زئیوں نے سُوراب کے قرب وجوار میں بات پھیلادی کہ جو قبیلہ یا شخص میروانی
سردار میرو براہو کو قتل کرے گا اور اُس کا سر بطور ثبوت مینگلوں کے پاس لائے گا تو
اُسے وڈھ کا تیسرا حصہ دیا جائیگا اور حفاظت کیلئے دو طائفے اُس کے ہمسائے بنائے
جائیں گے۔ زرّک کے بھائی محمد نے یہ کام اپنے ذمہ لیا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ
میروانی سردار میرو براہو کے پیچھے لگا ایک روز میرو اپنے آدمیوں کے ہمراہ شکار سے
واپس سوراب کے نغاڑ کی طرف اپنے قلعے میں آرہا تھا کہ راستے میں محمد اور ساتھیوں
نے ان پر حملہ کیا۔ جس میں میرو اور ساتھی مارے گئے۔ محمد نے میرو براہو کا سر کاٹ
لیا اور ایک انگلی جس میں اُس نے اپنا حاکی مہر پہنا ہوا تھا کاٹ کر وڈھ میں مینگلوں کو
بطور ثبوت پیش کیا (7) جس پر مینگلوں نے وڈھ کے تیسرے حصے کے طور پر

باڈری کا علاقہ محمد کو دیا۔ جو ابھی تک محمد زئی کے پاس ہے۔ اس واقعہ نے محمد کے
دوسرے بھائیوں کے لئے پریشانی پیدا کردی تھی۔ اس لئے انہوں نے محمد تاوہ چھوڑ کر
نئی پناہ گاہیں ڈھونڈلیں۔ زرّک جو پھر محمد تاوہ آچکا تھا دوبارہ مستونگ چلا گیا اور
زرخیلوں کے پاس رہا۔ شاہو خضدار کے پہاڑیوں میں خدرانی قبیلہ کی پناہ میں ملحوڑ
چلا گیا اور محمد کو باڈری مل گیا تھا۔ جدامادر بھائی دُرک کا اُن سے پہلے ہی ناطہ ٹوٹ چکا
تھا اور اُسے میروانیوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جب میر بجار براہو نے جدگالوں کے
خلاف لشکروں کی مدد مانگی تو لیلتا زئیوں نے خود بھی مدد دی اور زرّک کو بھی میر بجار کی
مدد پر آمادہ کیا۔ اس وقت تک مینگلوں اور میروانیوں میں بھی صلح ہوچکی تھی۔ جب میر
بجار کی سرکردگی میں براہو اتحادیہ نے جدگالوں کو علاقہ بدر کردیا تو زرّک کو ان کی
خدمات کے سلسلے میں زہری علاقے میں مٹ کی اراضیات دی گئیں۔ براہو جدگال
جنگ کی رزمیہ داستان میں اس کا تذکرہ موجود ہے اور زرک کو ''نوجوان زرّک'' کہا
گیا ہے۔ سردار موسیانی زہری میر بوہیر نے زرّک کو داماد بنایا تھا۔ اور یہ بلوچی کوڈ
آف آنر دنیا کو معلوم ہے کہ وہ کسی غیر قوم کو اپنی بیٹیاں نہیں دیتے چہ جائیکہ ایک
لاوارث افغانی مہاجر سے رشتہ ناطہ کریں۔ اس لئے انگریزوں کے پٹھان گائیڈوں کی
طرف سے یوروپیوں اور ہتورام کو سنائی گئی کہانیاں غیر حقیقی ہیں اور بدنیتی پر مبنی
ہیں۔(8)

حواشی :

1۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیرز جھلاوان ڈسٹرکٹ مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 1997ء، صفحہ 205۔

2۔ جُھنڈ اور لاسی (لسبیلہ کے قبائل) کا شمار جدگالوں میں ہوتا تھا۔ جن کی سرکردگی جلشت قبیلہ کے ہاتھ میں تھی۔ جدگال ان بلوچوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی بلوچی زبان چھوڑ کر جٹوں کی زبان اپنا چکے ہوں۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے ہماری کتاب ''کمبران'' اور ''تاریخی نیشانک'' مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔

3۔ تاریخ بلوچستان از لالہ ہتورام مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1998ء صفحہ 144۔

4۔ رئیس توک، اُن رئیسوں کو کہتے ہیں جو دشت گوران میں رود ہنجو کے مشرقی پہاڑی کے اندر (توک) میں رہتے ہیں۔ توک بلوچی میں اندر یا اندرون کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ موضع پہاڑیوں کے اندرون میں ہے اس لئے توک کہلاتا ہے اس کے باسی جو قبیلہ رئیس سے ہیں، رئیس توک کہلاتے ہیں۔ قبیلہ رئیس کے جو لوگ یہاں سے نکل کر دوسرے علاقوں میں رہتے ہیں انکی بھی شناخت رئیس توک ہی ہے۔

5۔ اگر زرک کوئی افغان مہاجر ہوتا تو اس کے باپ کی میراث کہاں سے آتی جس پر لڑائی ہوتی۔ اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ والد مقامی میراث دار شخص ہو اور بیٹا افغانستان کا مہاجر ہو۔

6۔ ہڈ پروشی نی' بلوچی میں ''ہڈی توڑنے'' کو کہتے ہیں۔ ہڈی توڑنا ایک بلوچی رسم

ہے۔ جو رشتہ توڑنے کو کہتے ہیں۔ اس رسم کی رُو سے کوئی شخص یا طائفہ یا قبیلہ کا کوئی گروہ اپنے قبیلہ سے ناراض ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کرے اور کسی دوسرے قبیلے میں شامل ہونے کیلئے جا کر اُس کا ھمسایہ بنے اور پھر اُس قبیلہ سے درخواست کرے کہ وہ اُسے یا انہیں اپنا حصہ بنائیں۔ اگر وہ قبیلہ راضی ہوا تو ایک فنکشن یا محدود جرگے میں انہیں اپنا حصہ بنانے کا اعلان کیا جائیگا پھر دعوتیں ہوں گی اور نئے آنے والے یہ عہد کریں گے کہ وہ ہر خوشی اور غم میں قبیلہ کا ساتھ دیں گے۔ پھر ان نئے شامل ہونے والوں کو قبیلے کی زمینوں میں حصّہ دار بنایا جاتا ہے۔ اور آپس میں رشتے ناطے کئے جاتے ہیں۔ اگر نئے شامل ہونے والے تعداد میں زیادہ ہوں تو مقامی قبیلہ کا سردار انہیں قبیلے کا ایک اضافی ٹکر تسلیم کرکے ان میں سے لائق ترین شخص کو ان کا ٹکری بنا کر اس کی دستار بندی کرے گا۔ جو اس ٹکری کے نام کا ایک ''زئی'' ہوگا۔

7۔ جس مقام پر ''میرو'' کو قتل کیا گیا تھا وہ مقام آج تک چیدہ (پتھروں کا ڈھیر بنا کر یادگار چھوڑنا) ہے اور ''ہیزانی چیدہ'' کہلاتا ہے۔ سوراب کے نغاڑ سے زیادہ دور نہیں ہے۔

8۔ ہتورام کی اپنی کوئی تحقیق نہیں ہے۔ اس کا اور گزیٹیر پارٹی کا مواد مشترکہ اور ایک ہی ہے۔

ت۔ شال (کوئٹہ)

ان موضوعات میں ایک مفروضہ کوئٹہ کے اصل اور قدیم نام "شال" کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ہے۔ جسے افغان بادشاہ احمد شاہ ابدالی سے منسوب کیا گیا ہے۔ (1) کہا گیا ہے کہ انہوں نے کوئٹہ کا علاقہ خانِ بلوچ میر نصیر خان (نوری) کی بیش بہا خدمات کے پیش نظر اُس کی ماں کو بطور شال سوغات کیا تھا۔ اسی لئے پھر یہ "شال" کہلایا۔ یہ ایک بے بنیاد اور بنائی ہوئی غیر تاریخی بات ہے۔ ابدالی اتنا سخی بادشاہ نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خانِ بلوچ نے احمد شاہ کو پانی پت اور مشہد کی لڑائی میں بلوچ سپوتوں کے جانوں کی قربانی دلا کر فتح سے ہمکنار کر کے سرخرو کیا تھا لیکن اس کا ظرف اتنا تنگ تھا کہ اگر بلوچستان کے کسی جنگل میں کسی کاروباری گشتی افغان کو بھیڑیا زخمی کرتا تو وہ خانِ بلوچ سے اُس کے تاوان کا مطالبہ کرتا تھا۔ اسی طرح قندہار سے سوئمسیانی تجارتی سامان لیجانے والے کسی افغان کو اگر اُس کا افغان ساتھی لوٹتا یا قتل کرتا تو وہ خان بلوچ سے اُس کے مال کے نقصان کا مطالبہ کرتا اور مقتول کا خون بہا مانگتا تھا۔ ایسے ہی گھٹیا رویوں کا نتیجہ تھا کہ خان بلوچ اُس کے مقابلے پر آنے پر مجبور ہوا (2) اس لئے "شال کو ابدالی کی سخاوت سے منسوب کرنا ایک من گھڑت روایت ہے۔ ویسے بھی علاقائی نام اس طور نہیں پڑتے بلکہ وہ اقوام کی آبادکاری اور رہن سہن کے تاریخی عمل کے گہرے آثار ہوتے ہیں۔

" شال" ایک قدیم بلوچ قبیلہ تھا جو بارھویں صدی عیسوی کی شروعات میں

ایرانی سیستان میں واقع "بلوچ سطح مرتفع" میں بود و باش رکھتا تھا۔ اور وہیں سے اس کا کوئی گروہ ہجرت کر کے اس خطے میں بس گیا تھا۔ اور یہاں کے قدیم تورانی قلعے کو اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔ جو پھر "شالکوٹ" یعنی شال قوم کا قلعہ کہلایا اور جہاں پر ان کی بستی جم گئی وہ مقام ان کے نام پر شال کہلایا اور جس درّے سے ان کے شہر میں داخل ہوا جاتا تھا یا خروج ہوتا تھا وہ درہ ان کے شہر کے نام پر "شال درہ" کہلاتا تھا۔ 1876ء تک جب انگریزوں نے اس شہر پر قبضہ کیا تو یہ تینوں مقامات اپنے انہی قدیم ناموں سے معروف تھے۔ انگریزوں نے ایک غیر متعلق اور مہمل نام کوئٹہ کو رواج دیا جس نے شال کی جگہ لے لی اور بلوچ قومی آثار اور بلوچ سے بُغض رکھنے والی پٹھان قوم پرست پارٹی نے شالدرہ کے اطراف میں افغان مہاجروں کی غیر قانونی بستیوں کو سرکار کے تعاون سے جما کر وہاں "پشتون درّہ" اور "پشتون آباد" کے غیر تاریخی اور غیر علاقائی ناموں کو رواج دیا۔

1200ء میں خضر خان بلوچ نے جو غالباً خود بھی شال قبیلہ سے تھا، اپنے جن پانچ ہزار جنگجو بلوچوں کے ساتھ جیسلمیر اور کُھڈال پر حملہ کیا تھا تو اُس کے لشکر میں شال قبیلہ کے بھی کافی جنگجو شامل تھے۔ موجودہ وقت میں اس قبیلہ کے چند گھرانے ایران کے سیستان میں اور کافی گھرانے کشمیر میں آباد ہیں۔

سولھویں صدی عیسوی کی شروعات تک شال قبیلہ کی باقیات کی موجودگی کے آثار ہیں۔ گمان یہ ہے کہ جب 1511-1510ء کے دوران جب شاہ بیگ ارغون

نے بابر مرزا کے خوف سے قندہار چھوڑا اور شال چلا آیا اور اسے اپنے دست نگر کر کے شالکوٹ کے قرب وجوار کی آبادی کا قتل کر کے اسے بیدخل کیا تو یہ مظلوم بلوچ بھاگ کر مستونگ اور منگچر چلے گئے۔ جہان پر یہ اپنے مسکن شال کی نسبت سے مقامی قبیلوں میں ''شالی'' کہلائے یعنی شال سے آنیوالے۔ گمان غالب یہی ہے کہ یہ شال قبیلہ کے باقیات تھے۔

حواشی :

1۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر کوئٹہ پشین ڈسٹرکٹ مطبوعہ گوشہ ادب 1997ء صفحہ 812۔ اور تاریخ بلوچستان نیٹو ہتورام مطبوعہ گوئٹہ ادب 2009ء صفحہ 373۔

2۔ تفصیل کیلئے دیکھئے ''تاریخ خوانین قلات'' آخوند محمد صدیق اردو ترجمہ گل خان نصیر مطبوعہ نساء ٹریڈرز کوئٹہ 1982ء صفحہ 64-61، باب نصیر خان اول۔

ج۔ شہزادہ

شہزادہ مکران کے ساحلی شہر جیوانی کے بنیادی باشندے کہے جاتے ہیں۔ جبکہ پیشکان ضلع گوادر کے رئیس قبیلہ کا کہنا ہے کہ قدیمی باشندے رئیس رہے ہیں۔ جنکی اچھی خاصی آبادی ابھی بھی وہاں رہائش پذیر ہے۔ ان کا گاؤں ''رئیسانی بازار'' کہلاتا ہے۔ رئیس معتبرین اور بزرگوں کا کہنا ہے کہ شہزادہ ''شیخ زادہ'' ہیں مکران کے

لوگ ''خ'' کی جگہ ''ح'' یا ''ہ'' بولتے ہیں۔ مکران میں ''شیخ'' کے علاوہ فقیر اور صاحبزادہ کو ''شہہ یا شے'' کہتے ہیں۔ اس طرح شہزادہ قبیلہ بنیادی طور پر فقیر اور بزرگ شخصیتوں کی اولاد ہیں۔ جنہیں یورپی مصنفین نے اپنے مبینہ افغان گائیڈ یا معاونوں کے کہنے پر افغان جمند قبیلہ سے لکھوایا جو صوبہ سرحد کے مروت سے آ کر یہاں آباد ہوا اور ایک بہت بڑے ناممکن الحصول کارنامہ سرانجام دینے پر ''گبد'' کا علاقہ اسی خدمت میں پایا(1) لیکن یوروپی مصنفین نے یہ نہیں بتایا ہے کہ ''گبد'' علاقہ کا مالک کون تھا یا کون تھے جنہوں نے اس مسافر اور مروت کے مہاجر ''جمند'' کو مذکورہ علاقہ بخش دیا۔ اب آئیں دیکھیں کہ وہ ناممکن الحصول کام کونسا تھا۔ جو اور کسی انسان یا انسانوں سے نہ ہوسکا اور پہلوان جمند نے سرانجام دیا۔ مکران گزیٹر لکھتا ہے کہ اُس نے دو دریاؤں، دریائے کیچ اور دریائے نہنگ کو اُن کے پرانے راستوں سے بدل کر گوک پروش''(2) کے راستے دشت میں لایا۔(3) گزیٹر پارٹی کو اس دیومالائی جمند افغان کی زبردست کارکردگی لکھوانے والے پٹھان معاون نے دوسری بات نہیں لکھوائی کہ سینکڑوں سالوں سے یہ دو دریا کن راستوں سے بہہ کر سمندر میں گرتے آرہے تھے۔ مزید گزیٹر لکھتا ہے مذکورہ 'جمند' افغانوں کے جداعلیٰ سٹربن کا نواسہ اور خرشبون کا بیٹا تھا۔(4) سبحان اللہ کیا بات ہے۔ افغان تواریخ میں خرشبون ولد سٹربن ہزاروں سال قبل کی شخصیت تھی لیکن اُس کا ''روئے زمین کا طاقتور ترین بیٹا

جمند" سترھویں صدی عیسوی میں جیونی میں نزول کرتا ہے۔علاوہ ازیں "جمند" صاحب خودتو افغان تھے لیکن اس کی اولاد "شیخ" کہلائی اور اگلی نسل "شہزادہ" بن گئی۔ کیا مطابقت اور تعلق دکھایا گیا ہے۔گزیٹر اور ہتورام کو بے نام اور گمنام ترینوں اور افغان معاونین نے قدم قدم پر مفروضے لکھوا کران کی تحریروں کو انتہائی مشکوک بنا کر تاریخ کے قاری کو گمراہ کرنے کی سعی کی ہے۔ جہاں ہم ایسے منافقین کو ان کے گھٹیا کردار پر ان کی مذمت کرتے ہیں وہاں ہمیں اپنے قبائل اور ان کے پڑھے لکھے افراد کو قابل مذمت گردانا چاہیے جنہوں نے سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی اپنی تاریخ کی اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کی اور غیروں کے جھوٹے قصے کہانیوں کو بار بار دھراتا ہوا دیکھتے ہیں۔

شیخ زادوں کے علاقہ "جیوانی" کی وجہ تسمیہ بھی کسی "جیون" نامی افغان سے منسوب کردیا گیا ہے۔جو یہاں آ کر آباد ہوا اور پھر علاقہ یا شہر اس کی نسبت سے "جیونی" کہلایا یہ مفروضہ بھی اُن دیگر کئی مفروضوں میں سے ایک مفروضہ ہے۔مکران میں جیوانی کے بارے میں یہ روایت عام ہے کہ ایک قدیم بلوچ قبیلہ "پیشک" رند قبائل کی مکران میں آمد سے پہلے سیستان کے شہر "جیوان" سے ہجرت کرکے اس ساحل پر آباد ہوگیا اور اپنے قدیم مسکن "جیوان" کی نسبت سے یہاں پر "جیوانی" کہلائے۔ "جیوان" کا شہر سیستان میں "لاش" کے نزدیک واقع ہے۔ "جیوانی" قبیلہ کی وجہ

سے شہر کا نام جیوانی مشہور ہوا۔روایت ہے کہ جب پرتگیزوں نے جیوانی کو بار بار لوٹا تو مذکورہ "پیشک" قبیلہ کی اکثریت یہاں سے نکل مکانی کرکے گوادر کے اطراف میں آباد ہوا۔اور وہاں جس مقام پر آباد ہوا وہ ان کی نسبت سے "پیشکان" کہلایا۔جواب تک اسی نام سے موسوم ہے۔"پیشکان" پیشک کی جمع ہے یعنی "پیشک لوگ"۔ جیوانی کے باقیماندہ پیشکوں کا قبیلائی نام "جیوانی" نام میں دب کر رہ گیا۔

ایک دوَر ایسا تھا کہ ہندوسندھ کے جاٹ قبیلے پورے مکران میں پھیل گئے تھے۔اور ان کی کئی آبادیاں پھیلتے پھیلتے عراق تک پہنچ چکی تھیں۔مکران میں بھی ان کی نو آبادیاں بن گئی تھیں۔ان جاٹوں نے کئی بلوچ قبیلوں اور مواضعات کے ناموں کو غلط تلفظ سے ادا کئے تھے۔جیوانی کو وہ اپنے لہجے میں جیونٹری اور جمیڑی کہتے تھے۔اسی تلفظ سے فائدہ اٹھا کر گزیٹر پارٹی کے افغان گائیڈ نے اپنے کسی جیون کو بیچ میں گھسیٹ دیا تھا۔

حواشی :

1۔بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیرز: مکران مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1999، صفحہ 743۔

2۔گوک پروش تربت (کیچ) کے جنوب مشرق میں ایک پہاڑی سلسلہ ہے۔

3۔کتاب ایضاً صفحہ 743

4۔ایضاً۔

بلوچستان

بلوچ + ستان کے معنی بلوچ قوم کا وطن یا بلوچ قوم کا علاقہ۔ یہ ترکیب فارسی زبان کا ہے۔ فارسی ترکیب کا استعمال یہ بتاتا ہے کہ بلوچ وطن کو ''ستان'' اس دور میں کہا گیا جب فارسی زبان بلوچ خطے تک پہنچ چکی تھی اور مروج ہو چکی تھی۔ لیکن بلوچستان لفظ بروقت تحریر میں نہ آسکا اس سے یہ اخذ کرنا کہ لفظ ''بلوچستان'' قدیم نہیں ہے ایک جاہلانہ بات ہے۔ اس جہالت کا تذکرہ کئی مصنفین نے کیا خصوصاً یوروپی مصنفین نے۔ جنہوں نے لکھا کہ اس بلوچ علاقے کو ''بلوچستان'' کا نام پہلی دفعہ نادرشاہ افشار نے دیا۔ اور اس مفروضے کو کئی مصنفین نے دُھرایا(1) نادرشاہ تو اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط کی حکمران شخصیت ہے۔ اس وقت تک تو بلوچستان کا نام پوری دنیا میں متعارف ہو چکا تھا۔ گذشتہ صفحات میں حاکم قلات میر مندو رند پر بحث کرتے ہوئے ''تاریخ افاغنہ'' کا حوالہ دیا گیا جو نعمت اللہ خان کی لکھی ہوئی کتاب ہے جو سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھی گئی ہے اس میں میر مندو کیلئے ''بلوچستان کا امیر'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ رائے ہتورام اسے پندرھویں صدی عیسوی کا مروج نام لکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے جس زمانے میں بلوچ سیستان میں آئے اور قلات وبخارہ(5) کا نام قلات بلوچ میں بدل گیا تو سیوستان کا نام بھی بلوچستان ہو گیا تھا۔(6)

بلوچ ایک قدیم قوم ہے اور 5800 ق م کی نسل ہے۔ یہ قوم جہاں آباد تھی وہ ایک وسیع علاقہ تھا اور اس قوم کے نام سے تھا یعنی ''بلوچ''۔ کسی قوم کے وطن کیلئے یہ ضروری نہیں کہ اس کے نام کے ساتھ ''ستان'' کا بھی لاحصہ ہو۔ ''ستان'' ایران کی فارسی زبان کا لفظ ہے لیکن خود ایران ''ایرانستان'' نہیں کہلاتا نہ کہ آریاستان کہلاتا ہے۔ تو کیا اس کا مطلب یہی لیا جائے کہ ایران والوں کے وطن کا وجود نہیں ہے۔ قدیم زمانے میں قوموں کے وطن یا مسکن اس قوم ہی کے نام پر ہوتے تھے۔ اور وہ نام آج تک موجود ہیں۔ اسی طرح بلوچ وطن بھی زمانہ قدیم سے موجود رہا ہے اور ملک بلوچ ''بلوچ''، بلوص، بیلوص نام کے علاقے مختلف زمانوں میں وجود رکھتے رہے ہیں اور تاریخی کتابوں میں اگرچہ تفصیل نہیں لیکن اشارتاً ان کی نشاندہی ہوتی رہی ہے۔ اور بعض زمانوں میں ان کا جغرافیہ بھی آگے پیچھے ہوتا رہا ہے لیکن اسی ایک ہی خطے کے اندر یا آس پاس اس کا وجود نظر آتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر موجودہ منقسم مغربی اور مشرقی مکران میں فارس کے پہلو میں ساڑھے چار ہزار سال سے ''ملک بلوچ'' موجود رہا ہے جس کا مرکزی مقام ضلع گوادر اور ضلع کیچ کے دشت کا ''سنٹ سر'' رہا ہے جہاں کالدیا کا عظیم بادشاہ نمرود بلوچ (نمرود دوئم) کا تاریخی قلعہ واقع تھا۔ جس کے دیوہیکل ملبہ جاتی آثار آج بھی نمرود کلات کے نام سے موجود ہیں۔(2) ہزاروں سال کے اس ''ملک بلوچ'' کا تذکرہ چھٹی صدی عیسوی سے دسویں صدی عیسوی کے درمیانی عرصے کی عربی تصنیفات میں بھی ملتا ہے۔ شریف ادریسی نے بلوچ قوم کے کوچ قبائل کے

حدود کی نشاندہی میں "ملک بلوچ" کا بھی نام لیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے :

" اُن کے پہاڑ خلیج فارس تک پہنچتے ہیں۔ شمال کی طرف
کرمان تک، جنوب اور مشرق کی طرف سمندر تک اور مکران
کے صحرا تک، مغرب میں سمندر اور ملک بلوچ اور ماتبان
اور ہرمز تک۔" (کتاب "نزہت المشتاق" عربی)

اس کے علاوہ موجودہ ایرانی صوبہ بلوچستان کے علاقہ "سرحد" کے ساتھ والا وسیع و عریض قدیم ہموار خطہ کا نام بھی "بلوچ" ہوتا تھا جس کا تذکرہ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کی نگارشات میں ملتا ہے اور اب بھی ایرانی کتابوں اور نقشوں میں اُسے بلوچ سطح مرتفع کہا گیا ہے۔ یہ بھی بلوچوں کے قدیم وسیع و عریض ملک کا ایک شمالی حصہ یا خطہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سن عیسوی کی آٹھویں صدی تک اور اس کے کچھ عرصہ اور بعد تک مستونگ کے شمالی خطے میں بھی ایک بلوچ ملک ہوتا تھا جو "بلوص"، بیلوص اور کبھی بلیوس لکھا جاتا تھا۔ ملک محمد سعید دہوار لکھتے ہیں :

" ظہور اسلام کے وقت سندھ میں ایک وسیع سلطنت
قائم تھی۔ جو شمال میں کشمیر تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں
پنجاب کا ایک بڑا حصہ شامل تھا۔ شمال مشرق میں اس کی
سرحدیں ریاست قنوج سے ملتی تھیں۔ مغرب میں مکران یا کیچ
مکران کردان (کزدار)، کیکان یا کیکانان کا وسیع خطہ اس
میں شامل تھا۔ شمال مغرب میں اس وسیع مملکت کی سرحدیں

سجستان کی حد تک اس وسیع علاقے کی حدود کو چھوتی ہوئی کوہ
سیاہ یا مہتر سلیمان کے دامن کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں، جو
بیلوس کے نام سے موسوم تھا۔ "(3)

آگے عرب دور اقتدار کے باب میں لکھتے ہیں کہ عربوں نے سیستان پر ۲۳ ہجری سنہ 644ء میں کئی علاقے فتح کئے جو حدود ہند تک تھے اور اس کے ساتھ ہی

" ولایت قندھار کے ایرانی صوبے پر بھی ان کا
تسلط ہو گیا جو اس زمانے میں رخج یا الرخج کے نام سے
موسوم تھا اور جس کو بیلوس کا نام بھی دیا جاتا تھا۔ "(4)

پھر آہستہ آہستہ بلوچوں کا یہ ملک بیرونی یلغاروں کی زد میں آتا گیا اور سکڑتا گیا اور اس سرزمین پر "الرخاج" یا "الرخج" کا نیا نام پڑتا گیا۔ ایک وقت آ گیا کہ "بیلوص" ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود ہو گیا۔ 977ء میں جب سلطان سبکتگین نے اس خطے پر اپنا قبضہ جمایا تو یہی محدود خطہ بیلوص کہلاتا تھا۔ میجر ریورٹی نے اپنی کتاب نوٹس آن افغانستان اینڈ بلوچستان میں لکھا ہے کہ 977ء میں سبکتگین نے بُست پر قبضہ کرنے کے بعد جس میں بیلوس یا الرخاج کے تمام علاقے شامل تھے، خضدار پر حملہ کر دیا۔"

مندرجہ بالا جائزہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بلوچ وطن کا وجود قبل مسیح کے زمانوں سے ثابت ہے۔ صرف اس کے ساتھ فارسی کے ستان کا لاحقہ، فارسی زبان کے

بلوچستان میں رائج ہونے کے زمانے کا ہے اور اسے نادرشاہ سے منسوب کرنا تاریخ سے لاعلمی اور ایک ذہنی اختراع ہے۔

حواشی :

1۔اُردو دائرۃ المعارف" 1975ء لاہور، جلد چہارم صفحہ 868۔

2۔ملاحظہ کیجئے گذشتہ صفحات میں "بُرزکوہی" کا اشاریہ نمبر 7۔

3۔تاریخ بلوچستان از ملک محمد سعید دہوار مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سال 2007 صفحہ 250۔نیز دیکھئے موضوع "ریئسانی" کا اشاریہ نمبر 6۔

4۔ایضاً صفحہ 259ء

5۔یہ نام "قلات وبنجارہ "نہیں ہے جیسے کہ ہتورام نے لکھا ہے اور نہ کہ "قلات بنجارہ" ہے جیسے کہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں تحریر کیا ہے۔یہ "قلات نیچارہ" ہے جس کا نام آج بھی یہی ہے۔آئین اکبری میں شاید کتابت کی غلطی سے بنجارہ لکھا گیا ہوگا یا پھر انہوں نے بنجارہ ہی سنا ہوگا۔یا پھر اُس زمانے میں موجود ایک آوارہ قبیلہ بنجارہ کو دیکھ کر وہ اسے بھی بنجارہ سمجھتے ہوں گے۔عربوں کی تواریخی کتابوں میں بھی ایسی بیسویں غلطیاں موجود ہیں۔جنہیں بجائے اصلاح کرنے کے اسی حیثیت سے قبول کیا جاتا رہا ہے۔روایتاً نیچارہ ایک قدیم تُرک قبیلہ تھا۔جس کا یہ قلات (قلعہ) تھا۔

6۔تاریخ بلوچستان، ہتورام، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 2009ء صفحہ 320۔

بُلیدہ

بُلیدہ، مکران کے ضلع کیچ کا سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔اس کی شہرت سترھویں صدی سے شروع ہوئی۔اس سے قبل بلوچ تاریخ میں "زامران" کی شہرت ہوتی تھی، علاقے کے قدیم قلعے جنہیں آجکل بلیدہ کے قلعے کہا جاتا ہے، پہلے زامران کے جنگ باز اقوام کے قلعے کہلاتے تھے۔ہتورام نے اپنی تاریخ میں اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یوں لکھا ہے :

> " وجہ تسمیہ اس کا یہ ہے کہ جس زمانہ میں بلوچ لوگ علاقہ مکران میں داخل ہوئے اس مقام پر اقوام بلیدی نے سکونت اختیار کی، اس سبب سے اس کا نام بلیدہ مشہور ہوگیا۔"(1)

ہتورام نے محولہ بالا پیرے میں جو بات مکران میں بلوچوں کے ورود کرنے کی ہے وہ اُس کی لاعلمی ہے۔دراصل اُس کی مراد رند قبائل کے ایرانی بلوچ علاقوں سے مشرقی مکران میں داخل ہونے سے ہیں۔جو ایران کے بلوچوں میں صدیوں رہنے کے دوران بلوچ میں مدغم ہوئے اور بلوچ کہلائے۔جن کی اصلیت بلاشک وشبہ تُرک نسل ہے۔اُن کے شجرہائے نسب کے اجداد گل چراغ، سُرخ تاج اور اغلمش رومی نامور تُرک شخصیتیں رہی ہیں۔اور تمام شاہی نسل ہے۔اغلمش رومی جو ان سب کا جداعلیٰ

ہے وہ قدیم تُرکستان کا ایک بادشاہ ہو گذرا ہے جو تُرکی کے شاہی شہر اناطولیہ کے موضع ''روم'' کا باشندہ تھا جہاں پر اُس کے نام کا تاریخی قلعہ اُلمش وزا امیر تیمور لنگ برلاس کی اناطولیہ پر قبضہ کے وقت نیم ویران حالت میں موجود تھا۔جس میں تیمور نے ترکی کے گرفتار حکمرانوں اور اہم شخصیتوں کو قید رکھا اور ایک حصے میں گھوڑے اور ان کے خادم اور دیگر نوکر چاکروں کو ٹھہرایا تھا۔

بلوچ قوم ہزاروں سالوں سے مکران کی سرزمین پر موجود تھی۔اور اسی مکران کے ایک وسیع خطے میں اُن کے نام سے ''ملک بلوچ'' بھی وجود رکھتا تھا اسی ملک بلوچ کے جنوب مشرقی حصے میں جہاں گواوری دشت ہے، ان کے ایک جدّ اور کالدیا کے ایک شہنشاہ نمرود بلوچ کا قلعہ واقع تھا۔جس کے آثار دیوہیکل ملبوں کی صورت میں آج بھی سنٹ سر کے مقام پر میلوں دور سے نظر آتے ہیں۔یہ مقام موجودہ وقت میں ''دسنگکیں ڈور'' اور ''سونکال'' ءِقلات'' کے نام سے مشہور ہیں(2)

ہتورام نے جو بات وجہ تسمیہ کی بیان کی ہے وہ بھی غلط ہے۔بُلیدئی قبیلہ سے ''بلیدئی'' نام تو پڑ سکتا ہے بلیدہ نہیں۔بلکہ جو بلیدئی قبیلہ ہے وہ بلیدہ کی نسبت سے بلیدئی کہلاتا ہے۔اگر پہلے بلیدہ وجود نہ رکھتا تو بلیدئی کی نسبتی ترکیب بھی نہیں بن سکتی تھی۔اس لئے ہتورام کا یہ لکھنا کہ بلیدہ کا نام بلیدئی قبیلہ کی وجہ سے پڑ گیا ہے سراسر نادانی اور بے عقلی کی بات ہے۔

بُلیدہ ایک عرب قبیلہ تھا جو سعودی عربیہ کے شہر ریاض کے شمال میں مدینہ

منورہ کے علاقہ ''قاسم'' میں گاؤں قصیبا اور ذُلفی کے درمیان آباد تھا۔اب بھی وہ مقام اس قبیلہ کے نام پر بُلیدا ہے۔

چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے دوران عرب ممالک اور ہندوستان کے درمیان خشکی اور سمندری راستوں سے تجارتی آمدورفت ہوتی رہی ہے۔تواریخوں میں لکھا ہے کہ عربوں کے تجارتی قافلے ہندوستان میں راجہ ہرش کے زمانے سے آجاتے رہے ہیں۔وہ بلوچستان میں پہنچ گئے اور سندھ پر قبضہ کر لیا تھا۔راجہ ہرش 648ء میں فوت ہو گیا تھا۔(3) اُس وقت سے عربوں کی آمدورفت تجارتی مقاصد کے علاوہ تبلیغی اور جہادی مقاصد کے لئے بلوچستان کے راستے مسلسل جاری و ساری رہتا تھا۔ بلوچستان تو باب ہندوستان اور باب اسلام تھا۔اور کفر و اسلام کے درمیان اس کی حیثیت ایک بفر اسٹیٹ کی ہوتی تھی اس لئے اس آمدورفت کے دوران کئی عرب قبائل کے طائفے اور گروہ یہیں آباد ہو کر رہے۔ان کے طائفوں میں بردی، غزہ، قرہ، باتیل، بولان، کندہ، ابرہ، لیث، یزیدی، بکر، ماہری، شاہری، قارہ، لوط وغیرہ شامل ہیں۔ بُلیدہ عرب مکران کے علاوہ لسبیلہ، مشکے اور خاران میں آباد رہے ہیں۔مکران کا بُلیدہ ،اسی عرب قبیلہ کا قدیم مسکن رہا ہے۔اور ہتورام کا بیان کسی قبیلائی تنظیمی اصول سے متصادم اور ایک مفروضہ ہے۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ بُلیدہ نام سے قبل یہاں قدرے فاصلے پر ایک ہندی قبیلہ ''گوڑ'' آباد تھا۔جس کے نام پر ہندوستان میں ''گوڑ'' گاؤں ہے۔

حواشی :

1۔تاریخ بلوچستان، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 2009ء صفحہ 322۔

2۔سنگلگیں ڈور، کے معنی ہیں "جلی ہوئی ندی" ڈور اصل میں پہاڑی نالہ (Nulla) کو کہتے ہیں جو بڑی ندی کا معاون نالہ ہوتا ہے۔اور اس کے دوسرے نام "سوکال ءقلات" کے معنی سوختہ مقام کا قلعہ کے ہیں۔ یہ تاریخی قدیم دیوہیکل آثار مجموعی طور پر "نمرود قلات" یعنی نمرود کا قلعہ کہلاتا ہے۔اس کے تین حصے ہیں۔ پہلا اور سامنے کا حصہ "نمرود قلات" یعنی قلعہ نمرود (رہائشی حصہ) کہلاتا ہے جس کی طویل فصیل کا ملبہ ایک دو منزلہ بلڈنگ کی اونچائی کے برابر ہے۔اس پر چڑھ کر پھر اس عبرت کدہ کے صحن میں اترنا پڑتا ہے۔ صحن کا رقبہ کم وبیش دو ہزار مربع گز بنتا ہے اور کئی سو مربع گز زمین چاروں طرف فصیل کے ملبے کے نیچے دبی ہوئی ہے۔قلعہ کا مین گیٹ جنوب کی طرف سایجی سلسلہ کوہ کے فلک بوس حصار کے سامنے واقع رہا ہے جس کی چوڑائی تقریباً بارہ فٹ ہوگی جس کے دونوں طرف دونوں کونوں کی بلند و بالا برجیوں کا ملبہ ہے۔ موجودہ وقت میں یہ برجیاں کسی طور کسی تین منزلہ بلڈنگ کی اونچائی سے کم نہیں ہے۔شاید یہ اپنے وقت میں چار منزلہ ہوں گی۔ان کے سامنے شاید محافظین کے رہائشی مکانات ہوں گے۔جنہیں آثار قدیمہ والوں اور خزانے کی متاشیوں نے جگہ جگہ کھودا ہوا ہے۔

قلعہ کا دوسرا حصہ مکمل عام رہائشی قطعہ زمین ہوا ہے۔اس حصے میں سب سے زیادہ کھدائی کا کام ہوا ہے۔ یہاں پر دو سے زیادہ مرتبہ آثار قدیمہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کی

ٹیموں نے کام کیا ہے۔ جہاں پر سنگ مرمر کے بُت، ایک مدفون بھٹی اور ایک مندر کے آثار بھی پائے گئے ہیں۔نمرود قلعہ کا آخری حصہ ایک الگ فصیلی پلاٹ معلوم ہوتا ہے۔جس کی ساری زمین سوختہ اور اس کی مٹی کالی ہے۔جس کا رقبہ تقریباً تین چار سو مربع گز کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ جو عوام الناس میں سنگلگیں ڈور کہلاتا ہے۔ یہ مقام کئی زمانوں سے سیلابی مٹی میں دبی ہوئی رہی ہے جسے بار بار سیلابی ریلے ظاہر کرتے اور دباتے رہے ہیں۔ یہاں کی کالی مٹی کئی فٹ نیچے تک جلی ہوئی ملتی ہے۔

مقامی روایتوں کے مطابق یہی وہ تاریخی مقام ہے جہاں پر کالدیا کے بلوچ شاہنشاہ نمرود بیلوص کے حکم سے قبائلی جرگہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کی قبائلی سزا پر عملدرآمد کرنے کیلئے کئی دنوں تک آگ جلائی تھی۔

ہُرمز کا یہ قریبی علاقہ اللہ کی وحدانیت کا منکر نمرود بلوچ کا آبائی وطن تھا۔جو ملک بلوچ کہلاتا تھا۔جس کا مرکزی مقام یہی نمرود قلات یا سنگلگیں ڈور تھا۔جسے آثار قدیمہ والوں نے بلوچستان کا سب سے قدیم اور سب سے بڑا شہر پناہ قرار دیا ہے (تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے ہماری کتاب "بلوچ اور بلوچستان، چند تاریخی گوشے" اور بلوچستان ماقبل تاریخ "مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ)

3۔تاریخ عالم پر ایک نظر "حصہ اول، از جواہر لال نہرو صفحہ نمبر 202۔

بولان

" بولان" بلوچستان کا مشہور و معروف درّہ ہے جو ایران، افغانستان وسطی ایشیاء وغیرہ کو ہندوستان اور دیگر مشرقی علاقوں سے ملاتا ہے۔ یہ نام دیگر کئی علاقائی ناموں کی طرح قدیم ہے۔ تاریخ نویسوں نے اس تاریخی نام پر بھی کئی مفروضے گھڑے ہیں اور انہیں تاریخ کا حصہ بنایا ہے۔

انگریزی حکومت کے مرتب کردہ بولان گزیٹر میں کہا گیا ہے کہ "بولان" نام ایک تاریخی جنگی شخصیت بولان رند کے نام پر ہے جو رندوں کے عظیم جرنیل اور سردار اعظم میر چاکر خان رند کا ایک سرکردہ شخص تھا جسے انہوں نے کچھی اور پنجاب کی طرف جانے کیلئے قلات سے روانہ ہونے سے قبل راستے کا تعین کرنے کیلئے پہلے بھیجا تھا۔ مواضع کے نام ایسے نہیں پڑتے۔ دنیا کے اکثر قدیم نام قوموں اور قبیلوں کے نام پر ملیں گے۔ جو قوم کسی جگہ پر مستقل رہائش پذیر ہوتا تھا تو وہ مقام، اگر اس سے قبل اس کا کوئی نام نہیں تھا، اسی آباد قوم کے نام پر مشہور ہوتا تھا۔ قدیم ادوار میں موجودہ زمانے کی طرح نام رکھے نہیں جاتے تھے۔ بلکہ از خود اپنے قابض قوم کے نام سے پکارے اور بھچانے جاتے تھے۔ پھر کسی وجہ سے وہ قبیلہ یا قوم جس کے نام پر اس کا مسکن شہرت پاچکا تھا، ہجرت کر کے کسی اور طرف چلا جاتا تو موضع کا نام اُس کی یادگار کے طور پر باقی

رہ جاتا تھا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کئی مقامات پر ایسے قبیلے قابض ہیں یا آباد ہیں جو ان کے نام پر نہیں ہیں۔ یہ نشاندہی کرتا ہے کہ پہلے میرا باسی یا باشندہ میرے ہی نام لئے ہوئے تھا جو کہیں چلا گیا یا نئی آنے والی اکثریت میں مدغم ہو گیا۔

" بولان" نام کے بارے میں کچھ دیگر اہل قلم نے بھی ملتے جلتے نام سے مفروضے گھڑے ہیں۔ جن میں ایک من گھڑت نام "بھلانا" ہے جسے بولان کے قدیم باسی کہا گیا ہے۔ جس سے بگڑ کر "بولان" بن گیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخی نام جلدی نہیں بگڑتے۔ اور نہ اتنا بگڑ جاتے ہیں کہ اُن کی اصلیت ہی بدل جائے۔ مواضع کے نام وہاں معمول سا بگڑ سکتے ہیں جہاں پر ایک مقام کے باشندے کلی طور پر اسے غیر آباد کر کے چلے جائیں یا کسی حادثے یا آفت کا شکار ہو کر بالکل معدوم ہو جائیں اور وہ مقام کافی عرصے تک ویران رہے پھر کوئی قوم آ کر وہاں بس جائے اور وہ نام اُس کے تلفظ میں صحیح طور پر ادا نہ ہو سکے۔ تب شاید اس میں زبر، زیر کا یا ادائیگی کا معمولی سا فرق نمایاں ہو جائے۔ لیکن اتنا کسی بھی صورت میں نہیں بگڑ جاتا کہ بُھلانا سے "بولان" بنے یا بولان سے بھلانا بنے۔ یہ تمام بے بنیاد کہانیاں اور مفروضے ہیں جو عوام نے مشہور کر کے رکھے ہیں یا پھر تاریخ نویسوں کی اپنی ذہنی اختراع ہیں جو عوام میں پھیل گئے ہیں۔

" بولان" ایک تاریخی عرب قبیلہ تھا جو اس پہاڑی خطے میں بس گیا تھا۔ اسلامی دور سے بھی پہلے کئی عرب گروہ تجارتی قافلوں کی صورت میں عرب ممالک سے

بطرف ہندوستان، سندھ اور چین جاتے تھے۔ جن میں کئی گروہیں جو کسی نہ کسی قبیلہ سے منسلک ہوتے تھے اسی درمیانی علاقوں میں رہ بس گئے تھے۔ اس کے بعد اسلامی دوَر میں تو تجارت کے علاوہ کئی تبلیغی اور جہادی گروہ آتے رہے ہیں۔ بلوچستان میں کئی مقامات عرب قبائل کے طائفوں کے ناموں پر موجود ہیں جو ان کے کسی زمانے میں آ کر بس جانے کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ ان قبائلی طائفوں میں غزہ، یزیدی، ابرہ، قحطانی، مرہ، بُلیدہ، ماکولا، بکر، کندہ، بولان وغیرہ شامل ہیں۔

آنحضرت صلعم کے زمانے میں مکّہ کے اطراف میں بھی بولان قبیلہ موجود تھا۔ جو مشہور قبیلہ "طے" کا ایک بڑا طائفہ شمار ہوتا تھا۔ اس ضمن میں یہاں ابن الندیم کی ایک مختصر تحریر کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے جو انہوں نے عربی زبان لکھنے کے بارے میں سپردِ قلم کیا ہے۔

> " حضرت عباسؓ نے کہا ہے کہ سب سے پہلے جن اشخاص نے عربی زبان تحریر کیا وہ تین شخص تھے جو قبیلہ "بولان" سے تھے جو قوم طے کی ایک شاخ ہے وہ انبار کے رہنے والے تھے اور ان کے نام سرمہ بن مرّہ، اسلم بن سدرہ اور عامر بن جدرہ تھے۔1

1۔ سیرت النبی، جلد اوّل، از مولانا شبلی نعمانی و مولانا سلیمان ندوی ص، 26

آثار بتاتے ہیں کہ قبیلہ بولان چند لوگوں پر مشتمل نہیں تھا اور یہ جنگجو قبیلہ تھا۔ جس نے بستے ہی اپنے تحفظ کیلئے قلعہ بنایا اور چھوٹے پیمانے کی چھاؤنی تعمیر کی کیونکہ قدیم آبادی کے کھنڈرات کے قریب "خیبر" نامی جگہ ہے۔ جو "قلعہ اور چھوٹی چھاونی" کے لئے عربی نام ہے۔1

نام "بولان اور "خیبر" کا ایک ہی مقام میں ہونا ثابت کرتا ہے کہ "بولان عرب قبیلہ تھا۔ جو مستقلاً یہاں پر بس گیا تھا اور قلعہ اور چھاؤنی بھی تعمیر کی تھی۔ اور کتابوں میں مذکورہ وجہ تسمیہ سب مفروضے اور من گھڑت ہیں۔

1۔ مولانا شبلی اور مولانا سلیمان ندوی، سیرت النبی جلد اوّل صفحہ 217 پر لکھتے ہیں۔ "خیبر" اصلاً عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "قلعہ" کے ہیں۔

بیزنجو

" بیزنجہ" قبیلہ بلوچستان کے علاقہ جہلاوان کا معروف بلوچ قبیلہ ہے جس کا مرکز ضلع خضدار کا نال ہے۔ اس کے بنیادی طائفے حملانی، نندوانی، عمرانی بتائے جاتے ہیں۔لیکن خود عمرانی سردار گھرانہ اس سے اختلاف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ نصیر آباد کے عمرانی رندوں کا حصہ ہیں اور دونوں کا ایک ہی جدّ امجد عمر نوحانی در زمان سردار رند میر چاکر خان گذرا ہے۔ حملانی قبیلہ کا سردار گھرانہ ہے اور نندوانی جو کولواہ میں رہتے ہیں، حملانی کو اپنا برادر قبیلہ بتاتے ہیں یعنی "دونوں کے جد امجد بھائی تھے۔لیکن جہلاوان گزیٹر کے انگریز مصنفین نے بیزنجہ قبیلے میں نندوانی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور بیزنجہ کے بارے میں لکھا ہے کہ :

" میرواڑی روایت کے مطابق بیزنجوؤں کا مورث اعلٰی "بیزنج" میرواڑی جانباز میر بجّار کا خادم تھا۔ اور مزدوری کے طور پر بیس من جو لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ "بیست من جو" بیزنجو میں بدل گیا۔لیکن بیزنجو خود اپنا شجرہ نسب نوحانی رند بلوچ سے ملاتے ہیں۔جب بلوچ جانباز میر چاکر کچھی کی طرف کوچ کر گیا تو بیزنجو پیچھے رہ گئے۔"(1)

یاد رہے کہ نام "بیزنجہ" یا "بیزنجو" جنکی ترکیب ہے۔ سندھی اور جنکی یا جدگالی میں "جہ" اور "جو" کا، کے، کی کے معنی دیتا ہے۔ "بیزن جہ" یا "بیزن جو" کے معنی "بیزن کا" یا بیزن کے یعنی بیزن کے لوگ یا بیزن کے بچّے یا بیزن کا گھرانہ وغیرہ۔ "جہ" پورے قبیلہ یا گروہ کیلئے استعمال ہوتا ہے اور "جو" قبیلہ کے ایک شخص کیلئے بولا جاتا ہے۔ اصولی طور پہ پورے قبیلہ یا گروہ کیلئے "جو" کا لاحقہ غلط ہے۔ اسکی "جہ" کا لاحقہ اصولی ہے۔ مثلاً قبائل روُنجھا، گُنگہ، بندیجہ، انگاریہ، صابرہ، کھوسہ، چُھٹہ، سمّہ، سومرہ وغیرہ ہیں لیکن ان قبائل کا ایک شخص "و" کے لاحقہ کے ساتھ رونجھو، گنگو، بندیجو، انگاریو، صابرو، کھوسو، چھٹو، سمو، سومرو وغیر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح "بیزنجہ" قبیلہ کا نام ہے نہ کہ بیزنجو، جو قبیلہ کے ایک رُکن کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

گزیٹر میں میرواڑیوں (2) کے حوالے سے بیزنجہ قبیلہ کی جو وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے وہ دراصل براہو جدگال جنگ کے بارے میں مشہور بلوچی منظوم داستان سے اخذ کیا گیا ہے جو درج ذیل ہے :

"بجّاری بخشش پہ حمل (3) ئی نال آت
حمّل و نالی ماں صاحب واقبال ات
نایب اش ملکانی شگر گال ات
بیزمن جہ ماہے آہی ء مال ات (4)

گزیٹیئر اسے میروانیوں کی روایت بتا کر پھر لکھتا ہے کہ بیزنجہ قبیلہ کا جدامجد ''بیزنج'' (5) میر بجار براہو میروانی کا خادم تھا جسے خدمات کے عوض ماہوار بیس من جَو بطور معاوضہ ملتا تھا اسی لئے وہ بیزنجہ کہلایا۔ یہاں گزیٹیئر والوں نے ایک طرف ان کے جدامجد کو بیزنج کا نام دیکر اسی (بیزنج جہ) کو ان کی وجہ تسمیہ بتایا اور دوسری طرف اسی ایک سانس میں ''بیس من جہ'' کی بے سروپا روایت کو قبیلہ کی وجہ تسمیہ لکھا۔ جبکہ دونوں مفروضے اور غیر حقیقی باتیں ہیں۔ اقوام وقبائل کے نام اس بھونڈے طریقے سے نہیں پڑتے بلکہ ان کے پس منظر میں ایک شخص کی شہرت اور اس کا ایک معلوم تاریخی کردار پوشیدہ ہوتا ہے جسے زمانہ گرد آلود کرتا ہے۔ محقق اور مورخ کو اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرنا ہوتی ہے نہ کہ اپنے ذہن سے مفروضے گھڑھے یا بجائے اصل قبیلہ سے پوچھ گچھ کرنے غیر متعلق قبیلے سے معلومات لے جو یقیناً متعلقہ قبیلہ سے روا رکھنے والی ناروائی ہوگی۔ جیسے کے میروانیوں نے بیزنجہ کو اپنا خدمت گار بتایا ہے۔ لیکن جب اسی پارٹی نے خود بیزنجوؤں سے دریافت کیا تو انہوں نے اپنے کو نوحانی رندوں سے بتایا۔ اگر چہ یہ بھی پورا سچ نہیں آدھا سچ مانا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بیزن نامی شخصیت قبیلہ ''بُلفت'' (6) سندھی میں بُرفت، کا ایک نامی گرامی سردار تھا جو کسی وجہ سے اپنے قبیلہ سے دُرپروشی (7) کر کے کولواہ میں آ کر آباد ہوا اور نوحانی قبیلہ میں شامل ہو گیا۔ ان دنوں کولواہ خطے میں نوحانی رندوں کی بالادستی تھی۔ بیزن کا قبیلائی مقام تھا نہ بولاخان (8) تھا۔ کولواہ کے

نوحانیوں میں اُس نے دوسری شادی کی۔ اُس کی نرینہ اولاد میں حمّل، نندہ، عمر نامیوں کو روایت کیا جاتا ہے۔ جن سے حملانی، نندوانی، اور عمرانی بیزنجہ قبیلے تشکیل پائے۔ یہی تینوں بھائی براہو جدگال جنگ میں میر بجار کے براہو طائفے کے اتحادی تھے۔ اور ابھی تک تینوں بیزنجہ کہلاتے ہیں لیکن عمرانی بیزنجہ اپنے کو نسلی بیزنجہ نہیں مانتے بلکہ کہتے ہیں کہ وہ نصیر آباد کے عمرانی رندوں کی شاخ ہیں اور براہو جدگال جنگ میں بیزنجہ لشکر میں شامل ہونے کی وجہ سے بیزنجہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جس طرح کہ دیگر بیزنجہ، نوحانی رندوں کی بالادستی کی بنا پر نوحانی میں شمار ہوتے ہیں حالانکہ نسلاً وہ بُلفت قبیلہ سے ہیں۔

نام ''بیزن جہ'' کی وجہ تسمیہ کولواہ کے بیزنجہ اس طرح بتاتے ہیں کہ بیلہ میں جاموٹ اور بُلفت قبیلوں کے مابین ایک لڑائی چھڑ گئی تھی۔ بلفتوں کے سردار نے میر بیزن بُلفت کو جو اب بیزن نوحانی کہلاتا تھا مدد کیلئے پیغام کیا۔ میر بیزن نے مختلف قبیلوں کے لوگوں پر مشتمل ایک لشکر تشکیل دیا اور بیلہ جا کر جاموٹ کے خلاف لڑا۔ یہ لشکر بیلہ کی جدگالی زبان میں بیزن جہ یعنی بیزن کا (لشکر) کہلایا۔

ایک دوسرا انگریز رائیٹر ٹمپل، اس قبیلہ کو کیانی نسل بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ بیزن معروف سیستانی پہلوان رستم کے زمانے کا وہ جانباز شخص تھا جس کا تذکرہ ابوالقاسم فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں کیا ہے (9) جو مذکورہ ٹمپل کی اپنی ہی ذہنی اختراع ہے۔ قبیلہ بیزنجہ ہو یا کوئی اور بلوچ قبیلہ، ان کی تاریخ اور شجرہائے نسب اتنے بےسُراغ نہیں ہیں جتنا کہ یہ مفروضہ نویس یوروپی خیال کرتے ہیں۔

حواشی :

1۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیر جھلاوان ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 1997، صفحہ 220۔

2۔ بلوچی نظام قومداری میں لاحقہ ''آنی'' مستعمل ہوتا ہے ''ڑی'' جدگالی زبان کے اثر کی وجہ سے ہے۔ جس سے مشرقی بلوچی زیادہ متاثر ہے۔

3۔ حمل حملانی بیزنجوؤں کا جدامجد ہے جو میر بجار براہوی کی سرکردگی میں لڑی جانیوالی براہوجدگال جنگ میں براہو طائفہ کا اتحادی تھا۔ اسی جنگ کے نتیجے میں اُس کا لشکر اس کی نسبت سے حملانی کہلایا۔ اور وہ اس نوتشکیل شدہ قبیلہ کا سردار مقرر ہوا۔

4۔ دیکھئے کتاب ''ایک نظم ایک تاریخ'' میں ''براہوجدگال جنگ ءِ شیئر''۔

5۔ ''بیزنج'' کوئی نام نہیں ہے۔ اصل لفظ ''بیزن'' ہے جو ترکی نام ہے بلوچی میں بیسویں ترکی نام مستعمل ہیں۔ جو یقیناً تورانی ترکوں، رندوں اور رئیس قبائل کی وساطت سے درآمد ہوئے ہیں۔

6۔ بلفت، ایک قدیم بلوچ قبیلہ تھا جس کے کئی طائفے قلات وخضدار ولسبیلہ کے کوہستانوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا مادر قبیلہ نہمر دی ہے جس کا ذکر 1540 میں آئین اکبری اور ''مآثرالامراء'' میں کیا گیا ہے جو ان دنوں کیرتھر کی پہاڑیوں میں ''زہری بلوچ'' قبیلے کی ہمسائگی میں بودوباش رکھتے تھے۔ قبیلہ کا جدامجد ابوالفتح نامی شخص تھا۔ بلوچ لوگ اس نام کو ''بلفت'' تلفظ کرتے تھے اور لسبیلہ والے اسے

''بُرفت'' کہتے تھے۔ رائے ہتورام اور جسٹس خدابخش مری نے بالترتیب ''تاریخ بلوچستان'' اور بلوچستان تاریخ کے آئینے میں'' اس قبیلہ کو نسلی بلوچ قبیلہ بتایا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اپنی کتاب ''جنگ نامہ'' (سندھی) میں اس قبیلہ کو مکران سے آیا ہوا قبیلہ لکھا ہے۔ دراصل ان کا مقصد اس قبیلہ کے مادر قبیلہ ''نہمر دی بلوچ'' سے ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ راجستان کے جام نگر کے جوام کے ریاستی دستاویزات میں یہ قبیلہ مذکور ہے جسے ''بلفت'' راج نوسمہ'' لکھا گیا ہے۔ یعنی یہ قبیلہ سمہ اتحادیہ میں نیا شامل شدہ ہے۔ مذکورہ دستاویزات میں قبیلہ کے جدامجد کا نام ''ہوت ابوالفتح بلوچ'' درج ہے جسے مسلمان سپہ سالار محمد بن ہارون مکرانی کے خانوادے سے کہا گیا ہے۔ ابوالفتح نے اپنے قبیلہ کے سردار کو قتل کر کے وہاں سے بہ ہمراہ تیس نفر قل مکانی کی اور کوہستان قلات میں آیا۔ کچھ عرصہ بعد کوہستان کیرتھر کے نہمر دیوں کے پاس چلا گیا۔ وہیں ایک لونڈی سے شادی کی اور علاقے پر اپنی بالادستی قائم کی۔ لیکن آئے دنوں کی جنگ وجدل سے دلبراشتہ ہو کر جام نگر چلا گیا۔ وہاں کے مقامی حاکم کا نمائندہ مقرر ہوا۔ وہیں ایک سمہ عورت سے دوسری شادی کی اور کچھ عرصہ بعد سمہ حاکموں سے لڑ کر کوٹری سندھ کو چلا آیا۔ اُس کے ہمراہ قبیلہ کی اکثریت بھی کوٹری چلی آئی۔ ایک ندی کے کنارے قبیلہ کے ساتھ پڑاؤ ڈالا جو پھر اُس کے نام پر بلفت مشہور ہو گیا۔ اور آج بھی وہ مقام ''بلفت'' ہی کہلاتا ہے۔ بلفت قبیلہ کے بیسویں طائفے سندھ، اور بلوچستان کے کولواہ، جھلاوان، سراوان اور لسبیلہ کے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جن

میں بیزنجہ، ساسولی کے کئی طائفے، گنگہ، جھوکیہ، بُرہ، مینگل کے کئی طائفے پھُسہ، سیاہ پاد وغیرہ شامل ہیں۔

7۔ ''بڈ پروشی'' کے لفظی معنی ہیں ''ہڈی توڑنا''۔ جو رشتہ ناطہ توڑنے کے معنی دیتا ہے۔ یہ بلوچی قومداری نظام کا ایک اصول ہے۔ جس کے رُو سے اگر کوئی شخص یا گھرانہ یا طائفہ کسی ناراضگی کے سبب اپنے قبیلہ سے ناطہ توڑ کر کسی دوسرے قبیلے کا حصّہ بنتا ہے اور وہ قبیلہ اسے قبائلی مقررہ شرائط پر قبول کرتا ہے تو ایک فنکشن میں جس میں نئے قبیلے کے تمام طائفوں کے سربراہ شامل ہوتے ہیں۔ شامل ہونے والوں سے مقررہ قبائلی شرائط پر پورا عمل کرنے کا قول کراتے ہیں اور پھر اسے کسی طائفے کا حصّہ بناتے ہیں۔ اُس دن سے نئے لوگ اُس قبیلہ کا راج شمار ہوتے ہیں اور پھر ان کے ہر خوشی، غم، جنگ، میڑھ، بجار و پُرس وحشر اور رشتہ داری میں حصّہ لیتے ہیں۔ فنکشن میں بھیڑ بکریاں ذبح کی جاتی ہیں۔ دعوت کھائی جاتی ہے اور بڈ پروشی کی کامیابی کی دعا کی جاتی ہے۔

8۔ تھانہ بولاخان کراچی کے قریب بلفت سردار کا قدیم مسکن ہے جو اس قبیلہ کے ایک نامور سردار بولاخان بلفت کے نام پر ہے۔

9۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر جھلاوان ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 1997ء صفحہ 220۔

پنجگور

پنجگور بھی ایک قدیم تاریخی مقام ہے جو کئی زمانوں تک مملکت مکران کا دارالحکومت رہا ہے۔ ابن حوقل نے ''کتاب المسالک وممالک'' میں لکھا ہے کہ قنج فور (پنجگور) مکران کا سب سے بڑا شہر ہے جو اپنی شکر، خشک کھجوروں اور فانیذ کیلئے بہت مشہور ہے جنھیں دنیا کے مشہور منڈیوں کو برآمد کیا جاتا ہے۔ ''فانیذ'' پرانے وقتوں میں صرف پنجگور ہی میں بنتی تھی اور کھجور سے بنائی جاتی تھی۔ اسے عربی تواریخ میں مختلف چیزوں کے مثل بتایا گیا ہے۔ کسی نے اسے ایک قسم کی شکر یعنی چینی لکھا ہے کسی نے اسے ایک طرح کا گڑ بتایا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک قسم کی کھجور جسے ''کہربا'' کہتے ہیں اسی کا نکالا ہوا شیرہ ہوتا تھا۔ جسے سکھا کر مصری کی ڈلیوں کی شکل دی جاتی تھی اور کئی ممالک کو برآمد کیا جاتا تھا۔ یہ شیرہ کشیدی اب بھی ہوتی ہے لیکن آجکل اس شیرہ کو دیگر اچھی قسم کے خشک کھجوروں میں ڈالا جاتا ہے اور اُس کے مزے اور توانائی کو دُگنا کیا جاتا ہے۔

عرب جغرافیہ دان المقدسی نے پنجگور کے ایک تاریخی قلعہ کے بارے میں بھی لکھا ہے جو کھجوروں کے جھنڈ میں گھرا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف بڑے بڑے گہرے کھڈے کھدوائے گئے تھے (ان میں پانی چھوڑا جاتا تھا تا کہ حملہ آور انھیں عبور

کر کے قلعہ تک رسائی حاصل نہ کر سکیں) قلعہ کے دو دروازے ہوتے تھے جو باب توران اور باب تیز کہلاتے تھے (1) باب تیز، جنوب مغرب کی طرف کھلتا تھا جبکہ باب توران شمال مشرق کی طرف اُس راستے کے رُخ کھلتا تھا جو توران کو جاتا تھا جس کا دار الخلافہ خضدار تھا۔ وہاں تمام لوگ صرف نام کے مسلمان تھے جو بلوصی کہلاتے تھے جن کی زبان ناقابل فہم تھی نی' (2) غرض پنجگور اسی نام سے قدیم زمانوں سے موجود رہا ہے۔ عربوں نے اپنی تصنیفات میں کئی معلومات اختصار کے ساتھ دیئے ہیں لیکن اس نام کی وجہ تسمیہ کسی نے روایت نہیں کی۔ رائے ہتورام نے صدیوں بعد اس نام کی وجہ تسمیہ اپنی تاریخ میں درج کی ہے جو اس طرح ہے :

" وجہ تسمیہ پنجگور کا یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں اس کا نام خرما آباد تھا..... بعض کہتے ہیں کہ یہ زمانہ امیر المومنین امیر عثمانؓ کا تھا بعض کہتے ہیں کہ شاہان ایران کا زمانہ تھا۔ فوج بادشاہی اس علاقہ میں تاخت لائی (3) عند المقابلہ ساکنان پنجگور کی طرف سے بہت لوگ تہہ تیغ ہوئے۔ لیکن منجملہ فوج کے بھی پنج نفر معتبرین مارے گئے۔ جن کی قبریں اس جگہ بنائی گئیں جس کے سبب پنجگور (یعنی پانچ قبر) اس جگہ کا نام پڑ گیا۔ رفتہ رفتہ غلط عام میں پنجگور مشہور ہو گیا۔" (4)

ہتورام کا مذکورہ وجہ تسمیہ بھی کئی گزشتہ مبینہ مفروضوں کی طرح ایک مفروضہ ہے۔ پنجگور نام میں موجود حروف "گو (GOR) نہیں بلکہ گور (GOOR) ہے جو آسانی سے گور بمعنی قبر میں نہیں بدلتا۔ دوسری بات یہ کہ علاقہ اپنے چاروں طرف میں واقع تمام مواضعات کے ساتھ فارسی بولنے والا علاقہ نہیں ہے۔ اور لفظ پنج گور، فارسی لفظ ہے۔ فارسی اس قدیم علاقے میں سینکڑوں برس بعد ورود کر گیا تھا اور وہ بھی صرف حکمرانوں کے دفتری زبان کی حد تک۔ اور کوئی سطحی دفتری زبان کسی قوم اور اس کے مواضعات کو نام نہیں دے سکتی۔

ہتورام کے اس فرضی نام نے مذہبی طبقہ کو بہت اپیل کیا اور انہوں نے دو صورتوں میں اس کا پروپیگنڈا کیا۔ بعض نے مشہور کر دیا کہ یہاں پانچ صحابہ کرام کی قبریں ہیں۔ نتیجتاً کئی تبلیغی جماعتیں ان مفروضہ قبور کو آس پاس کے میدانوں میں بے سود تلاش کرتے رہے۔ بعض نے کہا کہ پانچ قبریں صحابہ کی نہیں بلکہ بزرگ ہستیوں کی ہیں۔ جن میں سے ایک پنجگوریوں کے روحانی مرشد حضرت پیر عمر کی زیارت کو شمار کیا گیا۔ باقی چاروں کی جستجو تا حال جاری ہے۔

پنجگوری روایات کے مطابق اصل نام پنجگڑ ہے جو ترکستان سے آیا ہوا ایک طائفہ تھا۔ جس سے خرم آباد والوں نے لڑائی لڑی لیکن اس طائفے کو نکال باہر نہ کر سکے پھر آپس میں صلح کیا گیا اور ایک علاقہ پنجگڑ قبیلہ کو دیا جہاں وہ آباد ہوئے۔ لیکن اس خاص مقام کی نشاندہی نہیں ہو سکتی۔ نام پنجگڑ سے قبل دو مقامات کی شہرت تھی۔ ایک

مقام خرّم آباد کہلاتا تھا۔ جسے ہتورام نے خُرما آباد لکھا ہے۔ یہ خرّم آباد اُس مقام پر ہوتا تھا جو آجکل کوہ بُن کہلاتا ہے جہاں ایک پرانی تہذیب کے آثار پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسرا مقام ''لالنیاں'' ہوتا تھا۔ جو قبیلہ ''لالئی'' کے نام سے آباد تھا(5) اس لالنیاں پر ایرانیوں نے کئی حملے اور لوٹ ماریں کی ہیں۔ اس شہر کی آخری آبادی کی تباہی کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بڑے قحط کی زد میں آئے اور کھانے کی چیزوں کو ترس رہے تھے کہ ایک ٹڈی دل نے ان پر حملہ کیا اور تھوڑی بہت فصلوں کو چٹ کرنے کے ساتھ ان پر بھی حملہ آور ہو گئے اور یہ ناتوان لوگ اپنے کو اُس لاکھوں کے ظالم لشکر سے زندہ نہ بچا سکے۔ بعض خوف زدوں نے اپنے کو کنوؤں میں گرا دیا اور مر گئے۔ اس طرح لالنیان کی پوری آبادی نیست ہو گئی۔ اب وہ مقام ''ڈمب'' یعنی ویران آباد کہلاتا ہے۔ گمان غالب یہی ہے کہ پنجگُر کا خاص مقام چتکان کا وہ حصہ ہوتا تھا جو اب شاپاتان کہلاتا ہے۔ جہاں پر قدیم پنجگُر کے حکمران گھرانے کا خوبصورت گنبد ہے۔ جو موجودہ وقت میں ''شاہ اوقلندر'' کہلاتا ہے۔

قبیلہ'' پنجگر'' کے آثار پنجاب کے راولپنڈی کے موضع '' پنجگران'' میں نظر آتے ہیں۔ شاید اس قبیلہ کے چند لوگوں نے یہاں سے ہجرت کر کے وہ موضع بسایا تھا یا پھر ''پنجگران'' ہی کے ایک گروہ نے پنجگور میں آبادکاری کی اور اسے اپنی شناخت دے دی۔ تاحال اس بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ہتورام کا کہا ایک بے بنیاد اور مفروضہ بات ہے۔ نیز کسی دور میں کئی

ہندی و کشمیری قبائل بلوچستان میں نقل مکانی کر کے آباد ہو چکے تھے۔ ان میں ''پنجگر'' نام سے ملتے جلتے کئی قبائل ہوتے تھے جن میں رباب گر، کاشگر، سورگر، کمانگر، تیزگر، جاراگر وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سورگر، تیزگر اور جاراگر قبائل کی آبادکاری کے آثار پسنی، ہورماڑہ، زامران، کیچ اور خضدار کے کوہستان میں موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ پنجگر بھی کوئی ہندی یا کشمیری قبیلہ رہا ہو۔

حواشی :

1۔ تیز، ایرانی بلوچستان میں واقع ایک بلوچ بندرگاہ ہے جو مملکت مکران کے سب سے بڑے تجارتی بندرگاہ کی حیثیت سے مشہور تھا۔ جس سے مشرق و مغرب کے کئی ممالک کاروباری وابستگی رکھتے تھے۔ معجم البلدان اس بندرگاہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس بندرگاہ سے ہندوستان، سندھ، زنجبار، مصر، عمان، بحرین وغیرہ بڑے پیمانے پر تجارت کرتے ہیں۔ قلعے کے دو بابوں کے ''توران'' اور ''تیز'' نام رکھنے سے قیاس کیا جاتا ہے کہ اُن دنوں پورے خطے میں سب سے زیادہ شہرت اور اہمیت انہی دو شہروں کی رہی ہے۔

2۔ دی لینڈز آف ایسٹرن خلافت از جی۔ لی۔ اسٹرینج صفحہ 329۔

3۔ یہ مقام اب ایک ویران اور آثار قدیمہ کی حیثیت رکھتا ہے جو تسپ گاؤں کے آخر میں واقع ہے اور ''ڈمب'' کہلاتا ہے۔ تسپ والے بزرگوں کا کہنا ہے کہ پنجگور کا بنیادی مرکزی مقام یہی رہا ہے۔ لیکن وہ ''لالنیان'' کے نام سے مشہور ہے۔ پنجگور کے

نام سے ضلع میں کسی خاص مقام کا نام پنجگور نہیں ہے۔عرب جغرافیہ نویس المقدسی نے جس قلعہ کا تذکرہ کیا ہے وہ قلعہ مبینہ نشان و آثار کے ساتھ موضع گرمکان میں تھا اس کے اطراف کی خندقیں بھی 1980ء تک شکستہ حالت میں نظر آتی تھیں یہی قلعہ تھا جو پھر گچکی سرداروں کے قبضے میں آ گیا اس کے اطراف کی اراضیات بھی انہی کی ملکیت ہیں۔چند سال ہوئے زمینداری کی غرض سے قلعے کے ملبے کو بلڈوز کیا گیا ہے۔

4۔تاریخ بلوچستان، مطبوعہ گوئٹہ ادب کوئٹہ 2009ء صفحہ 318۔

5۔قبیلہ "لالئی" کے افراد موجودہ وقت میں سندھ اور صوبہ سرحد کے ڈیرہ اسماعیل خان سے آگے خوست کے قرب و جوار میں نظر آتے ہیں سندھ میں ان کے چند گھرانے بکھرے ہوئے ہیں اور کوئی ان کی اجتماعی آبادی دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں اس قبیلہ کے ایک بڑے گروہ نے خوست کے نزدیک ایک گاؤں بسایا اور پھر "وزیری" قبیلہ کا حصہ بنا۔زیادہ دیر نہیں گزرا کہ قبیلہ بنوچی نے انہیں اس جگہ سے بیدخل کیا۔اور وہ پھر کوہ سفید کے مغربی دامان "ننگرہار" میں بس گئے۔جہاں پر وہ وزیریوں کے ایک طائفے کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔نسلی لحاظ سے یہ "لالئی" کون تھے کوئی نہیں جانتا نہ کہ کسی تاریخ میں ان کا کوئی خاص تذکرہ ملتا ہے۔

تاریخ قلات پر آخوند محمد صدیق کے مفروضے

قلات کی تاریخ پر آخوند محمد صدیق شیرازی نے جو خوانین قلات کا ایک سازشی اور نمک حرام درباری تھا، نے "اخبار الابرار" کے نام سے فارسی میں ایک کتابچہ لکھا۔جسے تحقیق سے جان چڑانے والے مصنفین نے تاریخی سند کا درجہ دیا اور اسی کو حوالے کے طور پر استعمال کیا اور بے بنیاد واقعات اور من گھڑت قصوں کو دھرا دھرا کر انہیں تاریخی سچ بنانے کی کوشش کی۔حتیٰ کہ جن مورخین نے ان کی نگارشات کو مشکوک اور ناقابل اعتبار لکھا، انہوں نے بھی اپنی کتابوں میں "اخبار الابرار" کے حوالے پیش کئے۔ان میں میر گل خان نصیر، خان احمد یار خان بلوچ، اور ملک محمد سعید بلوچ، شامل ہیں۔

آخوند نے جن تاریخی موضوعات پر مفروضے قائم کئے ان میں چند اہم موضوعات درج ذیل ہیں :

☆ قلات پر میروانی حکومت یا بالادستی،

☆ رند سردار میر چاکر خان کا قلات پر حملہ اور میر مندو کی حکمرانی۔

☆ میر بجار اور اس کا رندوں سے لڑائی۔

☆ حاکم قلات میر مندو خان کا قتل۔

☆ بی بی ماہناز۔

☆ میر بجار کی بادیہ نشینی۔

☆ میر حسن کی حاکمیت۔

☆ اور چند دیگر موضوعات۔

جیسے کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا کہ پوری براہوئی تاریخ، معروف بلوچی رزمیہ داستان ''براہوجدگال جنگ کی منظوم داستان'' میں موجود ہے۔اس داستان کے چند ٹکڑے مرحوم میر گل خان نصیر نے اپنی تصنیفات میں بطور حوالے کے پیش کئے تھے۔ لیکن وہ پوری داستان کی جستجو نہ کر سکے۔ جہلاوان ڈسٹرکٹ گزیٹر نے بھی اس منظوم داستان کا انگریزی ترجمہ چھاپا لیکن اس کا نام غلط لکھا اور اس پر تحقیق کا کام نہیں کیا۔

یہاں ہم اسی تاریخی رزمیہ داستان کی روشنی میں مندرجہ بالا مفروضات کا جائزہ لیں گے جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائیگا۔

الف۔ قلات پر میروانی بالادستی

آخوند نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے :

" قلات سیوا ہندو کا تھا سیوا کے بعد قلات پر مغل
قابض ہو گئے۔ مغلوں کو خراسان میں لڑائی پیش آئی۔ میر
عمر میروانی قلات کا حاکم بن بیٹھا۔(1)

1۔اخبار الابرار کا اُردو ترجمہ بنام ''تاریخ خوانین قلات'' از میر گل خان نصیر صفحہ 23۔

اس سے پہلے کہ ہم میر عمر میروانی کی قلات پر حکومت کی بات کریں یہ ضروری قرار پاتا ہے کہ ''سیوا ہندو قلات'' پر مصنفین کے تنقید کا حوالہ دیں۔قلات پر محققین نے کسی سیوا ہندو کی حکمرانی کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ آخوند نے سیوا کو پندرھویں اور سولہویں صدی عیسوی میں برسر اقتدار ظاہر کیا ہے اگر چہ اس پر تفصیلاً بات نہیں کی ہے۔ چونکہ آخوند کوئی محقق نہیں تھا اس لئے وہ اس پر کوئی علمی بحث بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ملک محمد سعید بلوچ نے تصنیف ''بلوچستان تاریخ کی روشنی میں'' لکھا ہے کہ :

" یہ معلوم نہیں کہ وہ کونسا سیاسی و سماجی پس منظر تھا
کہ جس کی بنا پر ہندو خاندان کو عہد وسطیٰ میں قلات میں
اقتدار کی کُرسی پر بیٹھنے کا موقعہ ملا۔''

آخوند کی اس روایت کی بازگشت یورپی مصنفین اے۔ڈبلیو۔ ہیوگز اور ہنری پوٹنگر کی تحریروں میں بھی دیکھی گئی۔لیکن اسے بحیثیت ہندو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

ہنری پوٹنگر خیال ظاہر کرتا ہے کہ شاید یہ کسی حکمران کا خاندانی لقب ہوتا تھا جو وہ لوگ برسر اقتدار آتے وقت اختیار کرتے تھے۔اے ڈبلیو ہیوگز کے مطابق اس خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ میر کبیر بلوچ کے ہاتھوں ہوا(1)

1۔دی کنٹری آف بلوچستان۔

درحقیقت ہندو مذہب میں سیوا ایک فرقہ رہا ہے اس فرقے والوں نے سیوا کے بُت بنا کر سجدے کئے۔ اور ''سیوا'' نام کے الگ مندر بنوائے۔ یہ فرقہ جب ہندوستان میں پھیل گیا تو قلات میں بھی اس فرقے کی بنیاد پڑی اور سیوا کے پجاریوں نے اپنا مندر الگ بنایا۔ جو کہ قلات بلوچ یا میری کے جنوب مشرقی طرف کے ملبے کے نیچے موجود ہے۔ جس کا علم قلات کے ہر شخص کو ہے۔ اسی مندر کے اوپر کا قلعہ ''قلات سیوا'' یعنی قلعہ سیوا کہلاتا رہا ہے۔ جو صرف مندر کے نام کی نسبت سے ہے نہ کہ کسی سیوا حکمران کی نسبت سے ہے۔

سیوا کے تذکرے کے بعد آخوند قلات پر مغلوں کی حکومت کا تذکرہ کرتا ہے۔ جو کہ سیوائی حکمرانی کے مفروضہ کی مانند دوسرا مفروضہ ہے۔ اس من گھڑت موقف کو سچ ثابت کرنے کیلئے مرحوم میر گل خان نصیر نے لکھا کہ قندہار کے حکمران کی طرف سے ذوالنون بیگ ارغون اور شاہ بیگ ارغون قلات میں گورنر تھے جب 1530ء میں مرزا کامران نے قندہار میں ارغونوں کو شکست دی اور ان کی طاقت پاش پاش ہوگئی تو میر عمر نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھا کر ایک بلوچ فوج جمع کی اور ذولنون بیگ ارغون کو شکست دی اور اسے افغانستان بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح قلات میں میروانی حکومت کی بنیاد پڑی۔(1)

.....

1۔ تاریخ بلوچستان'' از میر گل خان نصیر۔

میر گل خان نصیر کی مذکورہ ذہنی اختراع کے بارے میں معروف محقق جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری نے یوں لکھا :

'' مندرجہ بالا بیانات بے بنیاد اور ناقابل قبول ہیں بلکہ حقیقتاً وہ تاریخی واقعات اور دوسرے مقامات پر اس کتاب کے پیش کردہ مواد کے بالکل خلاف بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ قندھار کے حکمران نے ذوالنون اور شاہ بیگ ارغون کو قلات کے گورنر مقرر کیا تھا۔ اور 1530ء میں ذوالنون بیگ ارغون میر عمر میرواڑی سے ایک لڑائی میں شکست کھا کر قلات سے چلا گیا، اُس دور کے تاریخی واقعات سے ناواقفیت کا مکمل اظہار ہے۔

ذوالنون بیگ ارغون، قندھار کے حکمران کا مقرر کردہ نہیں تھا۔ نہ ہی 1530ء میں اُس نے میر عمر میرواڑی سے شکست کھائی تھی اور نہ ہی شہنشاہ بابر کے لڑکے کامران مرزا نے اسے قندھار سے نکالا تھا۔ اس کے برخلاف ذوالنون بیگ خود قندھار کا گورنر تھا۔ جسے ہرات کے بادشاہ شاہ حسین نے مقرر کیا تھا۔ اس لئے میر گل خان نصیر کے بیان کے برعکس وہ نہ کبھی قلات کا گورنر رہا اور نہ ہی کبھی اس کی لڑائی عمر میرواڑی سے

ہوتی۔علاوہ ازیں ذوالنون بیگ تو1530ء میں زندہ بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ 1507ء میں محمد خان شیبانی ازبک کے خلاف ہرات میں ایک لڑائی میں مارا گیا تھا۔اور پھر یہ بات بھی یاد رہے کہ ذوالنون بیگ کے لڑکے شاہ بیگ کو1522ء میں قندھار کے بادشاہ بابر کے حوالے کرنا پڑا تھا نہ کہ اس کے لڑکے کامران کے۔ بنابریں میر گل خان نصیر کا یہ تمام بیان درست نہیں اور ارغونوں سے اس کی جنگ غیر تاریخی باتیں ہیں۔ ''(1)

میر گل خان نصیر نے مذکورہ کہانی آخوند محمد صدیق کی بیان کردہ مغل حکمرانی مفروضے کے پس منظر میں گھڑلیا ہے۔حالانکہ انہوں نے اپنی تصنیفات میں اُسے غیر معتبر راوی بھی لکھا ہے۔

مندرجہ بالا مطالعہ سے ثابت ہوا کہ آخوند کا قلات پر مغل حکمرانی والا بیان ایک مفروضہ اور من گھڑت کہانی کے سوا کچھ نہیں۔

آخوند محمد صدیق کی مفروضہ کہانی کا تیسرا جز میر عمر میروانی کی قلات میں برسر اقتدار آنے کا مفروضہ ہے۔جسے میر گل خان نصیر اور خان احمد یار خان بلوچ نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔خان بلوچ دراصل میر گل خان نصیر کا خوشہ چین رہا ہے۔

....

1۔بلوچستان،تاریخ کے آئینے میں صفحہ356۔

انہوں نے اکثر بیانات میر گل خان کی تصنیفات سے اخذ کیں اور انہیں اپنے لفظوں میں بیان کیا۔اور میر گل خان نصیر نے آخوند کی من گھڑت بیانات پر مرچ مصالحہ لگا کر انہیں پھیلا کر پیش کیا۔ان کے نزدیک تحقیقی اور تاریخی حوالے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

جسٹس میر خدا بخش مری نے مذکورہ مصنفین کی تمام تر بیانات کو من گھڑت اور بے بنیاد قرار دے کر میر عمر کو میر گل خان نصیر کا ''خیالی شخص'' لکھا ہے۔(1) لیکن یہ غلط ہے۔میر عمر میروانی، میروانی قبیلے کی ایک اہم شخصیت اور جنگجو سردار میران خان عرف میرو خان براہو کے بیٹے تھے جو اپنے باپ کے شاہی مینگلوں کے خون کے عوضانے میں سوراب میں مارا جانے کے بعد سردار منتخب ہوا(2)۔میروانی قبیلہ کا مرکزی مقام سوراب کا موضع نغاڑ ہے اور صدیوں سے ہے۔میروانی قبیلہ کا قلات سے کبھی بھی کوئی تعلق نہیں رہا ہے اور نہ کہ کبھی کوئی میروانی قلات میں برسر اقتدار آیا ہے۔ان کا آبائی تاریخی قلعہ بھی نغاڑ ہی میں تھا۔جسے 1980 کے بعد گرا کر آباد اراضیات کے ساتھ ملا دیا گیا۔اس کے علاوہ میروانیوں نے کبھی بھی قلات پر دعویٰ نہیں کیا ہے۔

....

1۔بلوچستان،تاریخ کے آئینے میں صفحہ356۔

2۔تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے کتابیں ''براہو جدگال جنگ و شیئر'' ایک نظم ایک تاریخ اور بلوچ اور بلوچستان۔چند تاریخی گوشے۔

معروف بلوچی رزمیہ داستان "براہو جدگال جنگ کی نظم" میں کہا گیا ہے کہ۔

"میر و خان کا بیٹا میر عمر اپنی بیوی ماہناز کے ساتھ نغاڑ کے ٹھنڈے شہر میں اپنے تاریخی قلعہ میں آسودگی اور خوشحالی کے دن گزار رہے تھے کہ ان کے ہاں ملک بجار خان پیدا ہوا۔ جسے ناز و نعم میں پالا گیا اور اسے قرآنی تعلیم دی گئی اور اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور کیا گیا۔ ان دنوں عمر کی بہادری اور سخاوت کی شہرت تھی۔ وہ میر و شکار اور گھڑ دوڑ کے مشاغل کے علاوہ قبیلہ کی سرداری اور سپہ گری کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہا تھا۔ وہ عادل قریشی نسل اور حمزہ اور عباس کی نسب سے تھا۔ (1) ان کے اجداد میں سے میر حسن خان، میر گہرام اور براہیم نامی گرامی شخصیتیں رہی ہیں۔ وہ کمبرزئی قبیلہ کے اپنے اور ہم نسل ہیں۔ (2) وہ اطمینان سے اور ہر خطرے سے بے نیاز زندگی کے دن گذار رہے تھے کہ ایک دن اچانک اُسے حب، بیلہ، سارونہ، کرخ وچکو، کچھی، مُولا اور ہتاچی کے ایک مشترکہ جدگال (3) لشکر کے سوراب پر حملہ آور ہونے کی اطلاع دی گئی جس کی کمان میر چُھٹا (4) اور شکر جام زئی کر رہے تھے۔ میر عمر نے ہنگامی طور پر اپنے لوگوں کے ساتھ مقابلہ

کیا لیکن اچانک حملے کی تاب نہ لا کر اپنے بھائی قلندر (5) کے ساتھ مقتول ہوا۔ جدگالوں نے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مرد مقتول ہوئے اور عورتیں بھاگ کھڑی ہوئیں۔ مہناز بھی اپنے بیٹے ملک بجار کو لیکر بھاگ گئی۔

براہو جدگال جنگ کی رزمیہ داستان نے پوری طرح وضاحت کی ہے کہ میر عمر سوراب کا میروانی سردار تھا اور دور دراز سے آتے ہوئے جدگال لشکر نے ان کے قلعے پر دھاوا بول دیا۔ میر عمر قلعہ میں موجود اپنے آدمیوں کے ساتھ مقابلہ پر نکل پڑا لیکن اپنے بھائی قلندر کے ساتھ مارا گیا۔ وہ کوئی حاکم قلات نہیں تھا اور نہ قلات کا باشندہ تھا۔ اس طرح آخوند کا مندرجہ بالا بیان ایک مفروضہ اور جھوٹا قصہ ثابت ہوا۔

1۔ یہ اسی امیر حمزہ قریشی کی نسل سے ہونے کی روایت ہے جو رند قبائل کی روایتوں اور قدیم بلوچی شاعری میں بیان ہوئی ہے۔

2۔ کمبرزئی خوانین قلات کے اجداد کا ایک طائفہ رہا ہے۔

3۔ جدگال کیلئے گذشتہ "صفحات میں" بزرکوی "مضمون ملاحظہ کریں۔

4۔ روایت کے مطابق میر چُھٹہ، ذریجی کے قبیلہ "چُھٹہ" کا جدّ امجد تھا۔ لیکن بعض چُھٹے کہتے ہیں کہ یہ میر محمد چُھٹہ تھا۔ قبیلہ کا جدّ امجد اس کا دادا تھا۔ اس کا نام چھٹہ تھا۔ ان کا مرکزی قبیلہ "مجلفت" جدگال تھا۔

5۔ قلندرانی قبیلہ کا جدامجد۔ قلندر براہو میروانی تھا۔

ب۔ رند سردار میر چاکر خان کا قلات پر حملہ

آخوند محمد صدیق کا دوسرا مفروضہ سردار میر چاکر خان رند اور اُس کے والد میر شہیک کا قلات پر حملہ کا بیان ہے جس میں اُس نے میروانیوں کی حکومت بتائی ہے اور میر عمر میروانی کو حاکم قلات لکھا ہے :

" چاکر سردار رند اور گوہرام لاشاری نے مکران سے قلات کا رُخ کیا۔ تب میروانیوں اور چاکر بلوچ کے والد شہیک کے درمیان لڑائی ہوئی۔ بلوچوں کا لشکر غالب آ گیا۔ میر عمر لڑائی میں مارا گیا۔ قلات کو میروانیوں سے لے لیا گیا۔

یہ بلوچ قبائل (رند و لاشار) دو سال تک قلات میں رہے۔ زاں بعد سردیوں کے موسم میں اپنا مال مویشی چرانے کیلئے کچھی اور سیوی چلے گئے۔ مگر گرمیوں کے موسم میں واپس قلات چلے آئے۔ اب شہیک، چاکر رند اور گہرام لاشاری (1) نے کچھی پر قبضہ کرنے کیلئے آپس میں مشورہ کیا۔ چنانچہ چاکر رند اور اس کے والد درہ بولان سے ہو کر ڈھاڈر آئے۔ گوہرام لاشاری سردار درہ مُولا سے گنجابہ (گنداوہ) پہنچے۔ وہ مندو بلوچ کو جو رندوں میں پُھو کہلاتے ہیں، قلات کا حاکم مقرر کر کے گئے۔" (2)

مندرجہ بالا من گھڑت کہانی پر "اخبار الابرار" کے مترجم میر گل خان نصیر نے کتاب کے صفحہ 23 کے حاشیہ میں مذکورہ لڑائی کی تردید کرتے ہوئے لکھا :

" یہ بیان صحیح نہیں۔ یہ لڑائی نغاڑ سوراب کے مقام پر جدگالوں اور میروانیوں کے درمیان ہوئی۔"

پھر کتاب کے صفحہ 24 کے حاشیے میں مزید لکھتے ہیں :

سردار میرو (3) کا بیٹا میر عمر جہلاوان کے جدگالوں کے خلاف لڑائی میں مارا گیا۔ اُن دنوں وہ نغاڑ علاقہ سوراب میں رہتا تھا۔ آخوند محمد صدیق کی رائے کہ میر عمر قلات میں تھے اور رند و لاشار کے خلاف لڑائی میں مارے گئے صحیح نہیں ہے۔ بلوچی اشعار اور دیگر دستاویزات میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

1۔ مکران کے کولواہ سے قلات تک لاشاری قبیلہ کے آنے کا ایک بھی نشان بطور ثبوت نہیں ملتا۔

2۔ "اخبار الابرار" کا اردو ترجمہ بنام "تاریخ خوانین قلات" از میر گل خان نصیر صفحہ 24-23 میر عمر کے بارے میں گذشتہ صفحات میں "قلات پر میروانی بالادستی" کی ذیل میں بحث گذر چکی ہے۔

3۔ یہ وہی سردار میرو ہے جسے میر موصوف اپنی تاریخ میں ایرانی بادشاہ نوشیروان کے زمانے میں اپنے مفروضہ "بُزکوہی" طائفے کا سردار لکھ چکے ہیں۔

جبکہ جدگالوں کے ہاتھوں اُس کے مارے جانے کے
ثبوت میں بلوچی اشعار کی سند موجود ہے۔(1)۔ یہ واقعہ
غالباً سولہویں صدی کے آخری نصف (1570ء) میں
ہوا ہوگا۔(2)"

میر گل خان نصیر کی تضاد بیانی قاری پڑھ چکا ہے۔ اس سے قبل انہوں نے میر عمر اور ارغون بیگ کی لڑائی کا مفروضہ گڑھا تھا جس پر گزشتہ صفحات میں "قلات پر میروانی بالادستی" کی ذیل میں بحث کی گئی تھی۔

براہو جدگال جنگ کی رزمیہ داستان نے واضح طور پر بتایا ہے کہ میر عمر سوراب کا باشندہ تھا اور اس کے قلعہ نغاڑ پر جدگال لشکر نے حملہ کیا۔ میر عمر کے براہو خاندان کے لوگوں نے بھرپور مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور میر عمر اپنے بھائی قلندر کے ساتھ سوراب میں مارا گیا۔ اس طرح یہ تو ثابت ہوا کہ میر عمر قلات کا حاکم نہیں تھا بلکہ سوراب کا میروانی سردار تھا اور وہیں جدگالوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

اب آخوند کے بیان کے دوسرے حصے کا مطالعہ کرتے ہیں جس میں اس نے لکھا کہ قلات پر رندوں نے میروانیوں پر حملہ کیا۔ اور مفروضہ حاکم قلات میر عمر مارا گیا۔

1۔ جس سند کی وہ بات کر رہے ہیں وہ بھی زیر مطالعہ رزمیہ نظم ہے۔

2۔ میر موصوف کا خیال غلط ہے۔ یہ لڑائی 1640ء اور 1645ء کے درمیان لڑی گئی۔

یہاں ہمیں قلات میں رند قبائل کی سردار چاکر خان کی کمان میں آمد کا زمانہ دیکھنا ہے کہ آخوند نے جس مندو رند کی قلات کی حاکمیت پر تعیناتی کی بات کی ہے اس کے سن و سال کون سے تھے۔

سردار خان گشکوری نے اپنی کتاب "ہسٹری آف بلوچ ریس اینڈ بلوچستان" میں لکھا ہے کہ سردار چاکر خان نے جام نندہ سے سنی 1486ء میں لیا۔ اپنی دوسری کتاب "چاکر اعظم" میں لکھتے ہیں کہ بیہگر رند اور امیر ذوالنون کی بیٹی گرانا ز کے معاشقے کے نتیجے میں رندوں اور قندہاری لشکر کے درمیان جب بولان میں لڑائی چھڑنے والی تھی تو اُس وقت سردار چاکر خان بھرپور جوانی میں تھے یہ سال 1495ء کا تھا۔ رندوں اور لاشاریوں کے مابین لڑی جانیوالی لڑائیوں کے دوران ایک لڑائی میں حاکم ہرات سلطان شاہ حسین نے لاشاریوں کے خلاف سردار چاکر خان کی مدد کو لشکر بھیجا۔ مشترکہ لشکر نے لاشاریوں کا قتل عام کیا۔ یہ سال 80-1470ء کے درمیانی سال تھے۔ کتاب "بلوچستان رپورتاژ(1) میں کہا گیا ہے کہ سردا چاکر خان رند، لاشاریوں کی شکست سے دوچار کر کے 1512ء کے شروع میں سبی سے ملتان کی طرف چلا گیا۔

میر خدا بخش بجارانی نے اپنی تصنیف "قدیم بلوچی شاعری" میں کہا ہے کہ سردار چاکر خان رند، رند لاشار لڑائی کے اختتام پر 1545ء کے قریب ہندوستان چلا گیا۔

1۔ یہ کتاب زیادہ تر بلوچستان گزیٹیرز کی نقل ہے۔

''تاریخ بلوچستان'' میں رائے بہادر ہتورام نے لکھا ہے کہ میر چاکر رند 1540ء میں اپنے رند لشکر کے ہمراہ ہمایوں بادشاہ کی مدد کو موجود تھا اور ہمایوں نے شیر شاہ سے 1556ء میں دہلی لے لیا۔ میر خدا بخش مری اپنی دوسری کتاب ''بلوچستان تاریخ کے آئینے میں'' تاریخی شیر شاہی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ شیر شاہ سوری نے اپنے جنرل ہیبت خان نیازی کو 1540ء میں میر چاکر خان رند سے گفت وشنید کرنے کا حکم دیا۔ سردار خان گشکوری کے مطابق سردار چاکر خان کا انتقال 1550ء سے 1555ء کے درمیان ہوا۔

اب آتے ہیں میر عمر میروانی کے زمانے کی طرف زیر مطالعہ رزمیہ داستان بتاتی ہے کہ میر عمر جدگالوں کے ہاتھوں مقتول ہوا اور اُسکی بیوی ماہناز اپنے کمسن بیٹے بجار کو لیکر بھاگ گئی اور پھر اپنے خواجہ رشتہ داروں کے پاس پشین چلی گئی۔ وہاں وہ اٹھارہ سال تک رہی اور بجار کو باپ اور قبیلہ کا انتقام لینے کیلئے تیار کیا۔

نظم میں یہ بھی مذکور ہے کہ میر عمر نے اپنے بیٹے کو قرآن کی تعلیم دلادی اور عالموں نے قرآنی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے مطالب ومعنی بھی سکھا دیئے تھے۔ اس طرح بجار کم ازکم نو یا دس سال کی عمر کا ہوگا۔ پشین میں اٹھارہ سال گزارنے کے بعد وہ ماں کی اجازت سے بطرف سوراب آیا اور جدگالوں سے انتقام لینے کیلئے تیاری کی اور قرب وجوار کے قبائل کے پاس مسلح لشکروں کی امداد لینے جاتے رہے اس طرح جنگ کیلئے تیار ہونے تک کم ازکم وہ تیس سال کا تو ہو چکا ہوگا۔ متعدد قبائل نے اُسے لشکر مہیا

کئے جن میں ان کے ہم نسل سابق خوانین قلات کے خاندان سے میر احمد ایلمانی زئی، میر محراب ایلمانی زئی وغیرہ بھی مع لشکر کے بجار کے اتحادی بنے۔ تب میر بجار کی سربراہی میں اُس کے اتحادی لشکروں نے جدگال آبادیوں پر پے در پے حملے کئے اور انہیں جہلاوان سے بیلہ کی طرف دھکیل دیا۔ بجار براہو کے اتحادی لشکر کو فتح ہوئی۔ اس فتح کے نتیجے میں مقبوضہ قلات اور کچھ دیگر مقبوضات اُس کے حصے کے طور پر دیئے گئے (1) جہاں پر میر احمد ایلمانی زئی خوانین قلات کے دوسرے دور کے پہلے خان کے طور پر 1666ء میں برسر اقتدار آئے۔ میر گل خان نصیر کے مطابق ان کا انتقال 1695ء میں ہوا۔

اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ براہو جدگال جنگ 1665ئ کے آخری مہینوں میں اختتام پذیر ہوئی۔ اگر بھرپور لڑائی کے دوران میر بجار براہو ولد میر عمر براہو کی عمر کو تیس سال کا مانیں تو میر عمر کے قتل کے سن کو 1640ء اور 1645ء کے درمیان مانا جائے گا۔ جو سردار چاکر خان رند اور شہیک رند کے زمانہ سے تقریباً ایک سو پندرہ سے ایک سو چالیس سال تک بعد کا زمانہ ہے جو آخوند کی مفروضہ سردار چاکر رند اور میروانی کے درمیان لڑائی کو جھوٹا ثابت کرنے کیلئے کافی ہے۔

1۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیوا قلات کے حدود کے علاوہ باقی قلات کے علاقوں میں اس درمیانی مدت میں جدگال ہی بالادست تھے۔ کیونکہ جدگالوں کی شکست کے ساتھ قلات کے مزید وسیع حدود کی بالادستی ایلمانی زئی حکمران خاندان کے حصے میں آئی اور یقیناً ایلمانی زئیوں نے اسی مقصد کیلئے براہو میروانیوں کا ساتھ دیا تھا۔

پ۔ میر مندو رند کی حکمرانی

میر مندو رند حقیقتاً قلات کا حکمران تھا۔لیکن یہ حکمرانی میروانی اور رند کی من گھڑت لڑائی کے نتیجے میں رندوں کو نہیں ملی ہے جیسے کہ آخوند نے لکھا ہے بلکہ سردار میر چاکر خان رند کی سربراہی میں نچارا اور قرب وجوار کے جدگالوں سے لڑائی کے نتیجے میں رند برسر اقتدار آئے۔

رند قبائل کے نچارا قلات کے آس پاس آبادکاری کے خلاف جدگال اور جاٹ طائفوں نے مزاحمت کی۔ جدگالوں کا ان دنوں قلعہ نیچارہ پر قبضہ تھا جن کا سرکردہ یا حاکم حُمیر نامی جدگال تھا۔جس نے رند قبائل کے خلاف لشکر کشی کی۔اور وقتاً فوقتاً ان میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ چونکہ اُس وقت سارے رند طائفوں کے لشکر پوری طرح علاقے میں پہنچے نہیں تھے اور کافی قافلے پیچھے آرہے تھے اس لئے ایک بھرپور لڑائی ابھی تک لڑی نہیں گئی تھی۔ چند دنوں بعد جب قافلوں کے مسلح لشکر پہنچنے شروع ہوئے اور علاقہ کے قرب وجوار میں رندوں کی بستیاں قائم ہوئیں تو سردار چاکر خان نے اپنے ایک جرنیل موسیٰ رند کو چند نفر کے ساتھ حمیر کے پاس بھیجا اور کہلا بھیجا کہ گذشتہ دنوں کے دوران کی جھڑپوں میں رندوں اور جدگالوں کے جتنے آدمی مارے گئے ہیں اور زخمی ہوئے ہیں اور جتنا مالی نقصان دونوں طرف ہوا ہے۔ان کے فیصلے کیلئے اپنے نمائندے مقرر کریں تاکہ وہ ہمارے نمائندوں کے ساتھ ملکر ان کا تصفیہ کریں۔

فیصلہ یوں ہوگا کہ اگر جدگالوں کا زیادہ نقصان ہوا ہے تو چونکہ جارحیت انہوں نے کی ہے اس لئے اُسے نقصانوں کا آدھا دیا جائیگا۔اور اگر رندوں کا نقصان زیادہ ہوا ہے تو اُن کے مقتولوں کے برابر رند اپنے مقتولوں کے خون کا دعویٰ نہیں کرے گا۔ لیکن بقایا جتنا مالی اور جانی نقصان سامنے آئیگا ان کا معاوضہ جدگالوں کو دینا پڑیگا۔اور رند اس وقت تک جہاں جہاں بس گئے ہیں وہ رند ملکیت شمار ہوگا۔اس مقبوضہ علاقے میں اگر کسی غیر جدگال کی کوئی ملکیت ہوگی تو اُس پر رند کوئی دعویٰ نہیں کریگا۔حمیر جدگال نے جواباً کہا تھا کہ وہ آپس مشورہ کرکے دو تین دنوں میں جواب دیں گے۔لیکن ان دو تین دنوں میں انہوں نے رند بستیوں پر حملے کئے اور چند رندوں کے ریوڑ بھی لوٹ کر لے گئے۔اس اشتعال انگیزی پر دونوں قبیلوں میں لڑائی شروع ہوگئی سردار چاکر خان نے اپنے ایک جرنیل موسیٰ رند کی سربراہی میں ایک لشکر ایک طرف سے جدگالوں پر حملے کیلئے بھیجا اور دوسرا لشکر بنگل خان رند کی سرکردگی میں دوسری طرف نچارا قلعہ پر حملے کیلئے روانہ کیا۔دونوں قبائل کے درمیان چار دنوں تک لڑائی ہوتی رہی۔نچارا قلعہ اور اُس کی آبادی رندوں کے گھیرے میں تھی۔ اس لڑائی میں جدگال سردار کانبو خان مارا گیا۔جس پر جلد رندوں کا قبضہ ہوگیا۔اور قلعہ جدگالوں سے خالی کرایا گیا۔اور حمیر کی جگہ میر مندو کے ہاتھ میں قلعہ دیدیا گیا۔اور دوسرے مرحلے پر قلات سیوا بھی رندوں کے ہاتھ میں آگیا۔ جہلاوان گزیٹر نے لکھا ہے کہ قلعہ نیچارہ پر رندوں کے حملے میں

الکوزئی قبیلہ نے بھی رندوں کی مدد کی تھی جس پر نیچارہ کی وادی کا ایک حصہ الکوزئیوں کو دیا گیا۔ یہ الکوزئی نچاری کہلاتے ہیں۔

ریکسانیوں کا کہنا ہے کہ وہ بھی رند اتحادیہ کے دست و بازو تھے اور انہیں میر مندو رند نے اس لشکر کشی میں ساتھ دینے اور رشتوں (1) کے ناطے چھپر اور منگچر میں زمینیں دی تھیں۔ اور میر چاکر خان رند نے ان کے ایک جدّ میر ہیبت خان کو سراوان کا ہیرک وار بنایا تھا۔ لیکن جب بعد میں میر مندو نے یہ عہدہ شاہوانی رندوں کو سونپا تو انہوں نے چھپّر اور منگچر کی اراضیات واپس کر دی تھیں۔

....

1۔ یہ اشارہ شاید اس بیان کا مظہر ہے جسے لانگ ورتھ ڈیمز نے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔ ڈیمز نے لکھا ہے کہ ریکسانی قبیلہ کا جدّ "رئیس" رند سردار میر چاکر خان رند کا بھانجا تھا۔ اس نے رئیس کا شجرہ بھی درج کیا ہے جو یوں ہے :

" رئیس ولد حسن ولد شہیک ولد پیروز ولد کلو ولد پیروز ولد گیلو ولد احمد ولد نصر الدین ولد زرمان ولد رند ولد جلال خان (دی ایتھنوگرافی اینڈ ہسٹاریکل سکیچ آف بلوچ ریس)

ت۔ بی بی ماہناز

آخوند محمد صدیق، میر بجار اور بی بی ماہناز کے بارے میں مفروضے قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" میر عمر میروانی کے قتل کے وقت اُس کا بیٹا کمسن تھا۔ اُس کا نام بجار تھا اُس کی والدہ اُسے ساتھ لیکر مستنگ چلی گئی۔ وہاں پر بجار کی والدہ نے خواجہ خیل قبیلہ کے کسی فرد سے شادی کی۔ (1)

اس بے بنیاد کہانی کو اکثر مصنفین نے اور خاص کر مرحوم گل خان نصیر اور ملک سعید دہوار نے خوب پبلسٹی دی اور اسے بار بار دہرا کر تاریخی سچ بنانے کی کوشش کی جسے زیر مطالعہ رزمیہ داستان نے مسترد کیا ہے۔ خود میروانیوں کی کہی ہوئی اس رزمیہ داستان میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ بی بی ماہناز اپنے بچے ملک بجار کو لے کر پشین چلی گئی کیوں کہ وہ پشین کے خواجہ قبیلہ سے تھی اور اس کے عزیز و رشتہ دار وہیں کے تھے۔ داستان مہناز کو خواجہ سیدوں سے بتاتی ہے (2) رزمیہ داستان اُس کے پشین میں رہائش کے عرصے کو اٹھارہ سال بتاتی ہے۔ جب تک کہ اُس کا بیٹا بجار جوان ہو جاتا ہے۔ داستان اُسے خواجہ سیدوں سے بتاتی ہے خواجہ خیلوں سے نہیں جو مستونگ کے دہوار قبیلہ سے ہیں۔ اس داستان میں کہیں بھی خواجہ خیل قبیلہ کا تذکرہ نہیں ہے اور نہ کہ مہناز کے مستونگ جا کر رہنے کی بات ہے۔ آخوند اور اُس کے مفروضوں

پر تکیہ کرنے والوں کی یہ بات کہ ماہنا زنے خواجہ خیلوں میں سے کسی سے شادی کی، ایک بے بنیاد کہانی اور سفید جھوٹ ثابت ہوتی ہے۔ رزمیہ داستان میں اس بات کا معمولی سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ اُس کی کوئی اولاد ماسوائے بجار کے آج تک ظاہر نہیں ہوئی جو دوسرے شوہر کی نسبت سے خواجہ خیل کہلاتی ہو اور نہ کہ آج تک براہو میروانیوں کی خواجہ خیلوں سے کسی قسم کی رشتہ داری کی بات منظر عام پر آئی ہے۔ اس طرح "براہو جدگال جنگ کی رزمیہ داستان" آخوند کی مفروضات کو مسترد کرتا ہوا حقیقی تاریخ کو آشکار کر رہی ہے۔

.....

1۔ "اخبار الابرار" (فارسی) کا اُردو ترجمہ بنام "تاریخ خوانین قلات" از میر گل خان نصیر صفحہ۔25-24۔

2۔ ملاحظہ کیجئے "برز کوہی" کا اشاریہ نمبر4۔

ج۔ میر بجار کی رندوں سے لڑائی کی تیاری

آخوند محمد صدیق اپنی من گھڑت "میروانی رند لڑائی" کی کہانی میں میر بجار کا اپنے باپ میر عمر اور براہو خاندان کے مقتولوں کا بدلہ لینے کیلئے (سوراب کی جانب آنے کی بجائے) قلات کی جانب جانے کی تیاری کے ضمن میں لکھتے ہیں :

> " میر بجار جب بڑا ہوا، انتقام کا جذبہ اُس کے سر چڑھا۔ خواجہ خیلوں سے اُس نے جانے کی اجازت طلب کی۔ خواجہ خیل چونکہ کمزور لوگ تھے، اُسے امداد دینے اور اُس کی حمایت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اُسے جانکی اجازت دے دی۔ ایک گھوڑا، اسلحہ اور کچھ نقدی بھی انہوں نے اُسے دیدی۔(1)"

پچھلے صفحات میں "براہو جدگال جنگ کی رزمیہ داستان" کے حوالے سے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ میر بجار کا خواجہ خیل قبیلہ سے تعلق یا رشتہ داری آخوند اور غالباً خواجہ خیلوں کے کسی راوی کا مشترکہ جھوٹ ہے۔ یہ بیان بھی اُسی سلسلے کی بے بنیاد کڑی ہے۔ براہو جدگال جنگ کی مذکورہ داستان کے اشعار (مصرعے) نمبر68 سے 90 تک مذکورہ کہانی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :

> " ایک دن بجار نے بڑی افسردگی سے اپنی ماں سے کہا۔ عمر ولد میرو کو دشمنوں نے قتل کر ڈالا۔ ڈن سے

سوراب تک کے (2) علاقہ پر قابض ہو گئے۔ جگہ جگہ
جدگالوں نے تباہی مچادی ہے اور میرے منہ پر کالک مل
دی ہے۔ میرے بھائی بند اور خاندان کے لوگ اور عزیز و
اقارب ہر جگہ ماتم کناں ہیں۔ احمد و محراب، سیوا کے ملک
(3) میں ہیں۔ پہاڑوں کا باسی سُماعیل (4) کوہ نشین
ہو گیا ہے۔ مینگل (5) نوشکی کے سیاہ آب اور پتھریلے
میدانوں کو چلے گئے ۔ گرگین (6) ہالہ (7) اور
ٹوہو (8) میر عمر کا انتقام لینے کیلئے بے چین ہوں گے۔
ان کا اور عزیزوں کا دل صد چاک درد و غم کے گھونٹ پی
رہے ہوں گے۔ ان حالات میں میں مزید یہاں چین سے
نہیں بیٹھ سکتا۔ اس زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔ یا تو
میں اپنے باپ کے دشمنوں کی تلاش میں نکل کر ان سے
لڑوں گا یا پھر ان کے بیچ میں باپ ہی کے راستے میں
چلا جاؤں گا۔ میں انہیں کسی صورت میں اپنی زمین پر
دندناتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں اپنے باپ کے
خون کے عوضانے میں شہر نغاڑ کو دشمنوں کے خون سے
رنگ دوں گا اور جوئے نغاڑ کو ان کی لاشوں سے بھر دوں
گا۔ (یہ جذبات) سُن کر ماہناز نے کہا۔ ملک بجار!! جو

ہر دار تلوار کمر سے باندھ لو اور سوراب کے اطراف میں چلے
جاؤ۔"

میروانی قبیلہ کے بلوچی شاعر نے دشمنوں سے انتقام لینے کی میر بجار کے جذبات کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نقشے میں آخوند محمد صدیق کے مفروضے کے برعکس واضح کہا گیا ہے کہ میر بجار نے اپنی ماں کو اپنے جذبات اور ارادے سے آگاہ کیا۔ نہ کسی خواجہ خیل کا ذکر کیا۔ نہ مستونگ کی بات کی اور نہ کسی رند دشمن کا تذکرہ کیا اور نہ کہ قلات کا نام لیا۔ نہ بیچ میں میر مندو کی بات کی۔ بلکہ آخوند کے کہنے کے برعکس کہا کہ جدگالوں نے میرے باپ کو قتل کیا اور ہمارے علاقے (ڈن سے سوراب تک) پر قبضہ جمایا۔ میرا تمام خاندان اور عزیز و اقارب منتشر ہو چکے ہیں اور علاقے میں ایک سُوگ کی کیفیت ہے۔ وہ واضح طور پر کہتا ہے کہ میں سوراب جا کر اپنے شہر نغاڑ کو جدگالوں کے خون اور ان کی لاشوں سے بھر دوں گا۔

براہوجدگال جنگ کی رزمیہ داستان نے قدم قدم پر آخوند محمد صدیق کی تاریخ قلات (فارسی نام "اخبار الابرار") کے ہر سطر کو جھٹلا کر اُسے ایک دروغ گو راوی اور مصنف ثابت کیا ہے۔ یہ سب کچھ اُس کے خوشہ چینوں اور اُس کے حوالہ دینے والوں کیلئے تاریخ کی سچائی کا عبرت آموز طمانچہ ہے۔

حواشی :

1۔ اخبار الابرار (فارسی) کا اُردو ترجمہ از میر گل خان نصیر بنام "تاریخ خوانین قلات صفحہ 25۔

2۔ڈن سے سوراب تک کا جنوبی میدان جو مشرق و مغرب تک پھیلا ہوا ہے، میروانی کے سردار خیل گھر ''براہو'' کا ٹلک کہلاتا تھا۔ جو میر عمر کے قتل کے بعد جدگال قبائل کے تصرف میں تھا۔

3۔سیوا کا ملک، قلات کو کہا جاتا تھا۔ سیوا کے بارے میں ملاحظہ کیجئے پچھلے صفحات میں عنوان ''قلات پر میروانی بالادستی''۔ احمد، خوانین قلات کے قبیلہ ''احمدزئی'' کا جد امجد ہے جو ''براہو جدگال جنگ'' میں میر بجار براہو کا جنگی اتحادی تھا۔ محراب، احمد کا بیٹا تھا۔ وہ بھی جنگ میں شریک تھا۔ ان کا سابقہ قبیلہ ''لیلتا زئی'' تھا۔ واضح ہو کہ میروانی اور خوانین قلات دونوں کا مادر قبیلہ پنجگور کا ''رئیس'' قبیلہ ہے۔ اسی قبیلہ کے ایک جزی شخص جو حاکم پنجگور اور حاکم سرحد (موجودہ وقت میں ایرانی بلوچستان میں ہے)، ساکن کمبر قلات موضع کچک پنجگور، میر کمبر رئیس نے سولہویں صدی کے وسط میں قلات اور زہری پر قبضہ کر کے قلات میں ''خوانین بلوچ'' کی بنیاد رکھ دی۔ جس کا ذکر 1590ء میں ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں کیا ہے۔

4۔سماعیل، قبیلہ کا ذگر رئیس تھا جو اس لڑائی کی ابتداء میں میر عمر کے باپ میرو براہو کا جنگی اتحادی تھا جو میر عمر کی قتل کے بعد ملک بجار کی سرکردگی میں بننے والی اتحادیہ سے الگ رہا۔ سمالانی قبیلہ کا جد بنا۔

5۔مراد ذگر مینگلوں سے ہے جو وڈھ کے شاہی زئی مینگلوں سے الگ اور نسلاً جدا ہیں۔ ذگر بھی پنجگور کے وادی کچک کا قدیم نسلی بلوچ قبیلہ ہے۔ جو وہاں رئیس قبیلہ کا راج طائفہ ہوتا تھا۔ وہاں ان کی قدیم آبادکاری کے آثار ''ذگرانی کھور'' کے نام سے

موجود ہے۔ جس کے معنی ذگروں کی ندی''۔ اسی ندی کے آس پاس ان کے گاؤں ہوتے تھے۔ جہاں سے یہ ہجرت کر کے دشت گوران قلات میں مینگلوں کے پہلو میں آباد ہوئے اور ان کی خوشی و غم شریک بنے۔ اور مینگل نام ان پر بھی چسپاں ہوا۔ ذگر، تاریخی طور پر خوانین بلوچ سے منسلک ہیں۔ اور میروانی قبیلہ سے بھی ان کے قدیم رشتے چلے آ رہے تھے۔

جی۔ پی۔ ٹیٹ نے اپنی کتاب ''سیستان'' میں ذگروں کے ایک جھوٹے حوالے سے کہا ہے کہ وہ اپنے کو ''زغد'' سے ہجرت کر کے آنیوالے بتاتے ہیں۔ جو کہ ٹیٹ کی سو فیصد غلط بیانی ہے۔ ایک صدی قبل کا ذگر شخص اپنی جگہ آج کے کسی عالم اور تعلیم یافتہ ذگر کو بھی ''زغد'' نامی جگہ کا پتہ نہیں ہے۔ نامور مصنف مورخ میر گل خان نصیر نے ذگر قبیلہ کو، جوان کا اپنا قبیلہ ہے آخوند محمد صدیق کی تقلید میں ایک فرضی شخص زکریا سے منسوب کیا ہے اور زکریا کو براہو جدگال جنگ میں شامل بتایا ہے۔ جو کہ غلط ہے۔ براہو جدگال جنگ کی داستان میں کسی ذکریا کا نام نہیں آتا۔ ذگر قبیلہ نہایت قدیم قبیلہ ہے اور رند اور رئیس نسلوں سے قدیم تر ہے۔ لیکن کچک میں قبیلہ رئیس سے منسلک ہوتا تھا۔ یہ ایک قدیم نسلی بلوچ قبیلہ ہے۔

6۔گرگین، میر عمر براہو کا بھائی اور گرگناڑی قبیلہ کا جد ہے۔

7۔ہالہ اور ٹوہو دونوں بھائی تھے اور میر عمر براہو کے مقتول بھائی قلندر براہو کے بیٹے تھے۔ ہالہ کے نام سے قبیلہ ''ہالہ زئی'' تشکیل پا گیا۔

د۔ میر بجار کا منگچر پہنچنا اور میر مندو کے بارے میں معلومات لینا

آخوند اپنی مفروضہ کہانیوں کا سلسلہ بڑھاتے ہوئے آگے لکھتے ہیں کہ :

" میر بجار انتقام لینے کے ارادے سے جب منگچر
پہنچا تو وہاں پر کچھ زمیندار اپنے کھیتوں میں پانی دے
رہے تھے۔ میر بجار نے اُن سے مندو حاکم قلات کا حال
پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ زمینداروں نے بتلایا کہ مندو
قلات پر حکومت کر رہا ہے۔ میر عمر مارا گیا ہے اور
دوسرے تمام میروانی دربدر اور خوار و خراب ہو گئے ہیں۔
میر عمر کا بیٹا بجار مستنگ میں خواجہ خیلوں کے پاس پڑا
ہوا ہے اُن سے روٹی کے ٹکڑے لیکر کھاتا ہے۔ تب میر عمر
کے بیٹے بجار نے کہا کہ بجار میں ہوں اور اپنے باپ
کے خون کا انتقام لینے کیلئے آیا ہوں۔ زمینداروں نے
بجار سے کہا کہ اس تمام علاقے میں بلوچ (1) پھیلے
ہوئے ہیں۔ اپنا نام ظاہر نہ کرو کہ مارے جاؤ گے۔ اُس
نے زمینداروں سے کہا کہ تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو۔
انہوں نے بجار سے کہا کہ سیاہی اور اُس کے بیٹے

1۔ یہاں بلوچ سے مراد رند و لاشاری قبائل ہیں (مترجم میر گل خان نصیر)

قلات کے قریب چھپر کے علاقے میں رہتے ہیں۔ سیاہی
رئیس کا بیٹا ہے اس لئے اُن کو رئیسانی کہتے ہیں تم اس کے
پاس جا کر اپنے کام کیلئے اُس سے مشورہ کرو۔ "(1)

مندرجہ پیرے میں بیان کئے گئے مفروضوں کا جواب زیر مطالعہ رزمیہ داستان میں واضح طور پر دیا گیا ہے۔ جنہیں پچھلے صفحات میں پیش کیا گیا۔ میر بجار کو اپنے دشمنوں کا بخوبی علم ہے جن سے انتقام لینے کیلئے اُس نے اپنی ماں سے اجازت طلب کرلی اور ماں نے اُسے مسلح کر کے سوراب کی طرف جانے کی اجازت دی۔ تو یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ وہ منگچر میں آ کر زمینداروں سے اپنے جدگال دشمنوں کا نہ پوچھے بلکہ ان کی بجائے میر مندو حاکم قلات کا پوچھ لے جو رند ہے اور رند اتحادیہ کا بٹھایا ہوا حکمران ہے اور جو میر بجار کے زمانے سے تقریباً ایک سو تیس سے ایک سو چالیس سال قبل کی شخصیت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آخوند میر بجار کو رندوں کا دشمن بتاتے ہوئے اُسے منگچر میں زمینداروں سے میر مندو رند کے بارے میں تفتیش کرواتا ہے جو رند قبائل کا سب سے بڑا گڑھ اور رند چھاونی تھا۔ جہاں نہ کوئی میروانی رہتا تھا اور نہ بجار کو پہچاننے والے لوگ تھے۔ اور جہاں رند ہی رند تھے۔ یہ سب کچھ دروغ نویسی کے ثبوت ہیں۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ یعنی نہ اُس کے نشان پا ملتے ہیں اور نہ وہ جم کر ٹھہر سکتا ہے۔

1۔ اخبار الابرار کا اُردو ترجمہ از گل خان نصیر بنام "تاریخ خوانین بلوچ" صفحہ 26-25۔

اس کے بعد آخوند صاحب منگچر کے زمینداروں سے میر بجار کو مشورہ دلاتے ہیں کہ قلات میں چھپر کے علاقے کے سیاہی کے پاس مدد کیلئے جاؤ جو رئیس کا بیٹا ہے جنہیں اسی نسبت سے رئیسانی کہتے ہیں۔ یعنی ایک واحد شخص سیاہی کو رئیس کا بیٹا ہونے کی نسبت سے رئیسانی کہتے ہیں۔ اب آئیے دیکھیں کہ آخوند کا تجویز کردہ رئیس کون تھا۔ انگریز محقق لانگ ورتھ ڈیمز نے کتاب "دی ایتھنوگرامی اینڈ ہسٹاریکل ریسرچ آف بلوچ ریس" میں رئیس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ رند شخصیت تھا اور رندوں کے سردار میر چاکر اعظم کا بھانجا تھا۔ ڈیمز نے رئیسانی قبیلہ کے سردار گھرانے سے اس کا شجرہ نسب بھی لے کر چھاپ دیا ہے جو درج ذیل ہے :

" رئیس ولد حسن ولد شہیک ولد پیروز ولد کلو ولد پیروز ولد گیلو ولد احمد ولد نصرہ دین ولد رزمان ولد رند ولد جلال خان۔"

ایک انگریز رائیٹر کو آخوند سے ایک سو چھتیس سال بعد معلوم ہوسکتا ہے کہ رئیس اور اس کے بیٹے رند قبیلہ سے ہیں تو کیا میر بجار کو مذکورہ رئیس کے قبیلہ رند سے ہونے کا علم نہیں تھا۔ اور اگر اسے علم تھا اور ظاہر ہے کہ تھا تو پھر کیسے وہ رند حاکم میر مندو کے خلاف اسی کے قبیلہ کے ایک سردار خیل سے مدد لینے چلا جاتا ہے۔ یہ اور ایسے تمام دلائل ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ آخوند کی تحریریں تاریخ قلات کے بارے میں تحریری دروغ گوئی کے مظاہر ہیں اور ان کے بیان کردہ واقعات اور بیانات مفروضے ، گمراہ کن، پروپیگنڈے اور ناقابل توجہ اور لائق مذمت ہیں۔ جن کا مقصد تاریخ کو مسخ کرنے اور جری بلوچ قبائل میں تاریخ کے حوالہ سے نفرت پیدا کرنا رہا ہے۔

ذ۔ میر بجار کا قلات میں سیاہی کے پاس آنا اور مندو کا قتل

زیر جائزہ آخوندی دروغ گوئی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے :

" منگوچر سے میر بجار سیاہی خاندان کے پاس گیا جب وہاں پہنچا تو ظاہر کیا کہ میں ہی میر عمر میروانی کا بیٹا ہوں اور میرا نام بجار ہے۔ تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ میری مدد کرو اور قلات پر قبضہ کرکے اُسے میرے سپرد کردو۔ سیاہی نے بجار کے جواب میں کہا کہ قلات کے حاکم کے خلاف سیالداری کی لڑائی میں نہیں لڑسکتا لیکن آپ کو بھی اپنے گھر سے نہیں نکال سکتا اور نہ ہی لشکر جمع کرکے قلات پر حملہ کرنے اور آپ کے ساتھ آسکتا ہوں البتہ اگر کبھی قلات کا حاکم لشکر لیکر آپ کو گرفتار کرنے اور مار ڈالنے کو آئے تب میں اپنا سر کٹوادوں گا لیکن آپ کو گرفتار اور مار ڈالنے نہیں دوں گا۔ بعدازاں میر بجار، سیاہی اور اس کے بیٹوں نے آپس میں ساز باز کی۔ ایک لشکر ساتھ لے کر منگوچر سے مندو کے اونٹوں کے گلے کو ہانک لائے۔ (1)

مندوانیوں کے لشکر نے راستے میں انکو آلیا اور لڑائی
واقع ہوئی۔ مندو کے لشکر کے چند نفر مارے گئے باقی لشکر
شکست کھا کر پسپا ہوا۔"(2)

مندرجہ بالا پیراگراف کی ابتدائی باتوں کا جائزہ پچھلے صفحات میں لیا گیا۔ جس میں ثابت ہوا کہ میر بجار کو اسکی ماں نے جدگالوں سے انتقام لینے سوراب بھیجا۔ اور بجار کو اپنے دشمن کا پورا پورا علم تھا۔ اس لئے اُسے رندوں کے گڑھ منگوچر میں آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی اس لئے اس کا منگوچر آنا اور مشورہ کرنا وغیرہ سب بنی بنائی کہانی ثابت ہوئی۔ بہرحال آخوند صاحب نے اب انہیں سیاہی کے پاس پہنچادیا جس کا رند ہونا ثابت ہوا۔ پھر بھی جب بجار نے سیاہی کو اپنا مدعا پیش کیا اور سیاہی نے صاف انکار کردیا کہ وہ اس کیلئے حاکم قلات سے نہیں لڑسکتا۔ لیکن اس کی حفاظت کرے گا۔ یہ سب کچھ آخوند صاحب اپنی زبانی کہنے کے بعد نئی کہانی گھڑتے ہیں۔ یعنی سیاہی کے اُسے کورا جواب دینے کے باوجود وہ کہتا ہے کہ پھر سیاہی اور اس کے بیٹے اور میر بجار نے ساز باز کرکے منگوچر جاکر میر مندو کے اونٹ چُرالائے۔ حیرت ہے اس سے پہلے اس نے میر مندو کو حاکم قلات بتایا اور اس سے میر بجار کو لڑانا چاہتا تھا اور قلات کی حاکمیت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر اچانک سب منصوبے بدل کر اونٹوں کی ڈکیتی پر آ گیا۔ اور وہ بھی منگچر میں۔ جبکہ اس نے اپنی تحریروں میں میر مندو کا تعلق منگوچر سے ظاہر ہی نہیں کیا ہے۔ جس سیاہی اور اس کے بیٹے کو پہلے اس نے ایک طاقتور قبائلی شخصیت دکھایا اب اُسے ایک ڈاکو کے روپ میں پیش کیا اور جس میر بجار کو قلات کی

حکمرانی کا دعویدار دکھاتا رہا اُسے اب ایک اونٹ چور دکھا رہا ہے۔ پھر وہ ڈکیتی کے اونٹوں پر مندوانیوں سے لڑائی دکھاتا ہے اور کتیوں کو مرواتا اور پھر انہیں پسپا دکھاتا ہے لیکن یہ نہیں بتاتا یہ "مندوانی" کون تھے اور منگوچر کے مندوانی لوگوں کا قلات کے حکمران سے کیا تعلق اور رشتہ تھا۔ ایسے فضول بیانات کے سلسلے میں آگے لکھتے ہیں :

" سیاہی کے بیٹوں کی طرف سے چار گھوڑے
مارے گئے۔ سیاہی نے اپنے گھوڑوں کیلئے بہت افسوس
کیا۔ یہاں تک کہ اپنے بیٹوں سے کہا کہ کاش تم میں سے
بھی ایک میرے گھوڑوں کے ساتھ مارا جاتا۔ بجار نے
سیاہی سے کہا کہ اگر حق تعالیٰ نے مجھے قلات دلادیا تو
انشاءاللہ تمہارے گھوڑوں کا عوض تم کو دیا جائیگا۔ "(3)

یہاں مفروضوں کا مورخ سیاہی کو ایک سنگدل اور لالچی باپ کے روپ میں پیش کرتا ہے جسے اپنی اولاد سے زیادہ ایک گھوڑا عزیز ہے۔ جو کہتا ہے کہ گھوڑوں کے بدلے بیٹے کیوں نہیں مرے۔ انسانی نفسیات کو اس شکل میں پیش کرنا ایک اُجڈ گنوار شخص کا کام شاید ہو کسی مورخ کا کام نہیں ہوسکتا۔ براہوجد گال جنگ کی رزمیہ داستان ایسی تمام کہانیوں کو مسترد کرتی ہوئی قلات اور کسی سیاہی اور رئیس سے بحث نہیں کرتی۔ اور ایسی بے سروپا لغویات سے یکسر خالی ہے لیکن آخوند صاحب کی لغویات کا سلسلہ جاری ہے :

" پھر ایسا ہوا کہ براہوئی قبائل (4) جو پہاڑوں
میں منتشر ہو چکے تھے۔ میر بجار اور رئیس سیاہی کے پاس
جمع ہوئے۔ اور بلوچ قبائل مندو کے پاس جمع ہو چکے
تھے۔ میر بجار اور سیاہی نے دھوم دھام سے لڑائی کیلئے
قلات کا رُخ کیا۔ ان کے درمیان شہر سے باہر لڑائی
ہوئی۔ مندو مارا گیا اور بلوچوں کے لشکر کو شکست ہوئی۔
مندو کی قبر قلات کے قلعہ کے اُس دروازے کے سامنے
موجود ہے جو مستونگی دروازہ کہلاتا ہے۔"(5)

جیسا کہ صفحات گذشتہ سے ثابت ہوا کہ میروانی اور رندوں کے مابین کوئی لڑائی ہوئی ہی نہیں تو پھر رندوں کا مندو کے ہاں جمع ہونا اور میروانیوں کا جسے آخوند اب براہوئی قبائل (3) کہتے ہیں کا بجار اور سیاہی کے پاس جمع ہونا کیا معنی رکھتا ہے اس بحث میں ہم یہ بتانا بھول گئے ہیں کہ میر بجار اور میر مندو ہمعصر ہی نہیں۔ میر مندو رند، سردار چاکر خان کا نمائندہ حاکم تھا جو اُسی کے زمانے کا تھا۔ جبکہ میر بجار، میر عمر کا بیٹا تھا۔ دونوں کے زمانوں میں تقریباً ایک سو تیس سے ایک سو چالیس سال کا فرق ہے۔ سیاہی بھی میر چاکر خان رند کے دوَر کی شخصیت ہے۔ اُس کا باپ رئیس، سردار چاکر خان کا بھانجا تھا۔ اس طرح میر بجار، اپنے فرضی مددگار رئیس اور سیاہی سے ایک صدی سے زیادہ بعد کی شخصیت ہے۔ تو مذکورہ کہانی کی سچائی کہاں گئی۔

اب آئیں دیکھیں کہ براہوجدگال جنگ کی رزمیہ داستان میر بجار کی اپنے دشمنوں سے انتقام گیری کی کہانی میں کیا بتاتی ہے۔

داستان کے مصرعے نمبر 89 سے مصرعہ 200 تک کا خلاصہ یوں ہے :

" ماہناز (بجار کی ماں) نے کہا۔ ملک بجار تلوار
کمر سے باندھ لو اور سوراب کے قرب وجوار میں چلے جاؤ۔
کسی پہاڑ کے دامن میں چھپ کر بیٹھو اور شام کے وقت
اپنے باپ کے ایک وفادار غلام گوشو کو تلاش کرو۔ اُس کی
نشانیاں ذہن میں رکھو۔ اُس کے کان اور بال پہاڑی
بکروں کی طرح لمبے اور گھنے ہیں، قد میں اپنے جیسے لوگوں
سے زیادہ لمبا ہے اُس کے ہاتھوں کی چھ چھ انگلیاں ہیں۔
ان سے ملکر اپنا منصوبہ ان پر واضح کرو لیکن انتہائی
راز داری سے۔ اور اُس کے مشوروں پر عمل کرو۔ اور
چوری چھپے اور خاموشی سے اپنے بھائی بندوں اور عزیزوں
کو تیار کرو۔

بجار اللہ کے حکم سے چل پڑا۔ وہ فقیروں اور جوگیوں
کے روپ میں گاؤں گاؤں سفر کرتا رہا۔ سوراب پہنچ کر
ایک دیوار کی آڑ میں بیٹھ گیا اور صبح سویرے آنے جانے

والوں کو دیکھتا رہا جو اپنے اپنے کھیتوں کی طرف جا رہے
تھے۔ تھوڑی دیر میں اُسے ماں کی دی ہوئی نشانیوں کے
مطابق گوشو نظر آیا جو بیلوں کی جوڑی لئے ہل چلانے جا رہا
تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے اُس کے قریب گیا اور اس کا بغور
جائزہ لینے لگا۔ اس اثنا میں گوشو نے میر عمر سے ملتے جلتے
چہرے سے میر بجار کو پہچان لیا اور اُس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔
وہ بار بار اُسے چوم رہا تھا اور اُس پر دل و جان سے نثار
ہو رہا تھا۔ وہ دو جگری دوستوں کی مانند سب کچھ چھوڑ
چھاڑ کر پہاڑوں کی سمت چلے۔ وہاں گوشو نے ملک بجار
کو ایک جگہ بٹھایا اور اپنے بھائی گزین کو اُس کے ساتھ
کیا اور خود خورد و نوش لینے گاؤں کی طرف چلا۔ گاؤں میں
اُس نے سب سے پہلے گرگین (میر بجار کا چچا) کو بجار
کے آنے کی خوشخبری سنائی۔ جس نے اُسے گیو دغان کا
جوئے آب اس خوشخبری کے صلے میں بخش دیا۔ گرگین
نے یہ حال ہالہ، ٹوہو، ڈڑک اور دیگر عزیزوں تک
پہنچائی۔ پھر سب کو چند ہی دنوں میں انتقام گیری کے
کیلئے تیار کیا۔ عزیز و اقربا تمام پہلے ہی جدگالوں سے

انتقام لینے کیلئے جلے بھنے بیٹھے تھے۔ (جب ساری
تیاریاں ہوئیں) تو حملے کے لئے شادی کی جنج کا روپ
دھار کر جدگالوں کے قلعہ کی طرف چل پڑے۔ کئی جنگجو قلعہ
کے آس پاس کی بندات کے پیچھے چھپ کر بیٹھے تھے۔
گوشو نے (صبح سویرے) شکر (جدگال سردار) (6)
کو آواز دے کر قلعہ سے باہر بلایا اور اپنی کاشت کردہ
اراضیات کا فوری حساب مانگا۔ اتنے میں اُس کے دیگر
لوگ بھی نکل آئے۔ انہیں دیکھ کر بجار خان نے چلا کر
کہا۔ آؤ دوستو! آج میری شادی کا دن ہے۔ میں کب
سے آج ہی کے دن کا منتظر تھا، ان نیک گھڑیوں کا تا کہ
میں جٹ اور جدگالوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ
دوں۔ اُس نے حملہ آور ہونے کیلئے پکارا تو چاروں طرف
سے مسلح بہادر نکل پڑے میرو کے سپوت ہر سمت سے نکل
پڑے۔ ایک طرف سے ٹوہو بھوکے شیر کی طرح حملہ آور
ہوا۔ دوسری سمت سے ہالہ گرج گرج کر تلوار
چلا رہا تھا۔ گوشو اور اُس کے بھائی اپنے لڑکوں اور
حامیوں کے ساتھ الگ حملہ آور ہوئے۔ حاجی سوپک،

گواران، صلاحی، میران، حالد اور گرگین جنگجو اپنے اپنے
لشکروں کے ساتھ جدگالوں کو تہہ تیغ کر رہے تھے۔ بے
انتہا قتل و غارتگری دیکھ کر گوشو اپنے کان پکڑ کر بیٹھ گیا۔
(اور بجار کو کہا) بس کرو ملک بجارا اتنی کشت وخون نہ
کرو۔ تم نے عمر کے خون کا بدلہ دس گناہ زیادہ لیا ہے۔ اور
جدگالوں کو جڑ سے کاٹ دیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم زندہ
سلامت بچ گئے ہو۔" (7)

مندرجہ بالا رزمیہ تاریخی کہانی میں نہ قلات کا تذکرہ ہے، نہ رندوں کا نہ سیاہی کا اور نہ مندو کا اور نہ رندوں سے بجار کی لڑائی کا۔ لڑائی جدگال سردار شکر اور اس کے قبیلہ سے بمقام سوراب ہو رہی ہے جس میں جدگالوں کا قتل عام ہوا اور وہ سوراب اور قرب وجوار سے بیلہ کی طرف پسپا ہونے لگے۔

اب پھر ہم آخوند کے مفروضہ قصے کے آخری بات پر جہاں وہ رندوں کی شکست اور حاکم قلات میر مندو کو مقتول دکھاتے ہوئے اس کی قبر کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ آخوند کا خوشہ چین ملک محمد سعید دہوار اپنی کتاب "تاریخ بلوچستان" مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 2007 کے صفحہ 438 پر آخوند کے حوالہ سے اسی قبر کی نشاندہی کرتا ہے جبکہ اسی کتاب کے صفحہ 419 پر وہ اس قبر کو میر عمر میروانی کا بتاتے ہیں۔

" سردار رند چاکر بلوچ اور گہرام لاشاری مکران سے

قلات کی طرف آئے میروانیوں اور میر چاکر کے باپ
شیہک (شیخ حق) (8) کے درمیان لڑائی ہوئی۔
بلوچوں کا لشکر غالب آیا۔ میر عمر میروانی مارا گیا۔ میر عمر کی
قبر ابھی تک قلات میں مستونگی دروازے کے نزدیک
موجود ہے۔"

ملک سعید نے مذکورہ حوالہ بھی آخوند کی کتاب ہی کا دیا ہے جبکہ آخوند نے اپنی کتاب میں میر عمر کے قبر کی نشاندہی نہیں کی اور اس قبر کو میر مندو کا بتایا ہے۔ اس طرح ملک سعید دہوار کا مذکورہ حوالہ جھوٹا ثابت ہوا۔ جس طرح کہ آخوند کی کہانی کا ہر سطر جھوٹا اور من گھڑت ثابت ہو رہا ہے اس طرح میر مندو کے بارے میں بھی اسکی باتیں فرضی ہیں۔ یہ تو ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں۔ رند اور میروانی ہمعصر نہیں تھے اور نہ مندو رند، چاکر رند، اور میر عمر، میر بجار ہمعصر رہے ہیں۔ ساری کہانی دورغ گوئی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم میر مندو پر بات کریں گے تاکہ تاریخ کا ریکارڈ درست رہے۔

جب میر چاکر رند نے بلوچستان سے آگے جانے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے قلات میں میر مندو کو اپنا نائب مقرر کیا۔ کچھی اور سبی وغیرہ میں بھی اپنے نمائندے بٹھائے۔ خاندان ڈومبکی کے پاس محفوظ قلمی نسخہ "دپتر تمن ڈومبکی" میں تحریر ہے:

" بخیال گرفتن مُلکِ پنجاب و ہندوستان کو چیدہ
روان گشت..... (بیچ میں لکھے الفاظ بہت مدہم

ہونے کی بنا پر نہیں پڑھے جاسکتے) وقت کو چیدن از کچھی
، یکے نائب خود در سیوی، دوئم در شوران، سوئم نائب مسمی
مندو در قلات مقرر نمود رفتہ بود۔"

یعنی

"(سردار چاکر خان نے) ملک پنجاب
و ہندوستان قبضہ کرنے کے ارادے سے کوچ کیا۔ کچھی
سے روانہ ہوتے وقت انہوں نے اپنے تین نائب مقرر
کئے۔ ایک نائب سیوی میں، دوسرا شوران میں اور تیسرا
نائب مسمی مندو کو قلات میں مقرر کر کے گئے۔"(9)

سردار چاکر خان کے مقابلے میں میر مندو ایک ناکام حکمران ثابت ہو رہا تھا اور علاقہ قلات کے حالات روز بروز ڈاکوؤں اور باغیوں کی وجہ سے خراب ہو رہے تھے۔ اُن دنوں قلات کا قلعہ سیوا، مندو کی زیر کنٹرول علاقے سے الگ ایک محدود علاقہ تھا۔ جو سب سے زیادہ غیر محفوظ تھا۔ اس کے نامعلوم حاکم نے حالات سے تنگ آ کر پنجگور کے رئیس حکمران "میر کمبر رئیس" کو مدد کیلئے پکارا۔ جس نے لشکر کشی کر کے قلات سیوا اور قلعہ زہری پر قبضہ کرلیا۔ اور قلات نیچارہ پر قابض میر مندو کو مذاکرات کے ذریعہ حکمرانی سے دست بردار کرایا۔ اسی دوران سردار چاکر خان رند نے میر کمبر کے قبضے کی حمایت اور میر مندو کو پنجاب پہنچنے کا پیغام بھیجا تھا۔ اسی لئے میر مندو رند نے میر

کمبر رئیس کے قبضے کی مزاحمت نہیں کی اور میر کمبر کی حاکمیت کو قبول کر کے ایک چھوٹے سے مسلح دستے کے ساتھ پنجاب کی طرف چلا گیا۔

میر مندو رند کی قلات کی حکمرانی چھوڑنے اور پنجاب پہنچنے کے تاریخی ثبوت کئی تواریخی کتب میں دستیاب ہیں۔ جن سے آخوند صدیق اور اس کے خوشہ چینوں کی فرضی اور من گھڑت تحریروں کی قلعی کھل جاتی ہے۔ دو اہم تاریخی کتابوں "تاریخ شیر شاہی" اور "مقامات داؤدی" میں میر مندو رند کے بارے میں تذکرے موجود ہیں۔ "مقامات داؤدی" حضرت مخدوم شاہ داؤد بندگی قاری علیہ الرحمتہ کی تصنیف ہے جو 1056ھ میں مکمل ہوئی ہے جناب نور احمد خان فریدی، مصنف بلوچ قوم اور اس کی تاریخ میں رقم طراز ہیں کہ یہ کتاب سردار چاکر خان رند کی رحلت کے صرف 84 سال بعد لکھی گئی ہے۔

جناب نور احمد فریدی، پنجاب کی بلوچ ریاست کے مرکز "ست گڑھ" کے حالات پر بحث کرتے ہوئے "تاریخ شیر شاہی" اور "مقامات داؤدی" کے حوالوں سے میر مندو کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" پاک پتن، میر مندو کی تحویل میں تھا۔ اس نے
بھی بلوچوں کو سردار (یعنی میر چاکر رند) کے حکم کی تعمیل
میں روجھان روانہ کر دیا تھا۔ صرف اقربا اور بال بچے باقی
رہ گئے تھے جنہیں روانہ کرنے کی سوچ رہے تھے کہ دفعتاً

فتح خان (کمبوہ) پہنچ گیا۔ اور پناہ کا طالب ہوا۔ اگرچہ
مندوخان کے پاس تین چار سو سے زیادہ سپاہی نہیں تھے
تاہم اس نے ایک در پر آئے ہوئے پناہ گیر کو مایوس
کرنا بلوچی حمیت کے خلاف جانا، اور قلعے کا دروازہ
کھلوا کر اسے اندر بلالیا۔ (اچانک) ہیبت خان نیازی
کی فوجیں پہنچ گئیں اور انہوں نے شہر کا محاصرہ کیا اور
طرفین کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ عین اس وقت جبکہ
بلوچ اپنی طاقت کے کم ہونے کے باوجود مردانہ وار لڑ
رہے تھے فتح خان کمبوہ نے اپنے محسنوں کو جنہوں نے محض
اس کی خاطر جنگ مول لی تھی، دشمن سے تنہا نبرد
آزما ہونے کیلئے چھوڑ دیا، اور اس نے حضرت شیخ
الاسلام فریدالدین گنج شکر علیہ الرحمۃ کے سجادہ نشین شیخ
ابراہیم کے ذریعہ ہیبت خان سے صلح کی بات کی اور انجام
کار اپنے کو شیخ کی وساطت سے ہیبت خان کے حوالے
کیا۔"

اس کے بعد واقعات کا تذکرہ "تاریخ افاغنہ" کے مصنف نعمت اللہ خان نے تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

" محاصرہ کے دوران رات کے وقت بلوچستان کا امیر جس کا نام مندوخان بلوچ تھا، اپنے قلعہ کی حفاظت کیلئے انتہائی پامردی سے لڑتا رہا لیکن جب اُسے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو اس نے وہی کیا جو غیور اور جیسور لوگ ایسے اوقات میں کر گذرتے ہیں۔ یعنی بلوچوں نے بے عزتی کے خوف سے خود اپنی عورتوں کو اور بچوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور مندوخان مع اپنے تین سو رفیقوں کے قلعہ سے باہر گیا۔ اور محاصرہ پر شدت سے ٹوٹ پڑا۔ اس نے نہایت شجاعت سے جنگ کی اور بزور شمشیر اپنا راستہ بنا کر فرار ہو گیا۔ جب صبح ہو گئی تو افغانوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ معزز خواتین تو اپنے غیور وارثوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر چکی تھیں لیکن بچے کھچے لوگوں کو ہیبت خان نے قید کر لیا۔"

وہ مزید لکھتے ہیں کہ :

" واقعہ پاکپتن کا نہیں بلکہ فتح پور کے قریب ایک
کچا قلعہ تھا۔ جس میں میر مندو خان مع اہل وعیال رہتا
تھا۔ اور فتح خان کمبوہ بھی اسی قلعے میں پناہ گزین ہوا تھا۔"

" تاریخ شیر شاہی "میں مذکور ہے کہ جب فتح خان، شیخ ابراہیم کی وساطت سے ہیبت خان کی خدمت میں پیش ہوا تو اس نے شیخ ابراہیم کو کہا کہ میں شیر خان کا نوکر ہوں جو اس کا حکم ہوگا اس پر عمل کروں گا اور فتح خان کو قید کر لیا۔ "تاریخ افاغنہ" میں نعمت اللہ خان نیز لکھتے ہیں کہ :

"میر مندو خان، لڑتا بھڑتا بخشولنگاہ (13) کے پاس پہنچا۔
وہ کچھ دیر سستانا چاہتا تھا۔ مگر بخشو نے دھوکہ اور فریب
سے اُسے گرفتار کرالیا اور ہیبت خان کے پاس بھجوایا"

مزید لکھتے ہیں کہ چند دن بعد ہیبت خان، فتح خان اور میر مندو خان کو گرفتار کرنے کے بعد ملتان آ دھمکے۔ ہیبت خان نے شیر شاہ کو اپنی ان کامیابیوں پر فتح نامہ تحریر کیا تو وہ بڑا خوش ہوا اور اُس نے ہیبت خان کو مسند عالی منصب اور اعظم ہمایوں کا خطاب مرحمت کیا۔ (10) نیز حکم دیا کہ فتح خان کمبوہ، مندو خان اور بلوچ خان (چاکر خان رند کا لڑکا جس کا نام میران خان تھا) کو قتل کردو اور بخشولنگاہ یا اس کے بیٹے کو اپنی خدمت میں رکھو۔ ہیبت خان نے حکم ملتے ہی میران خان بلوچ کو شہید کر دیا اور فتح جنگ کو قائم مقام چھوڑ کر فوراً لاہور پہنچا اور وہاں اس نے فتح خان کمبوہ اور میر مندو خان کو دارِ فانی سے عالم باقی کو رخصت کیا۔" (11)

یہ تھے میر مندو خان رند کے بارے میں تاریخی حقائق اور اُن کے مستند حوالے، جنہیں ہمارے تاریخ نویس آخوند محمد صدیق، میر گل خان نصیر، ملک محمد سعید، آغا نصیر خان احمد زئی (12) خان میر احمد یار خان بلوچ، ملک صالح محمد لاہڑی و دیگر قلات میں میر وانیوں کے ہاتھوں مقتول بتا کر بڑی دیدہ دلیری سے اُس کے مقبرے کی بھی جھوٹی نشاندہی کرتے ہیں اور تاریخ کو مسخ کرنے کا جرم کر کے بھی مؤرخ ہونے کے دعویدار ہوتے ہیں۔

حواشی :

1۔ اخبار الابرار " کے اُردو ترجمہ "تاریخ خوانین قلات" کے صفحہ 26 کے حاشیے میں مترجم میر گل خان نصیر لکھتے ہیں۔

" مندو کون تھا؟ اس کے بارے میں صحت کے
ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بعض لوگ اُسے میر چاکر رند کا
خسر بتاتے ہیں مگر اس کیلئے کوئی شعری یا روایتی ثبوت
پیش نہیں کرسکتے۔ میر چاکر نے کبھی قلات پر حکومت
نہیں کی۔ لاشاری درہ مولا سے اور رند درہ بولان سے ہو کر
کچھی کی طرف ضرور گئے۔ مگر انہوں نے جہلاوان اور
سراوان کے باشندوں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اگر ایسا
ہوتا تو بلوچی کے اُس دور کے اشعار میں اُس کا ذکر
ضرور ہوتا۔ مندو غالباً جدگال تھا کیوں کہ اُن دنوں تمام
جہلاوان پر جدگال قابض تھے۔"

میر گل خان نصیر نے اپنی تصانیف میں ایسے بیسویں تاریخی واقعات پر من گھڑت قصے گڑھے جو حقیقی تاریخی واقعات تھے اور ان پر مدلل اور مستند کتابیں موجود تھیں لیکن چونکہ وہ محقق نہیں بلکہ مفروضہ نگار تھے اس لیے انہیں اُن تاریخی حقائق سے آگاہی نہیں ہوئی۔ انہوں نے تاریخ قلات، براہوئی وجہ تسمیہ وغیروں پر آخوند کی طرح

کئی شوشے چھوڑے اور تاریخ کو مسخ کرنے والوں کی صف میں شامل ہوئے۔ جبکہ اُن موضوعات پر بلوچی اشعار، تاریخی داستانیں، قبائلی روایات کے علاوہ مستند تاریخی حوالے بھی دستیاب تھے۔ لیکن انہوں نے سہل ترین راستہ مفروضات گڑھنے میں نظر آیا۔

میر چاکر رند کی قلات پر حکمرانی کی روایت پورے جھلاوان اور سراوان میں وافر دستیاب ہیں۔ اس بارے میں گذشتہ صفحات میں ہم نے ''دپتر ڈومبکی'' کا حوالہ دیا ہے جس میں میر مندو کی حاکمیت کا بھی تذکرہ ہے۔ اسی طرح خوانین قلات کے ایک درباری مؤرخ اور فارسی شاعر ''قاضی نور محمد گنجابوی'' کا جنگنامہ مطبوعہ کتاب ہے جو خان قلات کی لائبریری میں بمع قلمی موجود رہا ہے اس میں بھی چاکر رند کی حکمرانی کا تذکرہ ہے۔ گزشتہ صفحات میں مندو رند کے بارے میں ہم نے دپتر ڈومبکی، مولانا نور احمد خان فریدی کی تاریخ، تاریخ شیر شاہی، تاریخ داؤدی اور تاریخ افاغنہ میں مندو خان کے بارے میں تفصیل پیش کئے ان تصنیفات تک میر گل خان نصیر مرحوم بھی رسائی رکھ سکتے تھے۔ جس کی انہیں یا تو توفیق نہیں ہوئی یا تحقیق کا انہیں شوق نہیں تھا۔ اور تو اور معروف براہوجدگال جنگ کی رزمیہ داستان، جس کے چند اشعار انہوں نے توڑ مروڑ کر اپنی ایک دو کتابوں میں پیش کئے، کا انگریزی ترجمہ جھلاوان گزیٹیر میں موجود تھا وہ اس سے بھی استفادہ نہ کر سکے جو براہوئی تاریخ کا واحد اور مکمل ماخذ ہے۔ لاشاری کیلئے دیکھئے موضوع ''رند سردار میر چاکر خان کا قلات پر حملہ'' کا اشاریہ نمبر 1۔

2۔ کتاب ایضاً صفحہ 27-26۔

3۔ ایضاً صفحہ 27۔

4۔ واضح ہو کہ اُس زمانے میں نہ ''براہو اتحادیہ'' وجود میں آیا تھا۔ اور نہ ''براہوئی'' لفظ دنیا کی کسی تاریخ میں وجود رکھتا تھا۔ میر بجار براہو کی کمان میں مختلف بلوچ قبائل پر مشتمل ''براہو اتحادیہ'' 1665-1664ء کے درمیان تشکیل دیا گیا اور جدگالوں پر فتح پانے کے بعد 1665 کے آخر اور 1666ء کے شروع میں براہو کے اتحادی شخصیتوں کی میر بجار نے بہ حیثیت اُن کے لشکروں کے سردار کے دستار بندی کی۔ تب ان کے نام سے نئے قبیلے تشکیل پا گئے جو میر بجار کے سردار خیل طائفہ براہو کا اتحادی ہونے کی وجہ سے ''براہوئی'' کہلائے۔ تفصیل کیلئے دیکھئے موضوع ''برز کوہی''۔

5۔ دیکھئے کتاب ایضاً صفحہ 27۔

6۔ مذکورہ جدگال جام زئی قبیلے سے تھا اور جھلاوان کے پہاڑی علاقے کے موضع ''ہتاچی'' کا باشندہ تھا۔ اُس کے نام سے جدگالوں میں قبیلہ ''شکرانی'' تشکیل پا گیا۔

7۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے کتابیں ''براہوئی کون'' ایک نظم ایک تاریخ، براہو جدگال جنگ، شیئر، مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔

8۔ موصوف نے بلوچی نام ''شیہک'' کی وضاحت ''شیخ حق'' کی ہے جو انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ شیہک رند بلوچ تھا۔ کوئی شیخ نہیں تھا۔ جسے شیخ حق بنا دیا جائے۔ اور نہ کہ شیخ حق کوئی نام بنتا ہے۔ یہ ایک نہایت قدیم نام ہے۔ جس کے معنی ابھی تک

کسی کو معلوم نہیں ہیں اور یہ کوئی تبدیل شدہ یا بگڑا ہوا لفظ بھی نہیں ہے۔ صدیوں سے اسی تلفظ سے بولا جاتا رہا ہے اور سینکڑوں لوگ یہ نام رکھتے رہے ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔

9۔ دیکھئے "بلوچ قوم اور اس کی تاریخ" از مولانا نور احمد خان فریدی، مطبوعہ بلوچی دنیا ،ملتان۔

10۔ شیر شاہ نے بادشاہ ہند "ہمایوں" سے دشمنی اور بغض رکھنے کی وجہ سے یہ خطاب ہیبت خان نیازی کو دیا تھا۔

11۔ کتاب چاکر اعظم مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے مترجم عبدالغفار ندیم "بلوچی دنیا" ملتان، ماہ فروری و مارچ 1962 کے حوالے سے اپنے ایک تحقیقی مقالہ "سلطانیں چاکر" میں لکھتے ہیں کہ سردار چاکر خان نے اپنے بیٹے میران خان عرف بلوچ خان کو ان مقبوضہ علاقوں کا گورنر مقرر کیا تھا جو اُسے شاہ حسین کی طرف سے ملتان، مظفر گڑھ، خوشاب وغیرہ کے علاقوں میں ملے تھے۔ شیر خان اُس سے یہ علاقے چھیننا چاہتا تھا اُس نے اپنے جرنیل خواص خان کو لشکر دے کر میران خان پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا۔ لیکن وہ بلوچوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور پسپا ہو گیا۔ دوسری مرتبہ شیر شاہ نے ہیبت خان نیازی کی کمان میں لشکر روانہ کیا۔ دونوں لشکر ہڑپہ کے میدان میں زور آزما ہوئے۔ ہیبت خان کو شکست ہوئی اور سخت شرمندگی اٹھانی پڑی۔ دوسری مرتبہ پھر بھرپور تیاریوں کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ جس میں بلوچوں کو شکست ہوئی اور میران خان اور مندو خان رند

گرفتار کر لئے گئے۔ ہیبت خان نے اپنے اور خواص خان کے سابقہ شکستوں کا بدلہ لینے کیلئے میران خان کو گھوڑے کے پیچھے باندھا اور گھوڑا دوڑایا اور بڑی بیدردی اور ظالمانہ طریقے سے اُسے شہید کروا دیا۔

جب چاکر خان نے اپنے لخت جگر کے ساتھ روا رکھا گیا ظلم دیکھا تو وہ ہیبت خان کے خلاف لشکر کی جمع آوری میں لگ گیا۔ اور دریائے سندھ کے کنارے "سیت پور" کے مقام پر دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ مقابلہ برابر کا ہو رہا تھا کہ چاکر نے ایک جنگی چال چلی اور میدان سے پسپا ہونے کا تاثر دیا۔ اس سے افغان لشکر کو حوصلہ ملا اور وہ مزید آگے بڑھنے لگے۔ قریب ہی چاکر خان نے اپنا ایک بلوچ اتحادی سردار شاہنواز خان مزاری کی سرکردگی میں چھ ہزار گھڑ سوار جنگل میں بٹھا دیئے تھے جو پہلو سے نکل کر افغان لشکر پر حملہ آور ہوئے۔ ہیبت خان نیازی مقتول ہوا۔ اُس کی لاش سے اُس کا سر کاٹا گیا۔ اُس کی کھوپڑی کا قدح بنایا گیا جو چاکر خان رند کی زندگی تک اُس کے پاس تھا۔ (بلوچی مقالہ "سلطانیں چاکر" مطبوعہ ماہنامہ "اُلس" کوئٹہ شمارہ ماہ جنوری 1967ء)

جناب عبدالغفار ندیم کی مذکورہ کہانی کا ذکر تواریخی کتابوں میں نہیں ملتا بلکہ اس کے برعکس کتاب "شوکت افغانیہ" حصہ سوئم کے صفحہ 305 میں بیان کیا گیا ہے کہ ہمایوں نیازی کا خالہ زاد بھائی مرزا حیدر، کشمیر میں "چک" حکمرانوں کی طرف سے ایک خود مختار نائب تھا۔ چک حکمران نے اُس کی سرکردگی میں ایک لشکر نیازیوں کے

خلاف لڑنے کیلئے بھیج دیا۔ اور ایک بڑی لڑائی لڑی گئی۔ جس میں تمام کے تمام نیازی مارے گئے جن میں ہیبت خان نیازی بھی تھا۔ مرزا حیدر نے تمام مقتول نیازیوں کے سر کاٹ لئے اور سلیم شاہ سوری ولد شیر شاہ سوری کو بھیج دیئے جو ان دنوں چک بادشاہ کے نام پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اس کتاب کے مصنف حیات لودھی ہیں۔

12۔ آغا نصیر خان احمدزئی نے تو حد کر دی۔ انہوں نے مستونگی دہواری فارسی میں ایک جعلی کتاب "کردگال نامک" کے نام سے لکھی تا کہ براہوئی بولنے والوں کو کرد نسل سے بتا کر انہیں بلوچ ثابت کرے اور پھر دنیا یقین کرے کہ آغا صاحب نے اس براہوئی مسئلہ کو حل کر دیا ہے جسے یورپی مصنفوں نے دراوڑوں سے منسوب کر دیا ہے۔ حالانکہ یورپی مصنفین نے جتنی بحث کی ہے براہوئی زبان کے حوالہ سے اور زیادہ تر براہوئی زبان پر کی ہے اور انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ براہوئیوں کا ایک قطرہ خون بھی دراوڑی نہیں ہے لیکن اُن کی زبان دراوڑ السنہ خاندان سے ہے۔ اس طرح انہوں نے براہوئی بولنے والوں کا تاریخی مطالعہ ایک الگ موضوع بنایا اور براہوئی زبان کے مطالعہ کو الگ موضوع بنایا تھا۔

چونکہ نام "براہوئی" سترھویں صدی عیسوی کے نصف کے بعد سُنا گیا اور اس سے قبل اس زبان کا نام کُردی تھا یعنی کردوں کی زبان۔ اور پھر اگر کوئی غیر کرد اس زبان کو اپناتا تو بلوچ اُسے کردگال کہتے تھے۔ یعنی کردوں کی زبان اپنانے والا۔ جیسے کہ بلوچ، سندھی کو "جٹ" کہتے ہیں لیکن جو ان کی زبان اپنالے تو اُسے وہ جٹگال کہتے

ہیں جو جدگال اور جگدال میں بھی تلفظ کیا جاتا ہے۔ جیسے جٹ الگ قوم ہوا اور جدگال الگ اور غیر جٹ ہوئے۔ اسی طرح کرد الگ قبیلہ تھا اور کردگال الگ تھے۔ جو غیر کرد ہوتے تھے اور صرف کردی زبان سے ان کا تعلق تھا۔ اور ان کا تعلق کسی بھی قبیلہ سے ہوسکتا تھا آغا صاحب نے اس نکتے کو نہیں سمجھا اور اس بنیاد پر وہ براہوئی بولنے والوں کو جعلسازی سے کرد ثابت کرنا چاہتے تھے۔ مگر چوں کہ جھوٹ، دل میں کئی وسوسے پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے اور یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کسی سٹیج پر جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ نہ جائے اور بجائے خوشنامی کمانے کے رسوائی کا باعث نہ بنے۔ اس لئے انہوں نے مجوزہ تصنیف کو اپنے نام سے شائع کرنے کی بجائے کسی مُردہ مگر قدرے معروف شخص کے نام سے لکھنے اور شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ اور پھر اُسے خوانین قلات کے دربار نصیری کے معروف درباری اور وزیر آخوند محمد صالح شیرازی کی تصنیف بتا کر اس کی اشاعت کی۔ اُن دنوں بلوچی اکیڈمی میں وہ ایک اہم عہدے پر تھے اس لئے کوردگال نامک کی جعلی کتاب کی اشاعت کا بوجھ بلوچی اکیڈمی پر ڈال دیا۔ اس کے بعد اسی جعلسازی کو بنیادی حوالہ کے طور پر استعمال کر کے اپنی ایک تصنیف "بلوچ اور بلوچستان کی تاریخ" کے نام سے چھ جلدوں میں چھپوالی۔ جس کا واحد حوالہ ماخذ اسی "کوردگال نامک" کو بنایا۔ اس سے چند عرصہ قبل وہ مختلف ادبی اجلاسوں اور سیمنیاروں میں اس جعلی مسودے کی بنیاد پر مقالے پڑھتے رہے اور مختلف لوگوں اور طلباء تنظیموں کے ذریعے اخبارات میں اپنی اسی جعلی مسودے کی تعریف میں بیانات

لگواتے رہے کہ آغا صاحب نے بلوچ اور بلوچستان کی حقیقی تاریخ پیش کی ہے جو انتہائی مبارکباد کے مستحق ہیں۔تصانیف کی دنیا میں شاید ہی اس قسم کا اخباری پروپیگنڈہ ہوا ہو۔اس پروپیگنڈے کے دوران یہ پروپیگنڈہ بھی سنا گیا کہ ''کوردگال نامک'' کا مسودہ خان قلات کے کتب خانے سے دستیاب ہوا ہے۔ہمیں بھی شوق چڑھا کہ اس بارے میں خان میر احمد یار خان مرحوم سے رابطہ کیا جائے اور اُن سے یہ بھی پوچھا جائے کہ انہوں نے اپنی اُردو اور انگریزی کتابوں میں اس تاریخی مسودے کا کیوں ذکر نہیں کیا تھا۔1970ء میں ہم کراچی میں ان کے ایوان قلات گئے۔مگر خان صاحب نے ایسے کسی مسودے کی موجودگی سے صاف انکار کیا اور فرمایا کہ آغا صاحب بادشاہ آدمی ہے۔ایسا کوئی مسودہ نہیں رہا ہے اور نہ کہ آخوند محمد صالح کوئی شاعر، دانشور، مصنف ومحقق تھے۔آخوند نے تو تحریری کاغذ کا پُرزہ بھی نہیں چھوڑا ہے تو تاریخی مسودہ کہاں سے آیا۔

درحقیقت ہم اس کتاب کی دھواری فارسی سے اور چند دیگر تاریخی مستند نکات سے اس جعلسازی کو پکڑ چکے تھے۔جن میں چند درج ذیل ہیں :

کتاب کی زبان بیسویں اور اکیسویں صدی کی بلوچی آمیز دھواری فارسی ہے جبکہ آخوند محمد صالح بقول آغا نصیر خان کے خان قلات میر لیلاتاز دوئم (1656-1666) کے زمانہ اقتدار میں قلات آئے تھے اور نصیر خان اوّل (1729-1794) کے درباری اور وزیر تھے۔اُس زمانے کی فارسی کا رنگ اور

ڈھنگ دونوں الگ ہیں اگرچہ نصیر خان نے اُسی زبان کو پیش کرنیکی ناکام کوشش بھی کی ہے۔

قدیم بلوچی شاعری میں ''معروف رزمیہ داستان'' براہوجدگال جنگ کی نظم موجود اور مشہور تھی۔حتیٰ کہ یوروپی مصنفین کو بھی دستیاب ہوئی اور انہوں نے جہلاوان گزیٹر میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی چھاپا۔اس داستان میں تمام بنیادی براہوئی قبائل کے جدّامجدوں کا نام ہے جو مذکورہ جنگ میں بہ نفس نفیس شامل تھے اور فتح کے بعد اپنے اپنے نوتشکیل شدہ قبیلوں کے جد بنے تھے۔اُن جنگی لشکروں اور ان کے کمانڈروں میں ایک شخص بھی کُرد قبیلہ سے نہیں تھا۔پھر کسی بھی جعلسازی کے ذریعے براہوئی قبائل کیلئے کُرد یا اور کوئی قدیم فرضی نظریے کو کیونکر تسلیم کیا جائیگا۔جبکہ مذکورہ جنگ سے پہلے دنیا کی کسی کتاب میں اور دنیا کے کسی مقام پر لفظ براہوئی کا وجود نہیں رہا ہے۔یہ لفظ پہلی مرتبہ اٹھارویں صدی کی فارسی زبان میں لکھی گئی سندھ کی تاریخ ''تحفۃ الکرام'' میں مذکورہ ہوا ہے۔اس کتاب کی تیسری جلد کے حصّہ اوّل کے صفحہ 422 پر درج الفاظ یہ ہیں جو خان قلات میر ''عبداللہ خان کے بارے میں درج ہیں :

'' عبداللہ خان بن سمندر خان بلوچ بردی زمیندار عمدہ سرحد قندہار۔''

آغا نصیر خان نے اپنے اس جعلی کتاب کے مصنف آخوند محمد صالح کو خان قلات میر لیلاتاز خان کے زمانے میں قلات میں بتایا ہے۔اور سن 1656-1666ء کے دس سال میر لیلاتاز کا زمانہ اقتدار دکھایا ہے۔1665ء ہی کے آخری شش

ماہی میں براہوجدگال جنگ کا خاتمہ ہوا اور اسی فتح کے نتیجے میں میر ابلتاز کا بیٹا میر احمد 1666ء خانی قلات پر متمکن ہوا۔ (دیکھئے "تاریخ خوانین قلات، حاشیہ صفحہ 31 و دیگر تواریخی کتب) اور انہیں ایام میں براہو طائفہ کے اتحادیوں کے تو تشکیل شدہ قبیلوں کے سرکردوں کی بحیثیت سردار میر بجار نے اپنے ہاتھوں سے دستار بندی کی۔ یہی قبیلہ "براہوئی" کہلائے۔ اگر آخوند صالح کوئی مصنف یا مؤرخ ہوتا۔ تو ان تمام واقعات کو یقیناً تحریر میں لاتے اور براہوئی تاریخ کا کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا۔ ان تمام تاریخی حقائق پر جو کہ اس کے چشم دید تھے، اس کا سکوت اس چیز کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ وہ قلمکار نہیں تھے۔ جب وہ سچ کے قلمکار نہیں تھے تو پھر کوردگال نامک کے مفروضے اور غلط بیانیاں اس نے کیسے لکھیں۔ جعلسازی خود بخود اپنا اظہار کر رہی ہے۔

آخوند صالح، "اخبار الابرار" (تاریخ خوانین قلات) کے مصنف آخوند محمد صدیق کے دادا آخوند محمد حیات کے والد تھے (بہ تحریر گل خان نصیر: کتاب ایضاً صفحہ 10 لیکن بقول ہتورام وہ لاولد تھے: تاریخ بلوچستان، ہتورام صفحہ 218)۔ اگر آخوند صالح نے کوردگال نامک لکھا ہوتا تو وہ سب سے پہلے اس کے نواسے یعنی آخوند محمد صدیق کی میراث میں مل جاتی تھی اور آخوند محمد صدیق سب سے پہلے اسی سے استفادہ کرتے اور اسی کے حوالے دیتے اور اُسے "اخبار الابرار" کے نام سے مفروضات کا انبار لگانا نہیں پڑتا۔

اگر مذکورہ "کوردگال نامک" کوئی پُرانی دستاویز ہوتی اور آغا کے دعویٰ کے مطابق خان قلات کے کتابخانہ میں موجود ہوتی تو خان میر احمد یار خان کو نہ صرف اس کا

علم ہوتا بلکہ انہیں بھی اپنی کتابوں میں مفروضے گڑھنے نہیں پڑتے اور نہ کہ وہ میر گل خان نصیر کے قائم کردہ مفروضوں کی تشہیر کا کام کرتے۔

مذکورہ بالا دلائل آغا صاحب کے "کوردگال نامک" کو ایک جعلسازی ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں۔ لہذا مستقبل کے کسی ممکنہ جعلساز کو ایسے کسی غلیظ اقدام سے احتراز کر کے قلمی رسوائی اور قومی بدنامی سے بچنا چاہیے۔ کیونکہ تاریخ کسی نہ کسی موڑ پر اپنے پر ڈالے گئے داغ دھو ہی ڈالتی ہے۔

13۔ بادشاہ ہمایوں کی بہن "گلبدن بیگم" نے اپنی کتاب "ہمایوں نامہ" میں بخشو کو "بخشو بلوچ" لکھا ہے جس نے ہمایوں کو دربدری کی حالت میں ایک سو کشتیاں غلہ دے دی۔ گلبدن بیگم لکھتی ہیں:

> " (جب ہمایوں اپنے لاؤ لشکر کے ہمراہ) ایک ایسے دریا کے کنارے پہنچے جو سات دریاؤں کا مجموعہ ہے۔ حیران کھڑے تھے، کوئی کشتی نظر نہ آتی تھی اور آپ کے ساتھ بہت لاؤ لشکر تھا۔ اسی ششش و پنج میں یہ سنا کہ خواص خان اور شیر خان کے چند اور امرا تعاقب میں آرہے ہیں۔ اس علاقہ میں بخشو نامی ایک بلوچ تھا۔ جس کے پاس کئی قلعے اور بہت سی کشتیاں تھیں حضرت بادشاہ نے اپنے ایک آدمی کے ہاتھ علم اور نقارہ اور گھوڑا اور خلعت اس بلوچ کو بھجوائی اور کشتی اور غلہ طلب کیا۔ بخشو بلوچ نے قریباً

ایک سو کشتیاں غلّہ سے بھر کر حضرت بادشاہ کے پاس بھیج
دیئے۔اس شائستہ خدمت سے آپ بہت خوش ہوئے۔
غلہ آدمیوں میں تقسیم کیا اور خیر وسلامتی سے دریا کو عبور کیا۔
خدا بخشو بلوچ کا بھلا کرے کہ اس آڑے وقت میں وہ
ایسی مناسب خدمت بجالایا۔" (اُردو ترجمہ از عثمان
حیدر مرزا، صفحہ 61، مطبوعہ فکشن ہاؤس لاہور)

ر۔ میر بجار کا علاقہ سوراب اور وڈھ میں بلوچوں کا قتل

آخوند محمد صدیق اپنی اس شاہکار تاریخچہ میں مفروضہ میروانی ورند لڑائی کے سلسلے کو بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں :

" بعدازاں میر بجار نے علاقہ سوراب ووڈھ میں
بلوچوں کو قتل کیا اور قبیلہ مینگل کو وڈھ میں بٹھایا۔وڈھ میں
ایک علاقہ ہے جسے وہیر کہتے ہیں وہ رئیسانیوں کو دیا جو
سیاہی زئی کہلاتے ہیں۔اب تک وہیر کا علاقہ اُن کے
پاس ہے۔
قلات کے جوئے دوران سے چار شبانہ آب مع
زمین سیاہی رئیس کے بیٹوں کو اُن کے چار گھوڑوں کے

عوض میں اور چھپر کے اراضیات خشکابہ بھی ان کو دیئے، یہ
اراضیات اور جوئے دوران سے تھوڑا سا حصّہ اب تک
ان کے پاس ہے۔"(1)

مندرجہ بالا پیرے کے پہلے حصّے کے بیان پر کتاب کے مترجم میر گل خان نصیر نے صفحہ 28 کے حاشیے میں آخوند کے مفروضے کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

" براہوجدگال جنگ" کے عنوان سے جو بلوچی نظم
موجود ہے اور جس میں جدگالوں کو شکست دینے کے بعد
میر بجار نے اپنے براہوئی قبائل میں جس طرح مفتوحہ
علاقے کو تقسیم کیا اُس میں وہیر کا علاقہ رئیسانیوں کو دینے
کا ذکر نہیں ملتا"

ظاہر بات ہے جب رئیسانی قبیلہ کا مذکورہ جنگ سے کوئی تعلق تھا اور نہ کسی رئیسانی شخصیت سے میروانیوں نے مدد کی درخواست کی تھی۔حصہ تو لڑائی میں شامل اتحادیوں کو دیا گیا تھا۔جہاں تک وڈھ اور سوراب میں بلوچوں کے قتل کی بات ہے تو اس سے قبل ہم ثابت کر چکے ہیں کہ میروانی خود بلوچ تھے اور رئیس بلوچوں سے تھے۔ اور ان کی لڑائی سوراب کے جٹ اور جدگالوں سے تھی۔اس لئے بلوچوں کو مارنے کی بات ایک من گھڑت بات اور دروغ گوئی ہے۔کتاب کے مترجم میر گل خان نصیر نے بھی کتاب کے صفحہ 27 کے حاشیے میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ آخوند کا بیان

صحیح نہیں ہے۔ ان دنوں سوراب اور وڈھ میں جدگال آباد تھے۔ کوئی بلوچ قبیلہ (2) وہاں آباد نہیں تھا۔

چھپر وغیرہ کی اراضیات کی رئیسانیوں کو دینے کے بارے میں گذشتہ صفحات میں ''میر مندو رند کی حکمرانی'' کی ذیل میں ہم دکھا چکے ہیں کہ یہ اراضیات قلات نچارا پر رندوں کو فتح دلانے میں ساتھ دینے پر خود سردار چاکر خان رند نے رئیسانیوں کو دیئے تھے۔ اور ان کے ایک جدّ سردار میر ہیبت خان کو سراوان کا بیرک (جھنڈا) دیا تھا۔ جب یہ بیرک کا منصب میر مندو کی حکمرانی کے دوران رئیسانیوں سے لیکر شاہوانی رندوں کو دیا گیا تو رئیسانی نے دی گئی اراضیات بھی واپس کردی تھیں۔ جب میر کمبر رئیس نے قلات کی حاکمیت اپنے ہاتھ میں لے لی تو انہوں نے واپس کردہ اراضیات کے بدلے انہیں کانک اور دولائی میں مالیہ معاف اراضیات دیں اور سراوان کا بیرک پھر انہیں دیا گیا۔ جہلاوان گزیٹر نے لکھا ہے کہ کانک وغیرہ کی اراضیات انہیں احمدزئی خوانین نے دی تھیں۔ چونکہ میر کمبر رئیس، احمدزئی خوانین قلات کے جدّ ہیں اس لئے گزیٹر نے احمدزئی خوانین کا نام استعمال کیا۔ اور کسی مخصوص خان سے اس عطیہ کو منسوب نہیں کیا۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ معروف براہوجدگال جنگ کی رزمیہ داستان، آخوند محمد صدیق کے محولہ بالا بیانات کی کیا تصدیق یا تردید کرتی ہے اور حقیقت کیا بیان کرتی ہے۔ داستان کے مصرعہ 230 سے لے کر مصرعہ 241 تک کا بیان یوں ہے :

" (جوش انتقام سے) میر بجار بپھرا ہوا تھا۔ اس نے جگہ جگہ سے مسلح اتحادیوں کے لئے قاصد بھیجے اور لشکر مجتمع کیا۔ پہلا لشکر نال (ضلع خضدار) سے روانہ ہوا اور یوسف (3) جدگال کے لشکر سے ٹکرایا۔ اور انہیں تہس نہس کر کے نال ندی سے گروک تک ان کا پیچھا کیا اور ان کی ہزار گنجی اور نال کی ملکیتوں پر قبضہ کیا۔ تمام قرب و جوار سے جدگالوں کو مار بھگایا گیا۔ وڈھ سے اور ناچ تک اور مند (لک باراں کا علاقہ) سے پورالی ندی تک لڑتے لڑتے انہیں اس سے آگے دھکیلا گیا۔ اور پٹی ڈیڈار (4) کو اپنی آخری سرحد بنایا۔"

مفتوحہ علاقوں اور اراضیات کی تقسیم کے بارے میں رزمیہ داستان ایک چیز تفصیل سے بتاتی ہے۔ وڈھ اور دوہیر وغیرہ کی اراضیات کی تقسیم اور عطائیگی کے بارے میں داستان کے مصرعہ 257 تا 262 کا خلاصہ درج ذیل ہے :

" وڈھ، ملک دوستین (نوشیروانی) کا حصّہ ہے۔ گریشہ اس کے مقتول بیٹے ملک دینار کا خون بہا اور گجر (مشکے میں) اس کی رہائش کیلئے دیا گیا۔ کیوں کہ اس کا دل اپنے بیٹے ملک دینار (کے قتل پر) نہایت غمزدہ

ہے۔ یوسف ہوتک کے بیٹے تھمر (5) کو علاقہ وڈھ کی
نائبی دی گئی جس میں علاقہ وہیر سے تا حدّ درا کالہ اور پھر
لک (لک باراں) کی سرحد تک (کا علاقہ) شامل
ہے۔"

یہ ہوتی وڈھ اور وہیر کے مفتوحہ علاقوں کی تقسیم جس میں نہ کہیں وڈھ کے مینگلوں کا ذکر ہے اور نہ وہیر کے ریئسانیوں کا۔ رزمیہ داستان میں جن مینگلوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ وڈھ کے مینگل نہیں ہیں جو رند الاصل ہیں بلکہ نوشکی کے ڈگر مینگل ہیں جو خوانین قلات اور میروانیوں کے ہم نسل ہیں جو دوران جنگ دشت گوران چھوڑ کر نوشکی جا چکے تھے (6) اس سے تقریباً ستر اسی سال قبل بھی کئی مینگل نقل مکانی کر کے سیستان جا چکے تھے جہاں سے کئی ایران وترکی تک گئے اور وہاں کردوں میں شامل ہوئے جہاں وہ "سینگر" کہلاتے ہیں۔

1990-1988ء کے دوران ایرانی کُردستان کے چند کُرد مہاجروں نے کوئٹہ میں اسٹیورٹ روڈ پر ایک مکان کرایہ پر لیا تھا اور میرے ہمسایے تھے۔ ان میں ایک نوجوان اور ایک درمیانی عمر کا مینگل بھی تھا جو کردی شاعری بھی کرتا تھا۔ دونوں نے بتایا کہ ان کے قبیلہ کو "رہشانی" کُرد کہتے ہیں۔ ان کا قدیمی وطن سیستان کا رہشان رہا ہے۔ انہیں اس چیز کا علم نہیں تھا کہ رہشان (رخشان) بلوچستان کے ضلع خاران میں ہے۔ واضح ہو کہ کسی زمانے میں خاران سیستان ہی میں شمار ہوتا تھا۔

حواشی:

1۔ تاریخ خوانین قلات صفحہ 28۔

2۔ گل خان نصیر کا یہ کہنا غلط اور ان کی لاعلمی پر مبنی ہے کہ سوراب اور وڈھ میں کوئی بلوچ قبیلہ آباد نہیں تھا۔ شاید ان کی مراد رند ولاشار قبائل سے ہے۔ لیکن رند قبیلہ کی کئی طائفے آس پاس پہاڑوں میں بود و باش رکھتے تھے۔ خود میروانی قبیلہ بھی بلوچ تھا اور زبان بھی اُس کی بلوچی تھی، ملازئی، ریکی زئی، موسیانی، زہری، رئیس، سیاہ پاد، محمد حسنی، عمرانی وغیرہ تمام بلوچ قبیلہ تھے۔ حتیٰ کہ جدگالوں کی اکثر شاخیں بھی بلوچ تھیں۔ چونکہ وہ سندھی زبان بولنے والے علاقوں سے آئے تھے اور ان کی زبان بلوچی سے بدل کر جتکی ہو چکی تھی اس لئے وہ جدگال کہلاتے تھے۔ ان میں موجود اور ان کے جنگی اتحادی جٹ البتہ غیر بلوچ ہوتے تھے۔ وڈھ کے مینگل بھی بلوچ تھے اور چند طائفوں کو چھوڑ کر تمام رند الاصل ہیں۔ یہ لوگ پندرھویں صدی میں میر شیہک رند کے ساتھ رخشان کے علاقہ "مین" سے آ کر ملے تھے۔ ان کا گل یعنی لشکر اپنے خطہ "مین" کی نسبت سے "مین گل" کہلایا۔ جو گوران دشت میں آباد ہوا۔ پندرھویں صدی سے بھی صدیوں پہلے قدیم نسلی بلوچ قبیلے کُرد، گوران، گیشتہ (گیدوہ)، بیشک، سرتاپ، گیاب وغیرہ اسی خطے میں آباد تھے۔ خود وڈھ کا نام بھی بلوچی زبان کا لفظ ہے۔

یہاں بھی وضاحت ضروری ہے کہ میر بجار براہو کے "براہو" طائفہ کے جنگی اتحادی جو اختتام جنگ پر "براہوئی" کہلائے، سب موجودہ براہوئی زبان بولنے والے نہیں تھے۔ اور نہ کہ اُن دنوں براہوئی بولنے والوں کیلئے لفظ "براہوئی" مستعمل تھا۔ ان دنوں

براہوئی زبان بولنے والے ''کُردگال'' کہلاتے تھے۔ اور براہوئی زبان کا نام ''کُردی'' ہوتا تھا۔ جب آہستہ آہستہ ''کُردی'' براہو اتحادیہ کے طائفوں کے گھروں کی زبان بنتی گئی تو اُس پر یہ نیا نام براہوئی چسپان ہوتا گیا۔

3۔ یوسف، بلشت جدگالوں سے تھا، کس طائفہ سے تھا اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اُس کے نام سے جدگالوں میں نیا قبیلہ ''یوسفانی'' تشکیل پا گیا۔

4۔ ٹپی ڈیڈار پورالی علاقے میں موضع کشاری میں ایک تھوہر کا کانٹے دار گھنا درخت تھا۔ جو میر بجار کی تلوار کے لاتعداد واروں سے زخمی تھا۔ ''ٹپی ڈیڈار'' کے معنی زخمی تھوہر''۔ کہتے ہیں کہ میر بجار مع اپنے اتحادی لشکروں کے جدگالوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ جگہ جگہ دونوں لشکر آمنے سامنے ہوتے تو کشتوں کے پشتے لگ جاتے تھے۔ میر بجار بڑا جذباتی اور جنونی شخص تھا۔ جیسے کہ مذکورہ رزمیہ داستان سے ظاہر ہے۔ جب چنگھاڑتے دھاڑتے لڑتے ہوئے اس ڈیڈار کے درخت کے قریب پہنچے تو اُس پر تقریباً دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ جدگال اس جگہ سے آگے جنگل میں پسپا ہو چکے تھے۔ میر بجار اپنے غصّے پر قابو نہ پا سکا تھا اور اس ڈیڈار پر تلوار چلاتا رہا۔ جب تک کہ ساتھیوں نے اُسے قابو کر کے تلوار لے لی اور اُسے زمین پر لٹا کر پانی پلایا اور اُس کے جذبات کو ٹھنڈا کیا۔ کہتے ہیں کہ اُس وقت تک اس ڈیڈار پر تین سو کے قریب تلوار کے نشانات پڑ چکے تھے۔ جس کی وجہ سے اس درخت کا نام ''ٹپی ڈیڈار'' پڑ گیا۔ پھر یہی مقام میروانیوں اور جدگالوں کے درمیان مستقل سرحد ٹھہرائی گئی۔

5۔ جمبر قبیلہ کا ہوتک رخشانی تھا۔ اس کا باپ یوسف ہوتک علاقہ رخشان میں نوشیروانیوں کی اراضیات کا نائب اور نگران تھا۔ ملک دوستین نوشیروانی کے کہنے پر اپنے حامیوں کے ساتھ میر بجار براہو کا اتحادی بنا۔ لڑائی میں بیزنجہ لشکر کے ساتھ تھا۔ اس لئے بیزنجہ کہلایا۔ فتح کے نتیجے میں جو اراضیات اُسے ملیں وہ علاقہ اورناچ میں واقع تھیں اس لئے وہیں بس گیا۔ اُس کے نام سے نیا قبیلہ جمبرانی تشکیل پایا جو جدگالی زبان کے اثر سے تمبر اڑی کہلایا۔

6۔ مینگلوں کیلئے گذشتہ صفحات میں موضوع ''میر بجار کی رندوں سے لڑائی کی تیاری کا اشاریہ نمبر 5 ملاحظہ کریں۔

ز۔ میر بجار کا قلات پر قبضہ اور بادیہ نشینی

آخوند محمد صدیق اپنی بے بنیاد کہانیوں کے سلسلے میں مزید لکھتے ہیں :

> '' مندو کو موت کے گھاٹ اتار کر میر بجار نے قلات پر قبضہ کیا لیکن بعد میں اُس نے بادیہ نشینی اختیار کی۔ یہاں تک کہ بادیہ نشینی کی حالت میں ہی فوت ہوا۔ قلات بغیر حاکم کے رہ گیا۔''(1)

گذشتہ صفحات میں ثابت کیا گیا کہ نہ رندوں اور میراونیوں میں کوئی لڑائی ہوئی تھی اور نہ میر بجار اور میر مندو ہمعصر تھے۔ اور نہ میر مندو بلوچستان میں مارا گیا۔

مستند تاریخی حوالوں سے ثابت کیا گیا کہ وہ قلات کی حکومت سے میر کمبر کے حق میں دستبردار ہو کر اپنے لوگوں کے ساتھ سردار چاکر خان کے بُلاوے پر پنجاب گئے جہاں انہیں پاکپتن کے علاقے میں ایک خطہ مع قلعہ دیا گیا۔ جہاں بیبت خان نیازی کی کمان میں شیر شاہی لشکر سے ان کی لڑائی ہوئی۔ جسے بخشولنگاہ نے دھوکے سے گرفتار کرایا۔ اور اُسے شیر شاہ کے حکم پر قتل کیا گیا۔

آخوند کے دیگر تمام مفروضوں کی طرح بجار کا قلات پر قبضہ بھی دروغ ثابت ہوا کیونکہ جیسے کہ پچھلے صفحات میں بتایا گیا کہ میر بجار کا قلات سے تعلق نہیں تھا۔ قلات کا محدود علاقہ پہلے ہی سے میر بجار کے اتحادی میر احمد ایلتا زئی کے والد میر ایلتا زخان کی بالادستی میں تھا۔ جدگالوں سے جنگ جیتنے کے نتیجے میں میر احمد وغیرہ کے حصے میں مزید علاقے آئے جن کی تفصیل براہوجدگال جنگ کی رزمیہ داستان میں بتائی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے مصرعہ 266 سے مصرعہ 269 تک کا بیان :

کرخ، چگو سے لے کر زیدی اور باغبانہ تک بجار
نے نوجوان محراب (2) کے حصے میں دیئے۔ کھڈ
مستونگ (کھڈ کوچہ) سے لے کر خضدار قلعہ تک
(3) میر احمد اور کمبر کے حصے میں دیئے گئے" (4)

جب نئے علاقے خوانین قلات کے شہزادوں کے حصے میں آئے تو قلات کی حدود وسیع ہوگئیں۔ اور پھر میر ایلتا زنے اس پورے ریاست پر اپنے بیٹے میر احمد ایلتا زئی کو حکمران بنایا۔ جو 1666ء میں تخت نشین ہوا۔

آخوند کا میر بجار کی بادیہ نشینی کی بات بھی ناقابل یقین ہے۔ کیوں کہ ایک تو اُس کی کتاب کے وہ حصے جو خان قلات میر محراب خان دوئم (شہید) کے زمانہ حکمرانی سے پہلے کے واقعات پر مبنی ہیں تمام تر دروغ گوئی ثابت ہوئے ہیں۔ دوسرا یہ کہ رزمیہ داستان بتاتی ہے کہ جدگالوں سے جنگ جیتنے کے بعد میر بجار نے تمام اتحادیوں میں مفتوحہ علاقے اور اراضیات اُن کی خدمات کے صلے میں لشکریوں کی تعداد کے حساب سے تقسیم کئے اور نئے تشکیل پانے والے قبیلوں کے سرکردوں کو سردار بنا کر ان کی دستار بندی کی اور پھر تمام اتحادی قبیلوں سے نو تشکیل شدہ براہوئی قبائل کے چیف سردار کی حیثیت سے میر بجار کی دستار بندی ہوئی۔ جب بجار کو بائیس قبیلوں کا سربراہ منتخب کیا جاتا ہے اور وہ چیف سردار کی دستار قبول کر لیتا ہے تو پھر اتنی بڑی ذمہ داری کے اٹھانے کے باوجود وہ کیوں کر بادیہ نشینی اختیار کر لیتا ہے۔ لہذا آخوند کا یہ بیان بھی ناقابل قبول ہے۔

مزید اپنے بیان کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "قلات بغیر حاکم کے رہ گیا۔" ایسی بات کوئی لاعلم شخص ہی کہہ سکتا ہے۔ حکومت اور اقتدار کے کشمکش میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی ریاست یا چھوٹے سے چھوٹا ملک بھی بغیر حکمران کے رہے۔ حکمرانوں کی موجودگی میں حکمران خاندانوں میں گدی پر خون خرابہ ہوتا ہے۔ تو یہ کیسے باور کیا جائے کہ قلات بغیر حاکم کے رہ گیا۔ "براہوجدگال جنگ کی نظم" میں بتایا گیا ہے کہ جدگالوں سے لڑائی جیتنے کے بعد میر بجار کا جنگی اتحادی میر احمد ایلتا زئی اپنے حصے

کے مفتوحہ علاقوں کو قلات سیوا کی سرحدوں میں ملا کر 1666ء میں تخت پر بیٹھتا ہے۔ جبکہ اس سے قبل اور دوران جنگ محدود سرحدوں کے قلات پر میر احمد کا باپ میر ایلتا ز خان، خان قلات تھا اور حکومت پر تھا۔ اور یہ سب کچھ خوانین قلات اور قلات کی تواریخ میں متفقہ طور پر ثابت ہے۔ لہذا مذکورہ بات بھی ایک ذہنی اختراع ہے۔

حواشی :

1۔ کتاب ایضاً صفحہ 28۔

2۔ میر محراب خان، میر احمد ایلتا زئی کا نوجوان بیٹا تھا۔ باپ بیٹا دونوں میر بجار براہو کے جنگی اتحادی تھے۔

3۔ ''کوٹ خضدار'' تک کی بات اس لئے کی گئی ہے کہ تمام خضدار کا علاقہ اُسے نہیں دیا گیا۔ اور دوسرے مواضعات دیگر مقامی قبیلوں کے تصرف میں تھے۔

4۔ کمبر، قبیلے کا گہدائی تھا، اُس کے باپ کا نام ''سلیمان'' تھا۔ ایلتا زئی خوانین کا داماد تھا۔ خان میر ایلتا ز خان کی طرف سے میر بجار براہو کی مدد کو بھیجے جانے والے لشکر کا کماندار تھا۔ میر احمد اور میر محراب ایلتا زئی اپنے لشکر کے ساتھ انہی کی کمان میں لڑے۔ انہی کے نام کی نسبت سے ان کا لشکر اور حمایتی نئے قبیلہ ''کمبرانی'' کے نام سے تشکیل پا گیا۔ اسی نسبت سے خوانین قلات کمبرانی بھی کہلاتے ہیں۔

ژ۔ مغلوں کی آمد

آخوند اپنے مفروضہ کتابچہ میں آگے لکھتے ہیں :

" میر بجار کی وفات کے بعد مغلوں نے آ کر قلات پر قبضہ کیا۔ ایک عرصہ کے بعد مغلوں نے قلات کے دھواروں کے ساتھ قسم واقسام کیا کہ ایک دوسرے کو تلوار ، بندوق، نیزہ، چھرا، زہر، پتھر، روڑا، لکڑی اور جوتے سے نہیں ماریں گے تا کہ ہمارے درمیان دوستی قائم رہے۔ چونکہ مغلوں کا شعار ہی ظلم کرنا تھا۔ دست تظلم دراز کرنا شروع کیا۔ قلات کے دھواروں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہر قسم کے ہتھیار اور زہر وغیرہ سے نہ لڑنے کی ہم نے قسم اُٹھائی ہے اگر ان سے ہم مغلوں کو ماریں گے تو حق تعالیٰ کے ہاں ماخوذ ہوں گے۔ پس اتفاق اس پر ہوا اور انہوں نے باجرے (ارڑن) کی موٹی اور سخت روٹیاں پکائیں۔ ان روٹیوں کو کچھ دنوں تک سورج کی گرمی میں رکھ کر خشک کیا۔ پھر ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک روٹی بغل میں چھپائی اور مغل حاکم کے سلام کو گئے اور ایک ساتھ انہوں نے مغل پر حملہ کر دیا۔ ان میں سے ہر ایک نے بغل سے روٹی نکالی اور مغل کو

مارا۔ بال آخر مارتے مارتے اُسے ہلاک کردیا۔

چنانچہ اب ان دہواروں کو ڈوڈ کی کہتے ہیں۔"(1)

گذشتہ صفحات میں براہوجدگال جنگ کی رزمیہ داستان اور دیگر تاریخوں کے حوالہ سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ قلات کی حاکمیت پر میر احمد خان ایلتا زئی، میر بجار کی زندگی اور موجودگی میں خانی قلات کے منصب پر بیٹھا اور یہ سال 1666ء کا تھا۔ جس پر تاریخ قلات کے تمام محققین اور مصنفین کا اتفاق ہے اور خوانین قلات کا ریاستی ریکارڈ اس پر سند ہے اور خان میر احمد یار خان بلوچ نے اپنی تمام تصانیف میں اس کی تصدیق کی ہے۔ میر احمد کی خانی سے لیکر قیام پاکستان تک قلات پر خوانین قلات کی حکمرانی کا سلسلہ کہیں بھی نہیں ٹوٹا ہے۔ تو پھر یہ مغل کہاں سے آ گیا جس کا نہ کوئی نام ہے نہ اُس کے ملک کا پتہ ہے کہ کہاں سے آ گیا اور کیسے آ گیا۔ راستے میں کئی علاقے، ملک، شہر، سرداریاں تھیں۔ کسی سے سروکار نہ رکھا۔ نہ لشکر نکلا، نہ لشکر آیا، نہ لڑائی ہوئی نہ کوئی زخمی ہوا نہ کوئی مرا، کچھ بھی نہیں ہوا اور ایک عدد مغل قلات پر نازل ہوا اور قابض ہوا۔ مغل ایک لاوارث دربہ در فقیر نہیں تھا۔ مغل روئے زمین پر وسطی ایشیاء سے اٹھتا ہوا ایک تباہ کن طوفان تھا۔ جس کے آگے چین کے یاجوج ماجوج بھی نہ ٹھہر سکے، مشرق سے مغرب کے یونان تک یہ ایک آسمانی عذاب کی طرح دھاڑتا ہوا، چنگھاڑتا ہوا، لتاڑتا ہوا، جلاتا ہوا، سروں کے مینار کھڑا کرتا ہوا، قلعوں، شہروں، معبدوں،

1۔ ایضاً صفحہ 29۔ نیز واضح ہو کہ مذکورہ قسم کی روٹی کو ڈھڈ کی کہتے ہیں، "ڈوڈ کی" نہیں۔ ڈھڈ کی سے "ڈوڈ کی زئی" نہیں بن سکتا۔ یہاں بھی دروغ گوئی اپنا اظہار خود کر رہی ہے۔

عبادت گاہوں، بازاروں، فصلوں کو نیست و نابود کرتا ہوا جاتا تھا۔ اور کہیں کوئی اسے لگام دینے والی طاقت پیدا نہ ہو سکی۔ اور یہ مغل جب قلات کا رخ کرتا ہے تو ایک مریل سے گھوڑے پر سوار ہو کر اکیلا، تن تنہا، ہر قسم کے ہتھیاروں حتیٰ کہ لکڑی، جوتے اور روڑے سے بھی خوفزدہ ہو کر بڑی متانت اور پیار سے ہنستا ہوا مسکراتا ہوا میر دہوار صاحب کے سایہ عاطفت میں قلات کی حاکمیت کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور دہواروں سے دست بستہ عرض کرتا ہے کہ خدا اور رسول کیلئے میرے ساتھ لڑائی نہ کرو اور ہر قسم کی ضرر رسان اور غیر ضرر رسان ہتھیار سے نہ لڑنے کی قسم کھالو تا کہ میں تمہارے صدقے قلات کے باقی ہزاروں لوگوں پر دبدبے سے حکمرانی کروں۔۔۔۔۔۔ واہ رے آخوند صاحب! تاریخ کوئی لکھے تمہاری طرح۔ تم میں کم از کم اتنی عقل ہوتی کہ اس طریقے سے کوئی اجنبی کسی خالی پلاٹ پر قبضہ نہیں کر سکتا جس طرح تم نے کسی دہوار کے ڈکٹیشن پر قلات کی حاکمیت پر بے نام مغل کو قبضہ دلایا۔ اگر آخوند صاحب اپنی زندگی میں یہ تاریخ اور خصوصاً مغل حکمرانی کا مذکورہ بیان کسی بھی مغل کو دکھاتے تو وہ اس مغل کی شان میں لکھے گئے واقعہ پر آخوند کا ٹکا بوٹی کر دیتا تھا۔

اب ذرا آگے دیکھیں کہ جب مذکورہ مغل دست تظلم دراز کرنا شروع کر دیتا ہے جسکی کوئی تفصیل نہیں دی گئی ہے تو دہوار لوگ آپس میں مشورہ کر کے اُسے مار ڈالنے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ قلات کوئی ملک نہیں ہے اور اُس میں چند دہواروں کے علاوہ کوئی ایک متنفس بھی نہیں کہ مغل قلات پر قبضہ کر کے صرف دہواروں سے دربار لگاتا ہے، خطرہ بھی اُسے ان کمزور کسان دہواروں سے ہے

جن کے پاس نہ اسلحہ ہے نہ عددی اکثریت۔ پھر بھی اُن سے لڑائی نہ کرنے کا معاہدہ کرتا ہے۔ معاہدہ بھی اس قسم کا کہ روئے زمین کی کسی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ خیر۔۔۔۔۔جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچاؤ!

آپس میں مشورہ کے بعد دہوار وفد باجرے کی روٹیوں کا تباہ کن اسلحہ بغل میں چھپا کر مغل کے سلام کو جاتے ہیں۔ اور پھر روٹیوں کے گرینڈوں سے اس "بادشاہ" پر حملہ کرتے ہیں۔ نہ بادشاہ کا کوئی دربان ہے، نہ وزیر، نہ کبیر، نہ فوج نہ لشکر، نہ باڈی گارڈ، نہ چمچے سردار نہ میر اور معتبر کچھ بھی نہیں۔ اوپر اللہ ہے، نیچے غازی دہوار اور "لاوارث مغل بادشاہ" اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ مغل بادشاہ مرگیا۔ لیکن دہواروں میں سے کوئی بھی حکمران نہ بن سکا۔ شاید وہ اپنے اس "لاوارث مغل بادشاہ" سے بھی گئے گذرے تھے۔ آخوند صاحب پھر ان غازی دہواروں کیلئے ایک خصوصی نئی قوم "ڈوڈکی" کی تشکیل کرتے ہیں تاکہ آنے والی نسل ان ڈوڈکیوں کو پہچان لے کہ مغل کو حکمرانی سے بیدخل کرنے والے بھی جانباز تھے۔

آخوند نے دہواروں کے کہنے پر "ڈوڈکی" کی جو وجہ تسمیہ روٹیوں سے منسوب کی ہے وہ دیگر مفروضوں کی طرح ایک خود ساختہ کہانی ہے۔ "ڈوڈکی" پنجاب سے آنے والا ایک چھوٹا گروہ تھا جو ڈیرہ غازی خان کے تونسہ کے موضع "ڈوڈک" سے آیا تھا اور دہواروں کی قلات اور مستونگ میں آنے سے قبل موجود تھا۔ جو ایک قدیم نسلی بلوچ قبیلہ چکازئی کا ہمسایہ بنا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ دہوار قبیلہ کا ایک حصہ بنا۔ ساتویں صدی عیسوی سے بھی قبل کشمیر، ہندوستان اور پنجاب وسندھ سے بیسویں

جاٹ، گوجر اور راجپوت اور کشمیری طائفے یا گروہ بلوچستان کی سمت چلے آئے تھے جو عراق تک پھیل گئے تھے۔ بلوچستان کے پورے علاقے میں ان کی آبادکاری کے آثار موجود ہیں اور بیسویں گروہ اپنے اصل قبیلوں کے ناموں سے بلوچ قبائل میں موجود رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کاشی، منگولی، پھول، کوشک، ناگ، بھیل، گونڈ، کوتر، نیتال، بل، چنال، گوجر، بیدی، منگر، سامی، مہیر، ارمڑ، تھرت، کولی، راٹھور، مشکی، ڈھڈی، ڈوڈکی، کنجر، کوری، اوڑ، نہنگ، سوڈ، کسر، لنگاہ، ہنگو، گولا، کھٹانہ، گور، ڈھنڈ، مہر، پروار، کنٹ، گورو، ڈوم، جھالوار، ونگ، وغیرہ، ڈوڈکی بھی انہیں میں سے ایک ذات تھا۔ ان ڈوڈکیوں کی اولاد وغیرہ پھر ڈوڈکی زہی کہلائی جو اب نمایاں نہیں رہے۔

س۔ میر حسن خان کی حکمرانی

اپنی بے مثال تاریخی شاہکار میں اس سلسلہ کو بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں :

" مغل کو مار ڈالنے کے بعد دہوار معتبرین میر ابراہیم کے پاس گئے جو کہ قمبرانیوں اور احمدزئیوں کا جدّ ہے(1) انہوں نے میر ابراہیم خان سے کہا کہ مغل دہواروں پر ظلم کرتا تھا۔ ہم نے اس کو قتل کر دیا ہے اب آپ کے پاس آئے ہیں کہ اپنے بیٹوں میں سے ایک کو ہم دہواروں کے ساتھ کر دیں کہ اُسے لے جا کر ہم قلات کا حاکم بنائیں۔ میر ابراہیم خان نے اپنے نواسے میر حسن

خان کو دہواروں کے ساتھ بھیج دیا۔ دہواروں نے اُسے
قلات لاکر حاکم بنادیا۔
میر حسن خان نے دہواروں سے کہا کہ میرے
(مویشیوں اور گھوڑوں) کے گھاس اور میرے مہمانوں
کے ہیزم کے اخراجات کا کیا بندوبست ہوگا۔ اور میرے
مکانوں کی مرمت اور گلکاری کا کیا بندوبست ہوگا۔
دہواروں نے یہ تمام اخراجات اپنے ذمہ لئے اور کہا کہ ہم
دیں گے چنانچہ اب تک اپنے گفت کے مطابق یہ
خدمات دہوار بجالاتے ہیں۔ میر حسن خان، میر گہرام کا بیٹا
اور میر ابراہیم خان کا نواسہ تھا جیسا کہ سلسلہ نسب احمدزئی
میں درج ہے۔" (2)

آخوند نے اپنی اس کہانی میں میر بجار کی وفات کے بعد کسی بے نام اور لاوارث مغل کو قلات پر حکمران دکھایا۔ جو ایک دروغ گوئی ثابت ہوا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ جب دہوار غازیوں نے مفروضہ مغل حاکم کو مار دیا تو چونکہ خود اُن میں مقتول لاوارث اور غریب الدیار مغل کے بھی برابر کا کوئی شخص نہیں تھا جو قلات کی یتیم گدی کے لائق ہوتا اس لئے وہ احمدزئیوں کے اجدّاد میں سے میر ابراہیم کے پاس گئے اور اُس کے نواسے میر حسن کو اپنے ساتھ لاکر حاکم قلات بنادیا۔ براہوجدگال جنگ کی رزمیہ داستان میر حسن خان کو میر بجار کے اجداد سے تباتی ہے۔ اس کے مصرعے 26 سے

28 تک کا ترجمہ یوں ہے :

" وہ (میر بجار) میر حسن خان کی بنیاد سے تھا۔
کمبرزئیوں کا عزیز اور رشتہ دار تھا گہرام اور براہیم کا
بہترین سوغات تھا۔"

میر احمد، احمدزئی خوانین اور احمدزئی قبیلہ کا جدّ تھا جو میر بجار کا ہمعصر اور اُس کا جنگی اتحادی تھا۔ جو بجار کی سرکردگی میں جدگالوں سے لڑی جانیوالی جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد قلات کی خانی پر 1666ء میں جلوہ افروز ہوا۔ آخوند کے اپنے دیئے گئے شجرے میں میر بجار کا ہمعصر میر احمد اپنے جدّ میر حسن خان (جو بجار کا بھی جدّ ہے) سے گیارہ پشت پیچھے ہے اگر ہر پشت کو پچیس سال دیئے جائیں تو میر حسن خان اپنے میر احمد اور میر بجار سے دوسو پچھتر سال قبل کی شخصیت ہوگی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میر بجار کے بعد وہ قلات کا حکمران بنا۔ آخوند کا دیا گیا شجرہ نسب درج ذیل ہے :

" میر احمد (میر بجار کا ہمعصر) ولد میر ایلنا زولد میر کیچی ولد میر ایلنا زولد میر احمد ولد میر قیصر ولد میر سوڈ و ولد میر احمد ولد میر کمبر ولد میر ملوک ولد میر سنجر ولد میر حسن (ولد میر گہرام ولد میر براہیم)" (3)

علاوہ ازیں اگر ہم آخوند کی مغل حکمرانی کے بیان کا بھی جائزہ لیں جسے وہ میر بجار کی موت کے بعد برسر اقتدار بتاتا ہے اور میر حسن کی حاکمیت سے چند روز یا چند ماہ قبل اُسے مقتول لکھتا ہے۔ تو مغل کی قلات پر حکمرانی کا عرصہ بھی یہی دوسو پچھتر سال بن جاتا ہے جو دنیا کی کسی تاریخ سے ثابت نہیں کی جاسکتی۔ یہ تمام تجزیے اور شواہد آخوند کی

نگارشات کو بے بنیاد اور مبنی پر دروغ ثابت کرتے ہیں۔

مزید آخوند نے جس میر حسن کو قلات کی حکومت پر بٹھایا اُسے وہ ایک جنگلی چرواہے یا دیواروں پر گلکاری کرنے والے ایک مزدور کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ آخوند اور دہوار جانبازوں کا "شاہ قلات" پریشان ہے کہ اگر وہ بادشاہ بنے گا تو اُس کے مال مویشیوں کیلئے گھاس کون کاٹ کر لائے گا۔ اور اُس کے ٹوٹے پھوٹے مکان کی پلستر کاری کون کرے گا۔ کیوں کہ اس دیہاتی کو بادشاہ بنا کر قیدی بنالیا گیا۔ اس کے برعکس براہوجدگال جنگ کی داستان میں میر بجار اس بات پر فخر کرتا ہے کہ وہ میر حسن کے سپوتوں سے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر حسن ایک اُجڈ دیہاتی اور چرواہا نہیں تھا جیسے کہ آخوند نے اُسے پیش کر دیا ہے۔ حقیقت میں آخوند کی پوری کتاب ایک احمقانہ اور غیر حقیقی قلم کشی کے علاوہ کچھ نہیں۔

حواشی :

1۔ میر ابراہیم خان، کمبرانیوں کے اجداد میں سے نہیں تھا۔ میر کمبر خود قبیلہ کا کہدائی تھا۔ اور ایک لڑاکو شخص تھا۔ کولواہ کا رہنے والا تھا۔ خوانین قلات ایلتا زئیوں کا داماد تھا۔ میر احمد وغیرہ جنگ میں اُسی کی کمان میں لڑے۔ اس لئے کمبرانی کہلائے۔ میر ابراہیم کی نسل سے نہیں تھا۔

2۔ کتاب ایضاً صفحہ نمبر 30۔

3۔ کتاب ایضاً صفحہ 22-21۔

ش۔ لاولد میر حسن

میر گل خان نصیر نے اپنی تصنیف "تاریخ بلوچستان" صفحہ نمبر 14 پر لکھا ہے کہ میر حسن لاولد فوت ہوئے تھے۔ یہی بات ان کے اخلاف کے خانِ بلوچ میر احمد یار خان بلوچ نے اپنی کتاب "مختصر تاریخ قوم بلوچ اور خوانین بلوچ" کے صفحہ 36 پر لکھی ہے۔ جسے دیگر خوشہ چینوں نے بھی بار بار دھرایا۔ جبکہ براہوجدگال جنگ کی رزمیہ داستان اس کی تردید کرتے ہوئے میر حسن کو ملک بجار کے اجداد سے بتاتی ہے۔ جس سے اُس کے لاولد ہونیکی مفروضہ بات غلط ٹھہرتی ہے۔ خود آخوند محمد صدیق نے اپنی کتاب میں خوانین قلات کا جو شجرہ دیا ہے اُس میں اُس کا بیٹا سنجر نامی دیا ہوا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ محولہ بالا مصنفین کا دعویٰ بے بنیاد مفروضہ ہے اور نظم کے واقعات حقائق پر مبنی ہیں اور میر حسن لاولد نہیں تھا۔

ص۔ لاولد میر بجار

میر گل خان نصیر نے اپنی تصنیف "بلوچستان، قدیم و جدید تاریخی کی روشنی میں" کے صفحہ 148 پر لکھا ہے کہ میر بجار لاولد مرا اور اُس کے بعد قوم کی سرداری میر کمبر کو ملی۔ گل خان نصیر کا بیان غلط اور اُس کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ مشکئے کا میروانی سردار قادر بخش میروانی اسی میر بجار کی نسل سے ہے۔ انہوں نے اس کی واضح طور پر تردید کی اور بطور ثبوت درج ذیل شجرہ نسب عنایت کیا۔ جس میں میر بجار کا بیٹا میر

دوستین کا نام دیکھا جاسکتا ہے۔ جو بجار کے بعد قبیلہ کا سردار بنا تھا :

" سردار قادر بخش ولد سردار نصر اللہ ولد سردار موسیٰ
خان ولد سردار ملک دینار ولد سردار عبدالکریم ولد سردار
فیروز ولد سردار بھائیاں ولد سردار میاں خان ولد سردار فقیر محمد
ولد سردار دوستین ولد سردار میر بجار ولد سردار میر عمر ولد
سردار میر وخان براہو میروانی رئیس"

جناب گل خان نصیر کا یہ کہنا بھی ایک مفروضہ ہے کہ بجار کے بعد سرداری کسی میر کبر کو ملی۔ میر کبر نامی کوئی شخص میروانی سرداروں میں نہیں گزرا ہے۔ میر کبر خوانین قلات کے سلسلہ نسب میں آتے ہیں۔ میروانی سلسلہ نسب، میر ابراہیم سے الگ ہوجاتا ہے، اور اس نسبی سلسلے میں سردار قادر بخش میروانی تک کسی کا نام کبر نہیں رہا ہے۔

تخت سلیمان

تخت سلیمان، دراصل کوہ سلیمان کی 11200 فٹ اونچی چوٹی کو کہتے ہیں اس بلند و بالا سلسلہ کوہ کے مغربی طرف افغانوں کا علاقہ کاکڑ خراسان ہے اور اس کے مشرقی طرف بلوچ قبائل رہتے ہیں جو 1200 مربع میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تخت سلیمان کے بارے میں یوروپی مصنفین نے بقول اُن کے علاقائی روایتوں کے حوالہ سے لکھا ہے :

" اس کے متعلق بہت سی اساطیر مشہور ہیں۔ بعض
کے مطابق حضرت نوح کی کشتی طوفان کے بعد یہاں آ کر
ٹھہری جبکہ دیگر اسے حضرت سلیمان سے منسوب کرتی ہیں
جو روایات کے مطابق ایک دفعہ بلقیس نامی خاتون سے
شادی کرنے کیلئے ہندوستان آئے۔ اپنی دلہن کے ساتھ
ہندوستان سے تخت پُراں پر واپس جاتے ہوئے خاتون
نے حضرت سلیمان سے ذرا توقف کرنے کی استدعا کی
تاکہ وہ اپنے وطن پر آخری حسرت بھری نظر ڈال سکے۔
چنانچہ تخت اُس چوٹی پر اترا اور اُس وقت سے اس کا نام
تخت سلیمان پڑ گیا۔"(1)

مذکورہ بالا روایت یا کہانی دیگر سینکڑوں مفروضوں کی طرح ایک مفروضہ ہے۔ تعلیم وتاریخ سے بے بہرہ عوام میں علاقائی ناموں کے بارے میں من گھڑت کہانیاں مشہور کی جاتی ہیں۔ جو پھر سینہ در سینہ سفر کرتے ہوئے قلم کی نوک تک پہنچ جاتی ہیں۔ حضرت نوح کی کشتی اور طوفان کی اور بھی روایتیں مشہور کردی گئی ہیں۔ مثلاً لسبیلہ کے تاریخی آثار قدیمہ ''شہر روغان'' کی پہاڑی کی ایک چوٹی کٹی ہوئی اور درمیان سے اُس میں ایک بڑا شگاف پڑ گیا ہے۔ جس کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی اس چوٹی سے ٹکرا گئی تھی اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں بیچ سے ٹوٹ کر کشتی کیلئے راستہ بن گئی تھی۔ اسی طرح حضرت سلیمان اور اس کے تخت پر ان کی کہانی بھی پہاڑ کے نام کی نسبت سے گھڑلی گئی ہے۔ یاد رہے کہ لفظ تخت، قدیم کُردی (موجودہ مشرقی بلوچی، سندھی اور ہندی الفاظ کو نکال کر) کا لفظ ہے جس کے معنی پہاڑی سطح مرتفع کے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں زمینی سطح مُرتفع ''سَند'' کہلاتا ہے۔ مذکورہ دونوں الفاظ سرکاری زبانوں کے اثر سے بچے ہوئے بلوچ آج بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ تخت کسی تخت پراں یا پلنگ کو نہیں کہتے۔ بلوچستان کے اندرونی علاقوں میں کئی پہاڑوں پر ایسے ہموار قطعات ہیں جنہیں تخت کہا جاتا ہے۔ سراوان کی ہربوئی اور ساروان پہاڑی سلسلہ پر تین ایسے قطعے ہیں۔ جو تخت کہلاتے ہیں۔ ایک تخت والی پہاڑی کے دامن کا موضع بھی ''تخت'' کہلاتا ہے۔ ایسے ہی دو بڑے قطعات کوہ سبز پر مختلف فاصلوں پر واقع ہیں وہ بھی تخت کہے جاتے ہیں۔ خضدار کی مشرقی پہاڑ ''علوائی'' پر بڑا قطعہ ہے جو علوائی تخت کہا جاتا تھا جسے موجودہ لوگ

''دشت'' کہتے ہیں۔ حالانکہ پہاڑی ہموار قطعات کیلئے دشت کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ فارسی زبان میں ''تخت'' کے معنی ''چوکی'' کے بھی ہیں۔

رہا لفظ ''سلیمان'' جو ایک عام عربی نام ہے۔ سلیمان، ایک قدیم کُرد طائفہ ہوتا تھا۔ جو اب بلوچستان میں معدوم ہے۔ تُرکی کے مشرقی سرحد پر ایرانی سرحد کے قریب آباد کرد قبائل میں یہ قبیلہ قلیل تعداد میں اب بھی ہے۔ عراقی اور تُرکی کردوں میں کئی ایسے قبیلے ہیں جو بلوچستان کے قدیم بلوچ مواضع کے ناموں کی نسبت سے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ ان کے اجداد بلوچستان سے آئے ہوئے ہیں۔ ان قبائل میں ایک قبیلہ ''سلیمانی کرد'' ہے جنہوں نے ''سلیمانیہ'' بسایا تھا۔ اس کے علاوہ مینگر، گورانی، زیباری، کیچی طائفے بھی ہیں۔ جو بالترتیب بلوچستان کے قبیلہ مینگل، گوران، سے متعلق (2) زیبار، سے متعلق اور کیچ سے متعلق رہے ہیں۔ (3)

پچھلے صفحات میں ہم نے یاد دلایا تھا کہ سن عیسوی کی آٹھویں صدی کی ابتداء تک مستونگ سے ہرات ولحقہ علاقوں تک تاحد مغرب رباط تک ایک قدیم بلوچ ملک بنام ''بیلوس'' ہوا کرتا تھا جس میں سینکڑوں بلوچ قبائل بود و باش رکھتے تھے ان میں کرد بلوچوں کا قبیلہ ''سلیمان'' بھی ہوتا تھا۔ جو بیسویں دیگر بلوچ قبائل کے ساتھ ایران، ترکی، عراق وغیرہ کی سمت نقل مکانی کر گئے تھے۔ موجودہ کردستان کے بے شمار قدیم طائفے جن کے نام بلوچستان اور قدیم ملک بیلوس کے مواضعات سے نسبت رکھتے ہیں وہاں کے بڑے قبائل کے حصے ہیں۔ وہ مواضعات تاحال اپنے قدیم ناموں سے یہاں موجود ہیں۔ (4)

حواشی :

1۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز، کوئٹہ پشین ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء موضوع ''مزارات''۔

2۔ ''گوران'' نام کے کئی دشت اور پہاڑی مواضع بلوچستان کے پورے خطے میں ملتے ہیں۔ مری بگٹی علاقہ، ضلع چاغی، ایرانی بلوچستان کے مختلف مقامات اور کردستان ،قلات، پنجگور، اور ایرانی سیستان وغیرہ میں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قدیم نسلی بلوچ قبیلہ تعداد میں بہت زیادہ ہوگا۔ موجودہ وقت میں اس کے گنے چنے گھرانے مغربی بلوچستان کے زاہدان کے دیہاتوں میں موجود ہیں نیز دیکھئے موضوع ''مینگل'' کا اشاریہ نمبر 8۔

3۔ زیبار نام کا قدیم قبیلہ بھی اُن نسلی بلوچوں سے تھا جو ملک بیلوس میں آباد تھے۔ اس کے نام کا موضع قلات اور مستونگ کے مغربی کوہستان میں موجود ہے۔ کیچ مکران کے جنوبی پہاڑی سلسلے میں کئی مواضع قدیم کرد بلوچ قبائل کے ناموں سے منسوب ہیں۔ ملان کا پہاڑی سلسلہ ''ملان'' کرد قبیلہ کے نام پر ہے۔ خود کیچ کا مرکزی شہر تربت (تُربہ) گاؤں آبسر (آبسال) اور میدان ''شوش'' (سوس) اور ''زامووران'' قدیم کرد قبیلوں کے اسماء پر ہیں۔ زامووران میں ایک قدیم موضع اصل قبیلہ ''کُرڈ'' کے نام پر موجود ہے۔

4۔ ملک ''بیلوس'' اور اس کے چند معلوم قبائل کے بارے میں موضوع ''رئیسانی'' کا اشاریہ نمبر 6 دیکھیں۔

ٹالپُر

ٹالپُر بلوچ قبیلہ سندھ کا تاریخی حکمران قبیلہ رہا ہے۔ جو عام طور پر ''میران سندھ'' کہلاتے ہیں۔ ہر معزز و باوقار بلوچ ''میر'' کہلاتا ہے۔ اس ''میر'' کو بعض گوجر مؤرخین نے گوجر طائفہ ''میر'' بنا کر لکھا کہ سندھ میں گوجروں کی مضبوط حکومت رہی ہے جو میر کہلاتے تھے۔ حالانکہ قبیلہ کا ''میر'' نام سے پہلے نہیں آخر میں لکھا جاتا ہے۔ جب کہ بلوچوں کا اعزازی خطاب نام سے پہلے استعمال ہوتا ہے۔ (1)

بلوچوں کا یہ قبیلہ ہوت نسل سے ہے اور تمن لغاری سے رہا ہے جو ابتداء میں ڈیرہ اسماعیل خان میں سکونت رکھتے تھے۔ قبائلی عناد کے نتیجے میں چند گھرانے میر شہداد خان کی سربراہی میں سندھ منتقل ہوگئے۔ سندھ منتقل ہونے سے قبل ان کا طائفہ ٹالپر ''ایک گمنام طائفہ تھا اور اس طائفہ کے لوگ ''لغاری'' کے قبیلائی نام سے جانے جاتے تھے۔ مرکز سے علیحدہ ہو کر یہ گھرانے اپنے طائفہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ''سندھ کے تالپور حکمران'' نامی کتاب میں اس کے سرائیکی زبان بولنے والے مئولف جناب مولانا نور احمد خان فریدی نے یہ مفروضہ اختراع کیا ہے :

" جب میر اسماعیل خان (2) کا انتقال ہوا تو جانشینی کے
مسئلہ پر اس کے دو شہزادوں میر ابراہیم خان اور میر غلام
حسن خان میں خوب رسہ کشی ہوئی۔ انجام کار میر ابراہیم
خان کامیاب ہو کر ریاست کے حکمران قرار پائے اور میر
حسن خان آزردہ ہو کر مع اعزا و اقربا میر رانی حکومت کی
پناہ میں ڈیرہ غازی خان منتقل ہوئے اور بمقام چوٹی بالا
میں آباد ہو گئے چونکہ ابتداء میں مکانات کی کمی تھی۔ اس
لئے میر غلام حسن خان شیشم کے ایک گنجان درخت کے
نیچے کچہری لگایا کرتے تھے۔ سرائیکی زبان میں شیشم کو
ٹالھی کہتے ہیں۔ اور مجمع کو پور سے موسوم کرتے ہیں۔ اس
لئے ٹالھی کی نسبت سے چوٹی بالا کے گردو پیش ان
سرداروں کو ٹالھی پور کہنے لگے۔ یہی لفظ بعد میں کثرت
استعمال سے "تالپور" بن گیا۔" "تالپور کی دوسری توجیہ
یہ کی جاتی ہے کہ یہ لوگ میر ٹالھے خان بن میر زنگی خان بن
میر بجار خان کی اولاد ہیں یعنی تالپور بمعنی پسران ٹالھے
خان۔"(3)

مولانا موصوف کا مذکورہ بیان تاریخی طور پر غلط اور لسانی جذبہ کے تحت گھڑا ہوا مفروضہ ہے۔ قبائل کے نام درختوں کے سائے میں کچہری لگانے سے وجود میں

نہیں آتے۔ اور پھر مذکورہ طائفہ صدیوں سے اسی نام سے مختلف خطوں میں بود و باش رکھتا تھا۔ پورے کا پورا طائفہ بلوچستان سے ہجرت کر کے ڈیرہ جات چلا نہیں گیا تھا بلکہ اس کے چند گھر بلوچستان کے بارکھان میں لغاریوں سے سندھ و پنجاب جانے سے قبل منسلک تھے۔ چونکہ یہ ایک منتشر اور گروہوں میں بٹا ہوا طائفہ تھا۔ اس لئے کسی ایک قبیلے کا حصہ نہیں تھا بلکہ مختلف خطوں میں مختلف بڑے قبیلوں سے منسلک تھا۔ اور اسی قدیم نام "ٹالبر" (ٹالپر یا تالپور نہیں) کی شناخت کے ساتھ منسلک رہا ہے۔ اس طائفے کی صدیوں پرانے باقیات آج بھی مکران، آواران، سیستان، خاران اور کوہستان مری بگٹی اور سراوان میں چھوٹے گروہ کی صورت میں "ٹالبر" ہی کے نام سے موجود ہیں۔ نہ اس طائفے کی تشکیل سندھ و پنجاب میں ہوئی ہے اور نہ اس نام کا "ٹالھی" وغیرہ سے کوئی نسبت ہے۔ مولانا صاحب نے اس کی وجہ تسمیہ محض سرائیکی زبان سے لگاؤ کے جذبہ کے تحت کیا اسی لسانی جذبہ کے تحت بلوچ تاریخ نویس میر گل خان نصیر نے "مستونگ" کے تاریخی نام کو "کردی (براہوئی) زبان کا نام بتا کر "مش تنگ" کا مفروضہ گھڑ لیا اور لکھا کہ کثرت استعمال سے یہ مستونگ بن گیا ہے۔ ایسے لسانی تعصب کے زیر اثر لکھنے والے تاریخ کا چہرہ مسخ کرتے ہیں اور اپنے قلم کی عصمت کو مجروح کرتے ہیں۔ یہ لسانیت ہی کی پیروکاری ہے کہ اکثریتی اقوام کا ریاستی مقتدرہ اپنی ریاستی قوت کے بل بوتے پر اقلیتوں کی زبان اور ثقافت کو زیر کرنا چاہتا ہے اور ان کی قومی شناخت کے خاتمے کیلئے انہیں اپنی قومیت اور شناخت میں مدغم کرنے کے ظالمانہ اقدامات اپناتا ہے۔ اسی پالیسی کا نام طاقتور ممالک نے "قومی دھارا" رکھا ہوا

ہے یعنی ہر جائز و ناجائز طریقے سے لسانی اقلیتوں کو اکثریتی قومیت کے سمندر میں غرق کردو۔ یہی ذہنیت قلمکاروں نے بھی اپنایا ہوا ہے جو بہت ہی قابل مذمت ہے۔

" ٹالپر" ہوت قبیلہ کا ایک قدیم طائفہ رہا ہے۔ اس لفظ یا نام کے معنی "شاخ کاٹنے والا"۔ روایت ہے کہ جنگوں کے دوران ہوتوں کے ایک گروہ کو سواری اور بار برداری کے جانوروں کے لئے چارہ بہم پہنچانا ہوتا تھا مذکورہ گروہ درختوں سے نازک شاخیں کاٹ کاٹ کر جانوروں کیلئے لاتا تھا۔ اسی خدمت کی نسبت سے مذکورہ گروہ "ٹالپر" مشہور ہو گیا اور پھر یہ گروہ ہوت کا ایک طائفہ تشکیل پا گیا۔ نام میں قدرے تبدیلی سندھ میں آباد ہونے کے بعد دیکھا گیا۔ بلوچستان میں اب بھی یہ طائفہ "ٹالپر" ہی کہلاتا ہے۔ کچھ مصنفین نے جیسے کہ "ہسٹری آف پرشیا" میں میلکم نے غلط مفروضہ قائم کر کے انہیں ہندی نسل سے لکھا ہے جس پر تنقید کرتے ہوئے سردار خان گشکوری نے لکھا :

" ٹالپر ایک خالص بلوچ نسلی طائفہ ہے اگرچہ ملکی سیاست میں اس کا کوئی قابل ذکر کردار دیکھنے کو نہیں ملتا۔ لیکن بعد میں بطور حکمران انہوں نے بلوچ ناموس میں کافی اضافہ کیا۔ ان کے خالص بلوچ خون ہونے سے کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔" (4)

حواشی :

1۔ کشمیری مؤرخ قبیلہ "میر" کو مغل نسل بتاتے ہیں۔ تاریخ حیدرآباد دکن کے مئولف علامہ محمد نجم الغنی خان رامپوری لکھتے ہیں :

" فرمانروایان حیدرآباد تاتاری نسل سے ہیں۔ اور ان کے ناموں کے ساتھ "میر" ترکی لفظ ہے اور اس کے معنی افسر اور سردار کے ہیں۔ "

مردم شماری رپورٹ بابت انڈیا 1911ء کے جلد 20، موضوع "کشمیر" حصہ دوئم صفحہ 205 پر لکھا ہے کہ :

" وہ مغل جو خراسان اور ترکستان سے کشمیر میں آئے تھے وہ سات جتھے تھے اور ان میں پہلا جتھہ "میر" کا تھا۔ "

اسی رپورٹ کے صفحہ 126 پر لکھا ہے کہ وہ کاشتکار ہیں۔ تاریخ اقوام کشمیر میں محمد الدین فوق لکھتے ہیں :

" پنجاب میں وہی خاندان میر کہلاتے ہیں اور اپنے ناموں سے پہلے میر لکھتے ہیں جو سیّد یا میرانی ہیں۔ لیکن کشمیر میں جو میر اپنے نام کے بعد میر لکھتے ہیں وہ مغل ہیں

اور کشمیر میں مغل میروں کے علاوہ کوئی دوسرا میر نہیں ہے۔" (صفحہ 378)

2۔ فرمانروا و بانی ڈیرہ اسماعیل خان مراد ہے۔

3۔ سندھ کے تالپور حکمران از مولانا نور احمد خان فریدی، مطبوعہ قصر الادب، رائیٹرز کالونی ملتان صفحہ 12۔

4۔ "ہسٹری آف دی بلوچ ریس اینڈ بلوچستان" صفحہ 129، مطبوعہ نساء ٹریڈرز کوئٹہ۔

جام خاندان

جام خانوادے سے مراد سابق ریاست "لسبیلہ" (راس بیلہ) کے سابق حکمران ہیں۔ یہ خاندان کہاں سے آ گیا اور کب سے ریاست کا حکمران بنا۔ اس کی مبینہ بلوچ تاریخی روایت اور انگریزی مصنفین کی بیان کردہ روایتوں میں بہت تضاد پایا جاتا ہے حتیٰ کہ لگتا ہے کہ خود جامان کو اپنے اجداد اور شجرہائے نسب کے بارے میں حقیقی معلومات نہیں ہیں۔ کوئی حاکم اپنی نسل کو قریشی عرب بتاتا ہے، کوئی ہندوستان سے آنے والے ہندو جنہوں نے بعد میں مذہب اسلام اختیار کیا۔ برطانیہ دور کے مردم شماری رپورٹ میں ان کا قبیلہ بدل جاتا ہے۔ جبکہ قدیم بلوچی شاعری انہیں ہوت بلوچ بتاتی ہے یہ اپنے عالی خان اوّل کو 43-1742ء میں حکمران بتاتے ہیں جبکہ بلوچی شعری تاریخ کا عالی خان اوّل تقریباً سولہویں صدی عیسوی کی وسط میں حاکم لسبیلہ تھا۔ جو قبیلہ ہوت کے طائفہ "نوتک" سے تھا (1) ہوت قبیلہ کے سردار و حاکم سندھ و لسبیلہ میں "جام ہوت" (جاموٹ) کہلاتے تھے۔ (2)

گزیٹئر کے یورپی مصنفین نے لسبیلہ کی حاکیت کی ذیل میں لکھا ہے:

" لسبیلہ میں بُرفت (3) قبیلہ کے سردار پہاڑ خان کی حکومت تھی جس کے بعد یہ اقتدار عزت خان اور

اس کے بعد اس کے بیٹے کے ہاتھ آئی جو کمسن تھا۔ اس
لئے اختیارات کا استعمال اس کی ماں بی بی چھاگلی کرتی
تھی۔ لیکن جاموٹ قبیلہ کے سردار جام علی خان (4) نے
خان قلات میر محبت خان سے لسبیلہ کی حکمرانی حاصل
کرنے کیلئے مدد چاہی (5) خان نے آخوند ملا محمد حیات
کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجی۔ اس طرح جام علی خان
اقتدار لینے میں کامیاب ہوا۔ یہ واقعہ 43-1742 کا
ہے"(6)

اسی سلسلے میں آگے لکھتے ہیں :

" یہ (حکمران) خاندان کا دعویٰ ہے کہ وہ قریشی
عرب ہیں اور عبدالمناف کی نسل سے ہیں"(7)

یعنی مذکورہ روایت جام خاندان کی اپنی بیان کردہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ گزیٹر مصنفین سے جام خاندان نے اپنی زبانی کہا ہے مذکورہ روایت درحقیقت وہی قریشی عرب ہونے کی روایت ہے جو رندوں کی قدیم بلوچی شاعری میں بیان کی گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اور بعض دیگر بلوچ قبائل اپنی نسل امیر حمزہ سے روایت کرتے ہیں جنکی کوئی نرینہ اولاد ثابت ہی نہیں ہے اور بعض عبدالمناف سے ۔ عبدالمناف نبی صلعم کے دادا کے دادا تھے۔

اپنی "تاریخ بلوچستان" میں رائے ہتورام نے لسبیلہ اور حکمران خاندان کے بارے میں لکھا ہے کہ :

" حکومت لسبیلہ جام عالی خان کلاں کے وقت سے
اس خاندان میں آئی۔ اس سے پہلے یہ خاندان اقوام
جاموٹ کا سردار یا سرکردہ تھا اور جام زئی کہلاتا تھا۔ جام
عالی کلاں کا باپ انبہ جب کہ ملک لسبیلہ کا قوم بُلفت
یا بُرفت بلوچ کے قبضہ میں تھا اقوام برفت سے تکرار
کر کے بطرف مکران فرار ہو گیا تھا (8) جام میر خان کی
زبانی ہم نے ایسا سُنا تھا کہ اس کا بزرگ دراصل ہندو
راجہ جام نگر سے تعلق رکھتا تھا اور کسی سبب کوچ کر کے
اس ملک میں آیا اور بعد میں دین اسلام اختیار کیا۔ جیسا
کہ گچکی یا کیچ دراصل ہندو تھے اور ملک پنجاب سے آئے
تھے"(9)

حیرت ہے ایک ہی حکمران خاندان میں دادا اپنے خاندان کو قریشی عرب بتاتا ہے اور نواسہ اسے ہندو نسل روایت کرتا ہے۔ یہ نواسہ جام میر خان دوئم تھا جو 1830ء میں جام لسبیلہ کی گدی پر بیٹھا اور جنوری 1880ء میں وفات پا گیا۔ 1901ء کی مردم شماری جام میر خان دوئم کے نواسے جام کمال خان کے دور حاکمی میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔

انہوں نے مردم شماری ٹیم کو اپنا خاندان ''جمشیدی'' لکھوایا جس پر گزیٹر لسبیلہ نے لکھا کہ :

" موجودہ حکمران خاندان جاموٹ ماخذ کا ہے لیکن 1901ء کی مردم شماری میں جام اور اُس کا خاندان قدیم نام جمشیدی کے تحت گنے گئے جو اس عمل کی ایک دلچسپ مثال ہے جس کے تحت نئے قبائلی نام وجود میں آتے ہیں۔''(10)

گزیٹر نے اس خاندان کو ازسرنو ایک نیا قبیلہ بننے پر حیرت کا اظہار کیا ہے لیکن ساتھ یہ اشارہ بھی دیا ہے کہ ان کا اصل اور قدیمی قبیلہ ''جمشیدی'' رہا ہے جسے یہ لوگ کبھی قریشی عرب بننے کے شوق میں اور کبھی جام نگر کے سابق ہندو اور نومسلم بننے کے شوق میں اور کبھی جام زئی کا نام اختیار کرنے کے شوق میں بہت پہلے کھو چکے تھے۔ جام خاندان کے درج بالا تضادات سے بھرپور بیانات ثابت کرتا ہے کہ یہ خاندان اپنا اصل ماضی بھول چکا ہے اور غیروں کے مفروضوں پر یقین کرتا اور اپنی نسل بدلتا رہا ہے۔

1987-88 مین جب میں دوران سروس میری مرحوم جام غلام قادر صاحب سے ان کے گھر واقع لسبیلہ چوک کراچی میں ملاقات ہوئی۔ متذکرہ بالا تینوں روایات اور مبینہ قدیم بلوچی شعری تاریخ پر ان سے بات ہوئی۔ پہلی روایت قریشی عرب ہونے کے بارے میں انہوں نے کہا کہ یہ روایت ہمارے خاندان میں ہمیشہ موجود رہی ہے اور انہوں نے یہ بھی تصدیق کی بلوچی شعری تاریخ میں جاموٹ قبیلہ کو اور سولہویں صدی کے حاکم لسبیلہ میر عالی کو جو ہوت بلوچوں سے کہا گیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن

ہماری روایتوں میں ہوت قبیلہ کو قریشی عرب اور عبدالمناف کی نسل سے کہا جاتا ہے۔ اور جام خاندان اُسی میر عالی ہوت کے ایک بیٹے ''جمشید'' جاموٹ (جام ہوت) کی نسل ہے اسی لئے جمشیدی کہلاتا رہا ہے (11) ''جام زئی'' کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جمشیدیوں کا جدامجد اپنے بھائیوں میں پہلا شخص تھا جو لسبیلہ کا جام یعنی حاکم بنا تھا۔ اسی اعزاز کی وجہ سے صرف جمشید کا گھرانہ جام زئی کہلاتا رہا ہے۔ واضح ہو کہ طائفہ ''جام زئی'' پورے لسبیلہ کے تمام قبائل اور ان کے طوائف میں واحد طائفہ ہے جس کے نام کے ساتھ بلوچی کے ''زئی (خاندان، قریبی لوگ) کا لاحقہ استعمال ہوا ہے اور یہ بلوچی لاحقہ اس خاندان کے بلوچ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ جام غلام قادر مرحوم کے نام کے ساتھ جام زئی تحصیل مولہ کے قبیلہ ''جام'' کے شجرہ نسب کے تصدیقی تحریر میں بھی دیکھا گیا ہے جس کے آخر میں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ جام قبیلہ ان کے قبیلہ سے متعلق ہے اور مذکورہ شجرہ نسب ایک صحیح شجرہ نسب ہے۔ واضح ہو کہ مُولہ کا جام قبیلہ، مکران کے پسنی سے آیا ہوا قبیلہ ہے۔ یہ قبیلہ مکران کے دشت اور ایرانی بلوچستان میں آج بھی موجود ہے جو اپنے کو ہوت بلوچوں سے بتاتے ہیں۔

جام صاحب نے یہ بھی کہا کہ جمشید کے بعد لسبیلہ کی حاکمیت ٹھٹھہ کے مغلوں کے ہاتھ آ گئی جنہوں نے رونجھہ قبیلہ کو علاقے کا نائب بنایا۔ جام جمشید کے بعد جام عالی اوّل تک (1742-43ء) ہمارا خاندان اقتدار سے باہر رہا ہے لیکن قبیلہ جاموٹ کی سرداری ہمیشہ جام زئی خاندان میں رہی ہے۔

" جام اَنبہ" کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ہتورام کی یہ روایت کہ وہ جام عالی اوّل کا والد تھا غلط ہے۔ جام عالی اوّل کا باپ "جام ڈگار" تھا جو جاموٹ قبیلہ کا سردار تھا۔ اور بلفت قبیلہ سے ایک لڑائی میں مارا گیا تھا۔ جام انبہ کا خاندان انڈیا سے آئے تھے اور راجپوت تھے اور سنا ہے کہ وہ پنجگور کے کچکیوں کے ہندوستانی رشتہ دار تھے۔

اس سے قبل کہ ہم اُن سے جام میر خان (دوئم) کی روایت کردہ "جام نگر کے ہندو نسل ہونے" کی روایت کے بارے میں استفسار کرتے جسے رائے ہتورام نے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے، جام صاحب نے کہا کہ ہمارے خاندان میں جب جام میر خان اور اُس کے بیٹے جام عالی خان (سوئم) کے درمیان چپقلش چل رہی تھی تو میر خان کو انگریزی حکومت نے پونا انڈیا میں نظر بند کر دیا تھا۔ جہاں پر اُس نے ایک ہندوستانی عورت سے شادی کر لی تھی۔ اُس سے جام میر خان کے دو بیٹے ہوئے۔ ایک بیٹا یعقوب خان تھا۔ جس کے بارے میں سنا تھا کہ اس نے ہمارے خاندان کا ایک شجرہ ترتیب دیا تھا اور اسے خاندان کے بعض افراد میں تقسیم کرنے کے علاوہ انگریزی سرکار کو بھیجا گیا تھا۔ جسے انگریزی سرکار نے مسترد کیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ ہندو نسل والی بات اسی شجرہ نسب سے پھیل گئی ہو بہر حال میری نظر سے وہ شجرہ نسب نہیں گذری ہے۔ اور جو شجرہ نسب ہمارے پاس ہے وہ جام میر عالی اوّل ولد جام ڈگار جمشیدی تک ہے۔

حواشی :

1۔ "نوتک" کیلئے دیکھئے "موضوع" "عاری پیر" کا اشاریہ نمبر 5۔

2۔ دیکھئے موضوع "عاری پیر" اور اس کا اشاریہ نمبر 4۔

3۔ بلفت یا بُرفت قبیلہ کیلئے دیکھیں موضوع "لُمری/نومری" کا اشاریہ نمبر 4 اور موضوع "بیزنجو" کا اشاریہ نمبر 6۔

4-5۔ واضح ہو کہ "جام" کا لفظ حکمران اور رئیس کے مترادف ہے۔ جام عالی کا مذکورہ حکمرانی خطاب کا اپنے نام کے ساتھ استعمال کرنا اس خیال کو تقویت دیتا ہے کہ ان کے اجداد علاقے کے کسی دور میں حاکم رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور وہ صرف جاموٹ قبیلہ کا سردار ہوتا تو وہ صرف "سردار عالی خان" کا نام استعمال کرتے اور مزید یورپی محققین کا یہ کہنا کہ اُس نے لسبیلہ کی حاکمیت کے لئے خان قلات میر محبت خان سے مدد مانگی اور خان نے اُس کی فوجی مدد کی۔ جس کے نتیجے میں وہ جام کی گدی پر آئے، اس خاندان کے سابقہ ادوار میں حکمران ہونے کا ٹھوس ثبوت ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خان قلات کو جام خاندان کے ماضی کا پورا علم تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک ذمہ دار حکمران ہونے کے ناطے وہ بلا سوچے سمجھے اور تاریخی واقفیت رکھنے کے ہرایرے غیرے سردار کی فوجی مدد نہ کرتے۔ یہ پیش منظر سولہویں صدی عیسوی کی بلوچی شعری تاریخ کی تصدیق کرتا ہے کہ جس میں ہوت قبیلہ کے میر عالی کو لسبیلہ کا حاکم بتایا گیا ہے۔ جو بلاشک وشبہ اسی خاندان کے دور اوّل کی حکمرانی کا پہلا جام یعنی جام اوّل تھا۔ جبکہ دوسرے دور حاکمیت کا جام اوّل زیر بحث جام عالی (1742-66) تھا۔ جن میں

سولہویں صدی کے اجداد کے خاندانی نام مسلسل چلے آ رہے ہیں۔

6۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز: ڈسٹرکٹ لسبیلہ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 428-427۔

7۔ ایضاً صفحہ 428۔ یہ دراصل وہی روایت ہے جسے رندوں کی قدیم شاعری میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ امیر حمزہ کی نسل سے ہیں۔ بعض ہوت طائفے بھی اسی روایت کے حامل ہیں۔ جام خاندان بھی ہوت نسل ہونے کی بناء پر اسی قریشی عرب ہونے کی روایت کی امین ہے۔

8۔ جام انبہ کا مکران میں فرار ہونا جام غلام قادر مرحوم کے اس بیان کی تائید کرتا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ جام نگر کے راجپوت تھے۔ اور لچکیوں سے ان کی رشتہ داری تھی نیز لچکی قبیلہ کے بارے میں دیکھیں موضوع ''ساجدی سگیتھائی'' کا اشاریہ نمبر 1۔

9۔ ''تاریخ بلوچستان'' از رائے ہتورام، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 2009ء صفحہ 347۔ لچکی باپ کی طرف سے سکھ تھے اور ماں کی طرف سے پنجگور کے قبیلہ رئیس کے بلوچ تھے۔ ملاحظہ کریں موضوع ''ساجدی/سگیتھائی'' کا اشاریہ نمبر 1۔

10۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز لسبیلہ ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 457۔

11۔ دیکھئے موضوع ''آری پیر'' کا اشاریہ نمبر 6۔

جاموٹ اور کچھی کے جاٹ

بلوچستان کا علاقہ کچھی (1) جو کسی زمانے میں بدھا اور بودھیہ کہلاتا تھا (2) پچھلے کچھ ادوار سے جاٹ قبائل سے مملو ہے جو چند سالوں سے جاموٹ بننے کے جنون میں مبتلا ہیں اور زبردستی جاموٹ بنتے جا رہے ہیں۔ جاٹ قبائل کی اصلیت اور ان کی قدامت کے بارے میں یوروپی محققین نے لکھا ہے :

> '' جاٹ مسلمان قبائل کا ایک ایسا ملغوبہ ہیں جن کا کوئی مشترکہ ماخذ نہیں اور ممکن ہے ان میں سے بعض اُن ہندو باشندوں کی اولاد ہوں جو فتح سندھ کے وقت مسلمان کئے گئے اور کچھی اس وقت لازماً سندھ کا حصہ تھا۔ بہت سے جاٹ جیسے سیال، بھٹی، اعوان، رڑ وغیرہ کوئی دو صدیاں پیشتر (یعنی 1900ء سے) ملتان، ڈیرہ غازیخان اور بہاولپور پنجاب سے آئے جب وہ صوبہ سخت قحط کی لپیٹ میں تھا، اور کچھ کو نصیر خان اوّل (1750ء تا 94-1793ء) لایا تا کہ زراعت ترقی

کر سکے۔ قدیم ترین جاٹوں میں چنے، وڈھے، مانکے اور
رواہی شامل ہیں۔ لیکن مانکے اب ضلع میں موجود نہیں۔
(3)"

یعنی موجودہ کچھی کے جاٹ قبائل تمام تر باہر سے اور خصوصاً سندھ اور پنجاب سے نقل مکانی کر کے آنے والے آبادکار ہیں۔ قدیم ترین قبیلوں میں کچھ مید قبیلے اور دو قبیلے بدھ یا بودھ اور گور قبیلے نظر آتے ہیں۔ علاقے کو نام دینے والا کچھی قبیلہ بھی اب اس علاقے میں وجود نہیں رکھتا۔ سولہویں صدی میں لسبیلہ سے کلمتی قبیلہ کے ساتھ وہاں کے چند گروہ بھی تھے جو جاموٹ قبیلہ کے راج ہوتے تھے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے کلمتیوں سے الگ ہو کر اپنے کو جاموٹ متعارف کرایا (غالباً زبان کی بنا پر)۔ یہ تین قبیلوں کے صرف تین گروہ، "بُرہ" (نسلاً بلفت بلوچ، باریجہ (3-A) اور "اڑھانہ" (نسلاً غالباً قدیم جت، بعد کے مشکوک عباسی) تھے جو لسبیلہ کی مسخ شدہ سندھی کی شکل "لاسی" زبان بولتے تھے جسے انہوں نے اس نئے وطن میں "جاموٹی" کا نام دیا تھا (3-B) چند سال بعد یہ پھر کبھی جاموٹ نہیں کہلائے اور جاٹوں میں مدغم ہو کر اُن کے ذیلی طائفے شمار ہوئے اور بعد ازاں جاٹ ہی میں شمار ہوئے، ان کی زبان جسے انہوں نے جاموٹی کا نام دیا تھا بعد میں کبھی بھی اس نام سے سنا نہیں گیا۔ ان سابق جاموٹوں کا نام انگریزی دور کے مرتب کردہ جاٹ لسٹ میں دیکھا جا سکتا ہے جو درج ذیل ہے:

" ابڑہ، ماچھی، سومرہ، بھمبھن، چھکڑا، بُرہ، پانچھی،
لُوہر، مستوئی (4) بھٹی، ڈنڈور، کلواڑ، عطاریہ، ڈریگھ
(5) میہا، ہاڑا، (6)، راہوجہ، (7)، پہنور (8)،
مُغنیا، کٹپر، بھنگر، منجھو، بچھبا، چاچڑ، ایری، کراڑ، سامت،
ڈیتھا، سیاہ پوست (9) دھرپالی، سنجر، باریجہ، پلال،
جتانی، (10) واچہ، (11) میمن، (12) مستن،
اوڈراں، کوری، لیبی، گگرا، سیانچ، اوڑھانہ (13)، کمہر
(14)، بھنڈ (15)، دستی (16)، گولہ (17)، پڑہ
کری (18)، مہیسر (19)، کیچھی (20)۔

جاٹوں میں شامل درج ذیل قبائل پنجاب سے نقل مکانی کر کے آنے والے آبادکار قبائل ہیں:

بھٹی، سیال، کھوکر، آرائیں، جوپہ، رڈ، گجر، اعوان،
کلس، ڈھنڈور، کھرل، دھیر (12)۔

مذکورہ بالا قبائل صدیوں سے جاٹ کے نام سے شناخت کئے جاتے رہے۔ یہی دو علاقائی جاٹ، کچھی میں دو سے تین صدیوں کے درمیانی مدت کے آبادکار ہیں جبکہ متذکرہ تین گروہ جو پھر جاٹ پچھلی شمار ہوئے جاٹوں سے قدیم تر ہیں جو جاموٹ جانے تو جاتے تھے لیکن جاموٹ کی شہرت نہیں رکھتے تھے اس لئے کہا جاتا ہے کہ

علاقے میں جاموٹ قبیلوں کی موجودگی کسی بھی دور میں ثابت نہیں رہی۔ واضح ہو کہ جاموٹ قبیلہ بنیادی طور پر لسبیلہ میں تشکیل شدہ تھا جس کی اصلیت مکران کا قبیلہ رئیس ہے جو ملک کیچ کے حکمران میر عالی ہوت کی نسبت سے تشکیل پا گیا تھا جو اپنے ایک بیٹے پٹھوں ہوت کے رومان کے نتیجے میں کیچ کی حکومت اپنے ایک بیٹے کے حوالے کر کے لسبیلہ اپنے زیر اقتدار لایا اور پھر گوشہ نشین ہو گیا جہاں پر وہ جام ہوت کہلاتا تھا۔ یہی ''جام ہوت'' جتکی میں ''جاموٹ'' بنا۔ اس نام کی تصدیق سندھ کے معروف صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی اور غلام محمد غائبی کے اشعار سے بھی ہوتی ہے۔ وسیع پیمانے پر اس قبیلہ کا تعلق کچھی اور ملحقہ سندھ علاقوں سے کبھی بھی نہیں رہا ہے لیکن اب کے سندھی اور پنجابی جاٹ بھی چند سالوں سے جاموٹ بن چکے ہیں۔ وہ اپنا تاریخی قدیم نام جاٹ چھوڑ چکے ہیں۔ جس کا کوئی خاص مقصد بظاہر معلوم نہیں ہوتا۔ اغلب خیال یہی ہے کہ لفظ جاٹ سے غیر بلوچستانی اور آبادکار کا اشارہ ملتا ہے۔ اسی لئے وہ اس مفہوم سے شرم محسوس کرتے ہیں۔ وگرنہ ''جاٹ'' نام کوئی توہین آمیز نام نہیں ہے۔ پنجاب والے تو اس پر فخر کرتے ہیں۔ جو کاشتکار کے مفہوم میں سمجھا جاتا ہے۔

مندرجہ معاملہ کا مضحکہ خیز پہلو یہ ہے کہ یہ جاٹ الاصل لوگ اب اپنے کو جاموٹ کا نام دے کر بھی بلوچ ہونے سے کتراتے ہیں حالانکہ جیسے کہ ہم نے لکھا ہے کہ جاموٹ، ہوت بلوچ قبیلہ ہے اس کا سندھی، پنجابی یا جاٹ اور جٹ سے کوئی رشتہ ہی نہیں ہے ماسوائے ایک مسخ شدہ سندھی بولی اپنانے کے جو جتکی اور کہیں کہیں جدگالی کہلاتا ہے۔

میرے اس موضوع پر چند سطور لکھنے کا محرک دراصل میرے ایک تازہ شناسا حیدرآباد کا معتبر شخص علی محمد ابڑو کا سوال تھا کہ ہمارے کچھی کے ابڑو، سومرو وغیرہ کیسے اور کیونکر اپنے کو جاموٹ کہتے ہیں وہ اس ''جاموٹ بننے کی مہم'' کا پس منظر جاننا چاہتے تھے۔

کچھی اور ملحقہ علاقوں کے جاٹ قبائل کو جاموٹ کا نام دینے یا دلانے کی کوشش دراصل ایک سیاسی مہم تھی۔ جس کی ابتداء 1987ء سے جاٹ قبیلہ منجھو کے ایک سیاسی وسماجی کارکن گل حسن منجھو نے کی۔ جو وہاں کے غریب کاشتکاروں اور پسے ہوئے لوگوں کے مسائل اور اندرونی جھگڑوں کو نمٹانے میں پیش پیش رہا اور علاقے میں چند سالوں میں نمایاں رہا۔ جو باری، مزدور و بزگر جاٹ علاقے کے وڈیروں اور سرداروں اور بڑے زمینداروں سے نالاں تھے انہوں نے گل حسن منجھو کی شکل میں اپنا ایک مخلص راہبر پایا اور لسانی اشتراک نے ان کے اتحاد کو مضبوط بنایا۔ جب جام غلام قادر مرحوم صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے تو گل حسن اپنے چند ہمکاروں کے ساتھ اس سے اپنے علاقے اور لوگوں کے مسائل کے بارے میں ملتے رہے اور انہیں یہ تاثر دیا کہ وہی ہی کچھی کے سندھی بولنے والوں کے حقیقی سرپرست بن سکتے ہیں۔ انہی کے دوران وزارت اعلیٰ میں گل حسن نے انہیں نصیر آباد آنے کی دعوت دی اور ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ اسی جلسے میں جام صاحب کے اور دیگر سینکڑوں سامعین کے پہلی بار مقررین نے اپنی تقریروں میں ''جاموٹ'' کی تکرار کی اور کہا کہ نصیر آباد اور کچھی کے جاموٹ جام

صاحب ہی کے قبیلے سے متعلق ہیں اور ہمارے لوگوں کے حقیقی سرپرست اور لیڈر ہیں۔ جام صاحب کو یقیناً یہ حیرانگی ہوگی کہ اس علاقے میں اتنے نئے جاموٹ کہاں سے آگ گئے،

بہرحال اس جلسے کے بعد جوٹ طوائف کے ہر شخص نے اپنے کو جاموٹ کہنا شروع کیا۔ جس سے اس کا قبیلہ پوچھتے تو وہ قبیلہ کے نام کے ساتھ لفظ "جاموٹ" اضافہ کر کے قبیلہ بتاتا۔ چونکہ اس سے قبل جاموٹ قبیلہ اور "جاموٹ" لفظ مذکورہ خطے میں بمشکل سننے میں آتا تھا اس لئے کسی مصنف اور محقق نے بشمول یوروپی مصنفین کے اس نام کا تذکرہ نہیں کیا۔

جہاں تک جام صاحب کا تعلق تھا وہ قبائلی جستجو اور تحقیق وغیرہ سے غرض نہیں رکھتے تھے۔ کسی کے جاموٹ بننے سے نہ انہیں فائدہ تھا اور نہ نقصان۔ اس لئے انہیں ان جاٹوں کے سیاسی طریقے سے جاموٹ بننے سے نہ خوشی تھی اور نہ اعتراض۔

حواشی :

1۔ کچھی کا نام اُن قبائل یا گروہوں کے نام پر ہے جو صدیوں قبل سندھ کی مشرقی سرحد پر واقع ہندوستانی کچ سے نقل مکانی کر کے اس بے آب و گیاہ میدان میں آباد ہو گئے تھے اور "کچ" کی نسبت سے کچھی کہلائے۔ ان کچھیوں میں میمن، بیل پٹ، جھٹ پٹ، ڈینگر (جو بعد میں ڈینگڑا کہلائے) وغیرہ قبیلے شامل تھے۔ اب یہ قبیلہ اندرون سندھ حیدرآباد اور کراچی میں نظر آتے ہیں۔

2۔ کچھیوں کی نقل مکانی سے قبل اس علاقے میں دو قدیم ترین قبیلوں کا سُراغ ملتا ہے ایک قبیلہ "گور" اور دوسرا قبیلہ "بدھ" جسے بدھا اور بودھ لکھا گیا اور کہا گیا ہے۔ مذکورہ دونوں قبیلوں کے باقیات کے چند گھر اب بھی علاقے میں موجود ہیں۔ گور قبیلہ کا ایک تاریخی حکمران "بہرام گور" تھا۔ جو ساسانی حکمرانوں میں چودھواں حکمران تھا اور جس نے ملک ہند کے بادشاہ "شیرماہ" کی بیٹی سے شادی کی جسے ملک سندھ اور مکران کا علاقہ جہیز میں دیا گیا۔ بہرام گور کا زمانہ 427-404ء تھا۔ اس کہانی سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "گور" کوئی ساسانی قبیلہ تھا۔ بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ "بہرام" گورخروں کا بڑا شکاری تھا اسی لئے "بہرام گور" کہلاتا تھا۔ لیکن یہ خیال غلط اور مضحکہ خیز لگتا ہے۔ شکار تاریخ میں آج تک کسی کے نام کا حصّہ بنا نہیں ہے۔ "گور" کا لاحقہ قبیلہ ہی کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ بہرام کو ملک سندھ بھی دیا گیا تھا اور کچھی کا علاقہ بھی اُس وقت سندھ کا حصہ ہوتا تھا اس لئے قیاس یہی ہے بہرام گور کے قبیلے والے ان کی بادشاہی سے مستفید ہونے کیلئے یہاں آباد ہوئے ہوں یا مختلف عہدوں پر انہیں تعینات کیا گیا ہو جن کی نسل مقامی ہو کر رہ گئی ہو۔ صدیوں قبل یہ قبیلہ کثیر تعداد میں ہوا کرتا تھا اور بڑا طاقتور اور محنت کش قبیلہ ہوا کرتا تھا۔ قدیم خراسان کا ملک "غور" بھی اسی قبیلہ کا بسایا ہوا تھا۔ جو فارسی زبان کی وجہ سے "غور" کہلاتا ہے۔

بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں جو تاریخی بندات پتھروں سے تعمیر کردہ ہیں وہ اسی جفاکش قبیلہ کے تعمیر کردہ ہیں جو انہی کے نام سے منسوب ہیں اور "گوربست"

کہلاتے ہیں۔ یوروپی مصنفین نے لکھا ہے کہ یہ بنات زرتشی دین والوں کے تعمیر کردہ ہیں۔انہوں نے ''گور'' کے معنی کافر لکھے ہیں۔ بلوچ لوگ ہر غیر مسلم کو گور کہتے ہیں۔ یہ خیال غلط نہیں ہے۔ پانچویں چھٹی صدی میں بلوچستان میں زرتشتی دین ہی غالب دین تھا۔ اور یقینا گور قبیلہ اور دیگر قبائل کی اکثریت اسی دین کے پیروکار تھے۔جس کے اثرات ابھی تک بلوچ تہذیب وتمدن میں نمایاں ہیں۔اس لئے یہ یقینی بات ہے۔ان تاریخی گوربستوں کا تعمیراتی تعلق اسی قدیم قبیلہ سے رہا ہے۔

دوسرا قدیم ترین قبیلہ بدھ ہے۔جس کے بارے میں ہیوگز بٹلر نے 1901ء کی مردم شماری رپورٹ میں لکھا ہے کہ :

> '' کچھی کا قدیم نام بموجب ایلیٹ (ہسٹری آف انڈیا) ندھا یا بدھا تھا جس کا پہ تخت قندابیل یعنی موجودہ گنداوہ تھا اور وہ اس میدان پر بھی حاوی تھی اور شاید کچھ مشرقی اور مغربی پہاڑیوں اور قدرے سندھ پر بھی باشندے ندھا اور مند کہلاتے تھے۔ ندھیوں کو صحرا نشینوں کے مشابہ بتایا گیا ہے جو سرکنڈے اور گھاس کے بنے ہوئے مکانوں میں رہتے تھے۔ بعد میں انہیں جاٹ بتایا گیا ہے'' (دسٹرکٹ گزیٹر کچھی)

متذکرہ نام شاید ابن حوقل نے اپنی کتاب ''المسالک والممالک'' میں غلطی

سے ندھا لکھا تھا یا انہوں نے ایسا ہی سُنا تھا جو درحقیقت ندھا نہیں ہے بدھ اور بدھا ہے کیونکہ علاقے کا قدیم ترین قبیلہ یہی بدھ قبیلہ ہے۔ ندھا کوئی قبیلہ نہیں رہا ہے۔ ابن حوقل کے لکھے ہوئے کو ایلیٹ نے اپنی ہسٹری آف انڈیا میں بغیر کسی تحقیق کے بعینہ اپنایا۔ جو غلطی پر غلطی ہے۔ گزیٹر کے مصنفین کا خیال ہے کہ ''بدھ'' دراصل قدیم بدھ مت کے باقیماندہ پیروکار ہیں جو اب ایک قبیلہ کی شکل میں باقی رہ گیا ہے۔ کیونکہ بقول ان کے ضلع میں ''بدھ مت'' مذہب کے آثار بھی ملے ہیں۔ وہ چچ نامہ کے حوالہ سے سند دیتے ہیں کہ بدھ مت ساتویں صدی کے سندھ میں غالب مذہب تھا۔ بلاذری لکھتے ہیں کہ قندابیل ''بدھ'' ملک کا دارالحکومت تھا۔ بعض عرب مصنفین کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ملک یا علاقے کو بدھا کہتے تھے اور باشندوں کو ''بدھا''۔ لیکن نام ندھا کے کوئی آثار یا ثبوت وجود نہیں رکھتے اس لئے یقیناً ندھا ان کی ایک سنی سنائی بات ہوگی جسے انہوں نے تقریباً مشکوک انداز سے لکھا ہے۔

3۔ گزیٹرز آف بلوچستان، کچھی ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 303-304۔

4۔ ''مستوئی'' بلوچ قبیلہ ہے۔ ممکن ہے اس سے کوئی گروہ ان میں کسی وقت گھر گیا ہو۔ جس کا شمار جاٹوں میں کیا گیا ہے۔

5۔ اس قبیلہ کے گھرانے کراچی اور اندرون سندھ موجود ہیں جو اپنے کو بلوچ نسل سے اور مکران سے نقل مکانی کر کے آنے والے بتاتے ہیں۔

6۔ ہاڑا قبیلہ سبی، لسبیلہ اور جیکب آباد میں بھی آباد ہے جو اپنے کو ہوت بلوچ بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ پٹوں کے تجارتی قافلے کے ساتھ سندھ آئے تھے اور اس کے خاص محافظ اور اس کے اونٹوں کے دستے کی رکھوالی کرنے والے ہوتے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہاڑا قبیلہ کے دس گھروں نے چالیس سال تک سسی پنوں زیارت کی مجاوری کی تھی۔ سبی میں یہ ڈومکی قبیلہ کا طائفہ شمار ہوتے ہیں۔

7۔ یہ قبیلہ بنیادی طور پر جاٹ قبیلہ کہا جاتا ہے بعض اسے جدگال قبیلہ کہتے ہیں یعنی سندھی زبان اختیار کرنے والا بلوچ قبیلہ اسی طرح اس کے جد امجد ''راہو'' یا ''راہی'' کو بعض لوگ جٹ واپاری بتاتے ہیں اور بعض اُسے ہندو واپاری بتاتے ہیں۔ اس قبیلہ کی شاخیں بلوچ قبیلوں میں بھی ہیں اور راہجہ کہلاتی ہیں۔

(مزید دیکھئے موضوع ''بگٹی'')

8۔ ''پہنور'' نام بلوچی لفظ ''پہوال'' کا سندھی لہجہ ہے۔ یہ ایک قدیم بلوچ قبیلہ تھا جو کیچ کے دشت میں مال چرائی کرتا تھا۔ ''پہوال'' بلوچی میں بھیڑ بکریاں، پالنے والے کو کہتے ہیں۔ کسی قدیم زمانے میں نقل مکانی کر کے سندھ میں آباد ہوئے۔ روایت یہی ہے کہ مکران سے ان کے گروہ محمد بن ہارون مکرانی کے ہمراہ محمد بن قاسم کی فوج کے ساتھ گئے تھے۔

9۔ بلوچی زبان کی ترکیب سے بنا یہ نام ظاہر کرتا ہے کہ اصلاً بلوچ قبیلہ ہے اور اس کا کوئی گروہ جٹوں میں گھر گیا ہے۔

10-11۔ دونوں بلوچ طائفے ہیں۔ اب جدگالوں میں شمار ہوتے ہیں۔

12۔ قدیم کچھی قبیلہ ہے۔

13۔ ملک کیچ کے علاقہ دشت کا قدیم قبیلہ تھا۔ جو پہلے بیلہ میں آباد ہوا اور سندھ نقل مکانی کی جو بعد میں اپنے کو ''عباسی'' کہلوانا شروع کیا۔ سندھ کی تاریخ ''تحفت الکرام'' نے لکھا ہے کہ اس کا پہلا بزرگ اوڑھانہ نام تھا جو کیچ مکران پہنچا اور شیوہ مشائخ اختیار کر کے گروہ کثیر کا معتقد علیہ بنا رہا۔ اس کی اولاد ''اوڑھانہ ثانی'' ہی کے لقب سے مشہور ہوئی۔ اس کی پانچویں پشت سے تھل نام کا ایک بزرگ کا بیرہ بیلا چلا آیا اور گجر قوم سے زمین چھین کر اقامت گزین ہوا۔ سندھ جا کر ان کے دو تین اشخاص دربار مغلیہ سے قریب ہو گئے۔ اسی دور میں انہوں نے اپنے کو عباسی کہلوانا شروع کیا۔ برٹن نے اپنی کتاب ہسٹری آف سندھ میں لکھا ہے کہ جب اس خاندان نے درجہ امتیاز حاصل کر لیا تو بنی عباس ہونے کا استحقاق پیش کیا۔ لیکن علماء کے نزدیک ان کا شجرہ نسب عباسیت کے انتساب میں ناکام ثابت ہوا۔ (صفحہ 401)۔

14۔ ''کمہر'' قبیلہ کو کچھی گزیٹر نے ''بلوچ'' بتایا ہے جو غلط ہے یہ سندھی جاٹوں سے آیا ہوا گروہ ہے۔

15-16-17۔ مذکورہ تینوں قبیلہ بلوچ قبائل کے بچھڑے ہوئے طائفے ہیں۔ بھنڈ مکران کے دشت کا قدیم قبیلہ رہا ہے جسے جت یعنی شتر پال بتایا جاتا ہے۔ روایت یہی ہے کہ جمالی بلوچ قبیلہ کا جد امجد ''جمال'' اسی قبیلہ سے تھا۔ دستی اور دشتی، ایک ہی قبیلہ

ہے اور بنیادی طور پر مکران کے کیچی دشت کی نسبت سے ان کا قبیلائی نام ہے۔

18۔ ''ہڈہ کری'' چند گھرانوں پر مشتمل سبی کا قبیلہ ہے۔ اس کا ماخذ نامعلوم ہے۔

19۔ ''مہیسر'' قبیلہ بھی سندھی قبیلہ ہے۔ گزیٹر کچھی میں اسے غلط طور پر بلوچ پیش کیا گیا ہے۔

20۔ ''کیچی'' قبیلہ مکران کے کیچ کی نسبت سے ہے۔ سنی پٹھوں کے رومان کے زمانے میں کیچ سے نقل مکانی کر کے سندھ جانے والا قبیلہ بتایا جاتا ہے۔ اس قبیلہ کے گھرانے پنجاب میں بھی آباد ہے۔ یہ قبیلہ علاقائی نام پر تشکیل شدہ ہے۔

21۔ بلوچستان گزیٹرز، ڈسٹرکٹ کچھی، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 1997ء صفحات 303-304۔

چلتن

کوئٹہ کا مغربی سلسلہ کوہ ''چلتن'' کے نام سے مشہور ہے۔ اسے اسی تلفظ کے ساتھ لکھا اور بولا جاتا ہے لیکن معنی اسے ''چہل تن'' بمعنی ''چالیس جسم'' یا چالیس اشخاص'' کے دیئے گئے ہیں۔ کالج کے تعلیمی زمانے میں، میں نے کوئٹہ کے خانہ فرہنگ کی لائبریری میں فارسی زبان میں لکھی گئی سیستانی کہانیوں کی ایک چھوٹی سی کتاب میں اس نام کو ''کوہ چلتنان'' پڑھا تھا۔ کہانی میں ایک چلتن نامی کُرد پہلوان نے ایک تُرک پہلوان ''کنک'' نامی کو لڑنے کا چیلنج بھیجا تھا۔ کہانی سے ہمیں اس وقت کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس لئے ہم نے اسے پورا نہیں پڑھا۔ ان دنوں میں صرف شاعری کرتا تھا اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کسی وقت مجھے اس کتاب یا اس کہانی کی ضرورت بھی پڑے گی۔ اس لئے تقریباً پندرہ سولہ سال بعد جب میں پھر اس کتاب کے پیچھے آیا تو وہاں سے تلاش بسیار کے بعد بھی دستیاب نہ ہوئی۔

عوام الناس نے دیگر کئی تاریخی اصطلاحات کے ساتھ اس نام کی وجہ تسمیہ کے ساتھ ایک لمبی چوڑی خودساختہ کہانی نتھی کر دی ہے اور مصنفین نے اسے دھراڈھرا کر ایک لوک کہانی کی شکل دی ہے۔ معروف بلوچ ادیب واجہ بشیر احمد بلوچ نے اپنی کتاب ''بلوچی لوک کہانیاں'' میں مذکورہ نام سے وابستہ کہانی کو ''ادریس پیغمبر اور اس کے چالیس بیٹوں'' کے نام سے درج کیا ہے جو سراوان کے بلوچوں میں بنام

''چلتن قصہ'' مشہور ہے۔ کہانی یوں ہے کہ علاقے کا ایک غریب بلوچ کے چالیس بیٹے تھے جوان کی کفالت نہیں کرسکتا تھا اور ان کی وجہ سے گھر میں ہر وقت فاقہ ہی تھا۔ اُس نے اپنی بیویوں سے جھوٹ بولا کہ اُس کے انتالیس بیٹوں کو سندھ میں کام مل رہا ہے۔ اس لئے وہ انہیں سندھ لے جا کر کام پر لگا کر جلد آئے گا چنانچہ وہ بیٹوں کو لا کر چلتن کے ایک بڑے غار میں رکھ چوڑا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا انہیں بادشاہ بنا دے یا فقیر بنا دے یا پھر ڈاکو بنا دے، نہیں تو انہیں مار دے۔ اُس نے صرف بڑا لڑکا اپنے پاس رکھا تھا۔ کئی سال بعد بڑا لڑکا لکڑیاں کاٹنے اس پہاڑ پر چلا گیا تو اِسے پہاڑی پر انتالیس آوارہ لڑکے ملے۔ جو دن کو غار میں پڑے رہتے تھے اور رات کو نکل کر لوٹ مار کرتے تھے۔ ان کے پاس لوٹ کا مال بہت تھا جو بڑے بھائی مقصود نے دیکھ لیا تھا اس لئے مقصود بھی ان میں شامل ہو گیا اور ان ڈاکوؤں کا سربراہ بنا۔ اس طرح یہ چالیس بندے ہو گئے۔ اس لئے اس پہاڑ کا نام ''چہل تن'' یعنی چالیس جسم پڑ گیا، بعض نے چالیس درویش کہہ کر چلتن نام کو ان سے منسوب کر دیا۔ مرحوم گل خان نصیر نے اپنی شاعرانہ صفات سے اس کہانی کے ساتھ درج ذیل اشعار لگا کر اسے مزید سچ بنانے کی کوشش کی :

چلتن چہل سوار　　شاہ مقصود جلودار

اور پھر خود اس کے معنی یوں لکھے :

" چلتن پر رہنے والے چالیس گھڑ سوار تھے، شاہ مقصود جن کا قائد تھا۔"

اس مفروضہ کہانی کو چارلس میسن نے اپنی کتاب ''دی ٹریولز اِن افغانستان اینڈ بلوچستان'' میں اس طرح بیان کیا ہے :

" ایک غریب شادی شدہ جوڑے کے ہاں کئی سالوں تک اولاد پیدا نہیں ہوئی تو میاں بیوی ایک قریبی بزرگ کے دربار میں اولاد کیلئے نیک دعا لینے گئے لیکن بزرگ نے کہا کہ یہ اللہ کی منشا پر منحصر ہے اور وہ اللہ کی مشیت کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کا حضرت غوث نامی بیٹا مشہور تھا جسے یقین تھا کہ وہ عورت کی تسلی کرا سکتا ہے۔ اس نے چالیس سنگریزے عورت کی گود میں ڈال کر اور دم کر کے اُسے واپس کر دیا۔ کچھ وقت کے بعد عورت نے چالیس بچوں کی جنم دیا جبکہ اسے اتنے بچوں کی کوئی خواہش نہیں تھی اور وہ انہیں پال بھی نہیں سکتی تھی۔ غیب کی اس کثیر النعام پر شوہر پریشان تھا۔ اُس نے ایک بچہ رکھ کر باقیوں کو چلتن پہاڑ کی چوٹیوں پر رکھ چوڑا، پھر ندامت سے کسی دن ان کے

پیچھے چلا گیا کہ مر چکے ہوں تو ان کی باقیات کو
دفن کرے۔ وہ انہیں وہاں زندہ دیکھ کر حیران
رہ گیا جو درختوں پر جھولتے اور گھاٹیوں میں
چلتے پھر رہے تھے۔ واپسی پر اُس نے اپنی
بیوی کو یہ واقعہ سنایا تو ماں کی مامتا بے قرار
ہوئی اور کہا کہ گھر والے بچے کو ساتھ لے کر
جائے اور اُسے دکھا کر باقیوں کو لے آئے۔
اُس نے ایسا کیا اور گھر والے بچے کو ایک
جگہ بٹھا دیا تا کہ اسے دیکھ کر وہ آ جائیں لیکن
وہ آئے اور اِس بچے کو بھی غار میں لے
گئے۔ براہوئیوں کو یقین ہے وہ چالیس بچے
اب بھی اسی طفلی حالت میں اُس پُر اسرار
پہاڑ میں گھومتے پھرتے ہیں۔"

جی پی ٹیٹ نے اپنی تصنیف "فرنٹیئرز آف بلوچستان" میں لکھا ہے کہ اس کہانی کو بہتر انداز میں ہنری پوٹنگر نے بیان کیا ہے جو اس طرح ہے :

" براہوئیوں کے عقیدے کے
مطابق حضرت رسالت مآب صلعم ایک
مرتبہ رات کو فاختہ پر سوار ہو کر اسی پہاڑ پر

تشریف لائے اور کئی پیروں اور ولیوں کو ان
چالیس بچوں کی رہبری کے لئے چھوڑ گئے۔
ان بزرگ ہستیوں میں سے چالیس بزرگ
قلات کے شمال میں 76 میل کے فاصلے پر
ایک پہاڑ میں مدفون ہیں اور اسی لئے یہ
پہاڑ "چہل تن" مشہور ہے اور مسلمانوں
اور ہندوؤں کی زیارت گاہ ہے۔"

مندرجہ بالا کے علاوہ بھی مذکورہ کہانیاں کئی نگارشات میں دُھرائی گئی ہیں۔
لک پاس (1) کے جنوب میں موضع گنج ڈوری (2) کے ایک شخص دین محمد شاہوانی اور پڑنگ آباد کے ملک خدا بخش محمود زئی دہوار نے بتایا تھا کہ چلتن کے مغربی سائیڈ کے ایک غار میں کسی درویش کا مزار ہوتا تھا جس کا نام پیر شاہ مقصود مشہور تھا۔ جس کے بارے میں لوگوں کا کہنا تھا کہ ہرات افغانستان سے آیا تھا اور اسی غار میں چلّہ کشی کرتا تھا اور قریبی بلوچ خانہ بدوش اُس کے لئے کھانا وغیرہ پہنچاتے تھے۔ وہ بیمار خانہ بدوشوں کی بنا پر اسی غار میں مر گیا تھا۔ جسے خانہ بدوشوں نے اسی غار کے دہانے کے اندرونی کونے میں دفنا دیا تھا۔ مرنے کے بعد بھی اُس کی قبر پر لوگوں کا خصوصاً عورتوں کا آنا جانا رہتا تھا جس پر کچھ لوگوں نے یا مُلّاؤں نے اس قبر کو زمین کے برابر کر دیا اور جھنڈے وغیروں کو جلا دیا تھا۔ کچھ وقت بعد لوگوں کا آنا جانا بند اور پھر ختم ہو گیا۔ ملک

خدا بخش کا کہنا تھا کہ مذکورہ قبر ڈیڑھ دو سو سال سے زیادہ پُرانا نہیں تھا۔ یار لوگوں نے پیر مقصود شاہ کو چالیس چوروں کا سرغنہ بتا کر چلتن نام کو اُن سے منسوب کر دیا ہے۔

مذکورہ کہانیاں حقیقت میں مفروضہ اور گھڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کا حقیقی واقعات سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسی غاریں قدیم خانہ بدوشوں اور سادھوؤں کی پناہ گاہیں ہوتی تھیں۔ خصوصاً بارشوں، بغاوتوں اور حملہ آوروں کے خوف سے انہیں استعمال کیا جاتا تھا۔ ڈاکو اور چور انہیں بطور پناہ گاہ اور درویش اور فقیر لوگ چلّہ کشی کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اور عوام الناس ان سے کئی جھوٹی کہانیاں گڑھ کر منسوب کرتے تھے۔

جیسے کہ اس مضمون کی ابتداء میں بتایا گیا کہ یہ نام بنیادی طور پر ''چہل تن'' نہیں بلکہ ''چلتن'' ہے جو ایک قدیم کرد بلوچ قبیلہ تھا جو اس پہاڑ کے دامان میں بود و باش رکھتا تھا۔ جیسے کہ مذکورہ سیستانی کہانیوں کی کتاب میں مندرج تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِس قبیلہ کے افراد سیستان کے علاقوں میں بھی آباد ہوئے تھے۔ جہاں پر موجود علاقہ نقتان اور اُس کے نواحی مواضع ہیں۔ یہ قدیم بلوچ قبیلہ ضلع خاران میں بھی آباد تھا۔ ضلع کے بناپ کے اطراف میں موضع کلنگ میں اِس قبیلہ کے نام سے قدیم موضع ''چلتنانی کھور'' ہے۔ جس کے معنی ''چلتنوں کی ندی'' کے ہیں۔ یہ موضعی نام ازخود بتاتا ہے کہ قبیلہ چلتن اِس مقام پر بھی آباد تھا۔ جس کے قبیلائی نام کو زمانے کے

حوادث نے اب ندی کے نام کی صورت میں بطور تاریخی یادگار رکھ چھوڑا ہے۔ نیز ''چلتن بابا'' نامی بزرگ کا ایک تاریخی مزار چھاؤنی کے رابرٹ مارکیٹ کے مقام پر ہوتا تھا جو ثابت کرتا ہے کہ مذکورہ بزرگ ''چلتن'' قبیلہ سے تھا۔

درحقیقت قدیم مواضعی نام، قدیم تاریخی اقوام و قبائل کے تاریخی آثار ہیں۔ جو یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ اِس نام کا قبیلہ کسی زمانے میں اس مقام پر آباد تھا۔ بعد کے آنے والے اُس نام کے قبیلے کو ناپید پا کر اُس سے کئی قسم کی کہانیاں گھڑ کر اُس مقام کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ جو اُن کیلئے وقتی داستان سازی کا شغل ہوتا ہے۔ جسے اہلِ قلم دھرا دھرا کر امر بناتے ہیں۔ اور پھر تاریخ اپنی خصلت کی بنا پر انہیں اپنے دامن سے جھڑک کر پھینک دیتا ہے۔

حواشی :

1۔ لک پاس کوئٹہ اور مستونگ کی درمیانی پہاڑی گذرگاہ ہے۔ جس سے مراد ''لک گذرگاہ'' لئے جاتے ہیں۔ یہ گذرگاہ انگریزی دورِ حکومت میں انگریزوں نے اپنی فوجی کانوائیوں کی آمدورفت کیلئے سڑک تعمیر کر کے بنایا۔ انہوں نے ''لک'' اسی پہاڑی کا نام سمجھ کر اسے لک پاس کہا اور لکھا۔ جبکہ اس پہاڑی سلسلہ کے مغربی حصے اور گذرگاہ والے حصے کو ''نشپا'' کہتے ہیں لک کو بھی نشپا لک کہتے ہیں۔ جبکہ اس کے مشرقی حصے کے سلسلہ کا نام ''بلغ'' ہے۔ جو کہ ایک قدیم بلوچ قبیلہ تھا۔ جو اسی سلسلہ

کے دامن میں رہتا تھا۔

" لک پاس" کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کئی بے سروپا کہانیاں مشہور ہے۔ایک بلوچ مضمون نگار عطااللہ بلوچ نامی نے روزنامہ جنگ کوئٹہ کے غالباً جنوری 2011 کے ایک میگزین میں لکھا تھا کہ چونکہ اس گذرگاہ سے روزانہ لاکھوں لوگ آمدروفت کرتے ہیں اسی لئے یہ لک پاس کہلاتا ہے۔وہ "لک" اور "لاکھ" میں شاید تمیز نہیں کرسکے ہیں اور بلوچی لفظ "لک" کے معنی سے نابلد رہے ہیں۔ بلوچی میں "لک" یکدم اٹھتی ہوئی یا کھڑی چڑھائی کو کہتے ہیں۔اور یہ لفظ بلوچستان میں موجود تمام کھڑی چڑھائیوں کے لئے مستعمل ہے۔مثال کے طور پر کراچی اور سونمیانی بندر کے درمیان بدوک کے مقام کی چڑھائی "لک بدوک" خضدار اور بیلہ کے درمیان اور ناچ کے مقام "باراں" کی چڑھائی "لک باراں"، بیلہ آواران روڈ پر واقع چڑھائی "بیلہ لک" تربت سے پنجگور جانے والی سڑک پر بمقام گوران پڑنے والی چڑھائی "گوران لک" اور ساحلی شاہراہ پر بمقام بزی کوہ کی چڑھائی "لک بزی" وغیرہ وغیرہ۔بعض کتابوں میں لک کے معنی "گذرگاہ" بتائے گئے ہیں جو غلط ہے۔جو طویل اور تدریجی چڑھائیاں ہوتی ہیں انہیں بلوچی میں "پدرنگ" کہتے ہیں جبکہ اترائیوں کو "کھنڈنگ" اور ایرآئرنگ" کہتے ہیں۔

2۔کنجہ ڈوری دراصل "گنج ڈوری" ہے۔جس کے معنی ہیں "گنج ڈوروالے" یا "گنج ڈور" سے آنے والوں کی بستی "گنج ڈور" (گنج برساتی نالہ) مستونگ کے کھڈ کوچہ

کے مغرب میں ایک برساتی نالہ تھا۔جو ایک قدیم ویران موضع "گنج" کے مقام سے نکلتا تھا۔ "گنج" ایک قدیم بلوچ قبیلہ تھا جو پندرھویں صدی عیسوی کے وسط تک ایک طاقتور قبیلے کی حیثیت سے وجود رکھتا تھا۔اس قبیلہ کا ایک کچا مضبوط قلعہ اور میری ہوتا تھا۔جو "گنج ماڑی" کہلاتا تھا۔علاقائی روایتوں کے مطابق گنج ماڑی کا آخری حاکم یا سردار لونگ خان نامی شخص تھا۔جو یقیناً گنج قبیلہ سے ہی ہوگا۔

کچھی کا شہر "گنداوہ" اسی بلوچ قبیلہ کا بنایا ہوا ہے۔جس کا اصل تاریخی نام "گنج آبہ" یعنی گنج آپ بمعنی گنج قبیلہ کا پانی (مراد چشمہ، کنواں، برساتی تالاب)۔ تاریخ کی کتابوں میں بھی اسے "گنجابہ" لکھا گیا ہے۔

گنج بلوچ قبیلہ کا ایک نامور کچھی کا زمیندار شخص مراد گنجہ 31-1730ء میں کلہوڑہ حکمرانوں کا فوجی سپہ سالار اور سبّی کا ناظم تھا۔لفظ "گنجہ" دراصل "گنج" کا معرب ہے۔عرب "گنج"، آب یا آوہ، کوچ، فوشنج، کوت، لنج، کو گنجہ، آبہ اور آوہ، کوچہ، فوشنجہ، کوتہ، لنجہ، لکھتے رہے ہیں۔اسی طرح وہ سعودی کو سعودیہ، مصری کو مصریہ، پارسی کو پارسیہ، ترکی کو ترکیہ، بحری کو بحریہ، سندھی کو سندھیہ، افغانی کو افغانیہ لکھتے ہیں۔

3۔دیکھئے بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئرز ضلع خاران، مطبوعہ گوشہ ادب، کوئٹہ 1997ء صفحہ 319۔

حلوائی

حلوائی، خضدار وادی کے مشرق کی بلند و بالا پہاڑ کا نام ہے، اس کے دامان میں اور اندرونی طرف قدیم آبادکاری کے بے شمار آثار ہیں۔ جنہیں بارشوں کے دوران اونچائی سے بہتے ہوئے پانی کے ریلوں نے بڑی تیزی سے معدوم کر دیا ہے۔

" حلوائی " کی وجہ تسمیہ کو جہلاوان گزیٹر نے ایک عجیب اور ناقابل یقین کہانی سے منسوب کیا ہے۔ جو بقول اُن کے مقامی لوگوں کی بیان کی ہوئی روایت ہے۔ اور یہ مضحکہ خیز روایت ابھی تک دہرائی جاتی ہے :

" کہا جاتا ہے کہ افسانوی حکمران
خضدار (1) ملک چپ اس پہاڑ کی چوٹی پر
رہتا تھا۔ اور اس کے پاس اتنے خدمتگار
ہوتے تھے کہ جب کبھی "حلوہ" پکانے کا
حکم دیتا تھا تو پہاڑ کے نیچے حلوہ پکوا کر
خادموں کی قطار کے ذریعے دست بہ دست
گرم حلوہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچایا جاتا تھا۔
اسی لئے اس پہاڑ کا نام حلوائی پڑ گیا۔"(2)

حلوائی پہاڑ، سطح زمین سے سات ہزار چھیاسی فٹ بلند ہے۔ خضدار کی طرف سے اس پر چڑھنا اور اس چھوٹی تک پہنچنا کم از کم تین دن لیتا ہے۔ پہلے سامنے کی دو پہاڑیوں کو عبور کرنے کے بعد بلند و بالا پہاڑ شروع ہوتا ہے۔ حلوائی کے آس پاس رہنے والے پہاڑی شکاری اور گڈریے بھی خوف کے مارے اس کی چھوٹی تک نہیں جاتے۔ اور کوئی انتہائی احمق ہی یہ کوشش کرے گا۔ اندرونی وادیوں میں رہنے والوں کی دو تین پشتوں میں سے بھی کسی نے چوٹی پر جانے کا سوچا تک نہیں ہے۔ ساسول وادی کے قبیلہ شیخ (3) کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ خان خدائیداد خان نے ایک مرتبہ لیویز کے ایک پانچ رُکنی ٹولے کو بھیجا تھا کہ وہ اس چوٹی پر جا کر دیکھ آئیں کہ اُس پر مشہور کردہ "دشت" کتنا بڑا ہے اور چوٹی پر سے وہ کن کن گاؤں کو دیکھ سکتے ہیں۔ مذکورہ ٹولہ ساتویں دن نامراد لوٹ آئے کیونکہ چوٹی تک جانے کے راستے نہیں تھے اور گھاٹیاں اتنی دشوار گذار تھیں کہ حلوائی کے تقریباً آدھے حصّے تک پہنچتے پہنچتے وہ نہ صرف راشن ختم کر چکے تھے بلکہ دو ساتھیوں کو نیم مردہ حالت میں بڑی مصیبتوں سے واپس اتار چکے تھے۔ اُن کے پیر اتنے زخمی اور سُوج چکے تھے کہ انہیں اونٹوں پر باندھ کر ساسول سے خضدار پہنچایا گیا تا کہ نقاہت سے گر نہ پڑیں۔

دوسری جانب ہمارے عوام کے حکمراں ملک چپ ہیں کہ شاہی قلعہ کو چھوڑ کر حلوہ کھانے پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر گرما گرم حلوہ کھاتے ہیں۔ ایسے گھڑے ہوئے اساطیر کو تاریخی کہانی بنا کر پیش کرنا بذات خود ایک احمقانہ فعل ہے۔

قصہ مختصر مذکورہ کہانی اپنی قومی اور علاقائی تاریخ سے ناآشنا مقامی لوگوں کی گھڑی ہوئی بات ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پچھلے صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ صدیوں پہلے کئی ہندی اور کشمیری قبائلی گروہ یا طائفے بلوچستان میں پھیل چکے تھے اور تاحد عراق اپنی آبادیاں قائم کر چکے تھے۔ اور اپنے نو آباد مساکن کو اپنا نام دے چکے تھے۔ عرب مورخوں نے پہلی صدی ہجری میں جاٹوں کی وسیع پیمانے پر نوآبادیوں کا تذکرہ کیا ہے جو کرمان سے منصورہ (سندھ) کے درمیانی علاقوں میں پھیل چکے تھے۔ مصنفین نے ان جاٹوں کو ہندی الاصل قبائل کہا ہے۔ بلوچستان کے طول وعرض میں جن ہندی قبائل کی آبادکاری کے آثار ہیں ان میں درج ذیل قبائل شامل ہیں۔

بیشن، دیول (3-A) بھان، ڈنڈا، کلو، بٹو، کول، کنجر، ونگو، کوشک، کوتر، نقیب (4)، سلطان، پروار، گنجو، گورو، کیٹر، دادر، سوری، جیو، تور، مشکی، مہر، ہب، کوچہ، ہار، کنٹر، سلاچ، خوبہ، چھاگا، مشک، بدرو، ہاڑا، درابو، مار، گور، کوتوال، چھڈ، گرٹہ، پرا، شورا، وندر، کش، بابا، ڈوم، گوجر، ڈاہر، بل، بڑ، کنٹ، کھڈ، چنال وغیرہ۔ ''حلوائی'' بھی ان میں سے ایک کشمیری قبیلہ تھا۔ جو اب بھی کشمیر میں موجود ہے۔ ان میں سے بعض کے باقیماندہ طائفے مختلف بلوچ قبائل میں اب بھی نظر آتے ہیں، جیسے نقیب، سوری، جیو، چھاگا، تور، ہاڑا، گور، کوتوال، چنال، بڑ وغیرہ۔

زیر بحث قبیلہ ''حلوائی'' بھی کسی زمانے میں اسی پہاڑ کے دامن میں آباد

ہو چکا ہوگا۔ جس سے مذکورہ مقام کا نام باقی رہ گیا۔ قبیلہ خود یا تو نقل مکانی کر گیا یا منتشر ہو کر دیگر مقامی قبائل میں مدغم ہو گیا۔

اشاریہ :

1۔ خضدار کا حکمران ''ملک چٹپ'' کوئی افسانوی کردار نہیں ہے بلکہ واقعتاً ایک حاکم تھا اور ملک حکمرانوں کا مقرر کردہ نائب تھا۔ جو ایک بدکردار شخص تھا۔ جھلاوان گزیٹئر نے اسے ملک چپ منگول لکھا ہے اور کہا ہے کہ یہ منگولوں کا نمائندہ تھا جو ملک بہرام شاہ کے بعد اس کا قائمقام آیا تھا۔ ملک بہرام شاہ کا مقبرہ خاران ضلع کے واشک میں ہے۔

'' ملک چٹپ'' کے بارے میں روایت ہے کہ اس کا نام کوئی اور تھا۔ ملک چپ اُسے اس وجہ سے کہتے تھے کہ اس کا دایاں ہاتھ فالج زدہ تھا اور کام نہیں کرتا تھا اس لئے وہ بایاں ہاتھ سے کام لیتا تھا۔ بایاں کو بلوچی میں ''چپ'' کہتے ہیں۔ اسی واسطے وہ ملک چپ مشہور ہو گیا تھا۔ ''ملک چٹپ'' کی بدکرداری کی وجہ سے بلفت قبیلہ کے فیروز مردوئی نے اس کے خلاف لشکرکشی کی اور ایک بڑے عوامی ہجوم کے ساتھ اس کی رہائش گاہ پر بار بار حملے کئے یہاں تک کافی کشت وخون کے بعد وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ ایک رات کو ''میری'' کے ایک خفیہ دروازے سے نکل بھاگا۔

'' ملک چپ'' کی نسل کے کچھ گھر خضدار میں موجود ہیں اور ''ملک'' کہلاتے ہیں۔

2۔بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئرز: جہلاوان ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 130۔

3۔مذکورہ شیخ اپنے کوڈھاڈر میں مدفون پیر عمر کی نسل سے بتاتے ہیں اور بلوچی رومان "حانی شے مُرید" کے شے مرید سے بھی رشتہ جوڑتے ہیں۔

3-A۔"دیول" قبیلہ کے نام سے ضلع کیچ مکران کے دشت میں دو آثار ہیں۔ ایک بلند وبالا ڈھیری ہے جو دیول کہلاتا ہے۔ دوسرا ایک وسیع میدان ہے جو "دیول ڈن" "(میدان) کہلاتا ہے۔ مقامی روایتیں اسے ایک تُرک قبیلہ بتاتے ہیں۔ لیکن ہندی تاریخوں میں اسے ایک ہندو جاٹ قبیلہ لکھا گیا ہے۔ اس قبیلہ کے گھرانے انڈیا میں موجود ہیں۔ سندھ کا مشہور شہر "دیبل" اسی قبیلہ کا آباد کردہ تھا۔ سندھی مورخوں کا یہ کہنا کہ "دیبل" مندر کا نام تھا ایک غلط روایت ہے۔ دیول قبیلہ اب بھی انڈیا میں موجود ہے۔ دیبل، دیول کا معربی تلفظ ہے۔

4۔نقیب قبیلہ ایک بڑا اور پھیلا ہوا قدیم قبیلہ ہے جسکی زیادہ تر تعداد بلوچستان کے مکران اور ایرانی بلوچستان میں ہے اس کے علاوہ کئی عرب ممالک میں اور سندھ میں آباد ہیں۔ اس قبیلہ کی اصل اور ماخذ نامعلوم ہے۔ اس کے خادم اور کارندے نہ صرف عرب لشکروں میں موجود ہوتے تھے بلکہ منگولوں اور تاتاریوں کے اُردوؤں میں شامل ہوتے تھے جو خیمہ برداراوران کی تنصیب کا کام کرنے والے ہوتے تھے۔ بلوچستان میں زیادہ تر زمینداروں سے منسلک ہیں اور فصلوں میں شراکت داری کی بنیاد پر محنت کرتے

ہیں۔ اور اب بلوچ قوم کے اٹوٹ حصے بن چکے ہیں۔ ان کا بالائی طبقہ "بہل" کہلاتا ہے۔ یہ "بہل" اومان میں بھی قدیم سے موجود ہیں۔ مکران میں نخلستانوں میں محنت کرنے والے تمام تر نقیب لوگ ہیں۔ کیچ وغیرہ میں انہیں درزادہ کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں "غیر مقامی نسل"۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ باہر سے مکران میں آئے ہیں۔ لیکن کہاں سے آئے تھے؟ مشرق سے آئے تھے یا مغرب سے ؟ یہ مسئلہ گوشہ گمنامی میں ہے۔

جہاں تک ان کے نام کا تعلق ہے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ "نقیب" ان کا کوئی جدّامجد تھا یا یہ ایک پیشہ ورانہ نام ہے۔ یہ لوگ اپنے بارے میں خود بھی نہیں جانتے۔ یہ اصطلاح دوصورتوں میں عربی میں ملتا ہے اور فارسی، تُرکی اور ہندی زبانوں میں بھی یہی لفظ عربی معنوں میں مستعمل ہے۔ "نقیب" کے معنی "چوبدار"، خیمہ بردار، شاہی لشکروں کے آگے "عصا" لئے ہوئے لشکر کے آگے آگے جانے والا۔ چنگیزی اور تیموری لشکروں میں نقیب ساتھ ہوتے تھے اور لشکروں سے بہت آگے جاکر خیمے نصب کرکے رہائش کے انتظامات کوتیار رکھتے تھے۔ یہ نام منگولوں کا دیا ہوا لگتا ہے۔

خاران

بلوچستان کا ضلع خاران صدیوں پہلے ایک انتہائی اہم خطہ ہوتا تھا۔ ریتلا علاقہ اور طوفانی ہواؤں کی زد میں ہونے کی بنا پر یہ ریگستان میں بدلتا رہا ہے۔ اس زمین پر واقع قدیم مقابر، گنبد اور برباد شدہ قلعوں کے ٹیلے اور زیر ریت دبے قبرستان وغیرہ اس کی پرانی شان و شوکت اور عظمت کے زندہ ثبوت ہیں۔ یہاں پر عربوں کی تاریخی شخصیتوں کے مقبرے وغیرہ بھی یہ ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ یہ مقام ضرور کسی قدیم مشہور ملک کا مرکزی مقام یا دارالخلافہ رہا ہے۔ حکمرانوں کے مقرر کئے گئے "مَلِک" نائبوں اور حاکموں کے اسماء سے منسوب تباہ شدہ قلعے اور گنبدیں بھی اس کے ایک اہم مقام یا ملک ہونے کے ثبوت دیتے ہیں۔ بلوچستان میں شاید ہی کوئی خطہ آثار قدیمہ کے حوالے سے خاران سے بڑھ کر امیر ہو مگر بدقسمتی سے ریت کی دبیز سطح نے آثار قدیمہ کے متوالے محققوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے نہیں دیا لیکن اس کی سطح کے اوپر بھی عظیم الشان آثار کا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ میلوں تک چلا جاتا ہے جو زمانے کے حادثات اور طوفانی ہواؤں اور سیلابوں کی نذر ہوتا اور برباد ہوتا رہا ہے۔ اور اس عظیم تاریخی ورثہ کی تحقیق و جستجو اور اس کے تحفظ کا احساس کسی کو بھی نہیں ہوا اس عظیم ورثے

کے بارے میں خاران کے حکمران نوشیروانی خاندان کا ایک مصنف جناب میر عبدالقادر خان بلوچ خارانی لکھتے ہیں کہ خاران کے قدیم آثار ملاحظہ کرنے سے خود پتہ چلتا ہے کہ ایرانی بلوچستان، افغانستانی بلوچستان سے لے کر سارے پاکستانی بلوچستان میں اتنے مقبرے اور ہر قسم کے جائے آثار قدیمہ سوائے خاران کے دوسری جگہوں پر نہیں ملتے "۔

مزید لکھتے ہیں:۔

> "یہ گنبدیں اور مقابر اس کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ یہ سرزمین مشرق بعید میں ایک اہم ترین مقام تھا... کیا ایک ناکارہ ملک میں اتنی عظیم ہستیاں دفن ہو سکتی ہیں؟ اور کیا بلوچستان کے کسی اور خطے میں اتنی عظیم ہستیوں کے گنبد اور مقبرے اور جگہ بتائے جا سکتے ہیں" (1)

عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کی نگارشات اور مرتب کردہ نقشوں کے جائزہ سے اس خیال کو بھرپور تقویت ملتی ہے کہ خطہ خاران بشمول کوہستان قلات ہی دراصل تاریخی ملک قیقاناں تھا جسے نصف صدی تک مختلف سمتوں سے آنے والے جنگی لشکروں خصوصاً اسلامی دور کے عربی افواج نے میدان کارزار بنائے رکھا تھا۔

خاران نام کی وجہ تسمیہ کو مفروضوں کی بنیاد پر تاریخ لکھنے والوں نے دیگر کئی اسماء کی طرح پیچیدہ اور مشکوک بنا دیا ہے۔ خاران کا اپنا باسی اور خاران کی تاریخ کا مصنف جناب عبدالقادر بلوچ خارانی لکھتے ہیں کہ حاران، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی کا نام تھا جو اسی سرزمین کا مالک تھا اس لئے یہ خطہ زمین اُس کے نام سے مشہور ہو گیا(2)۔ واضح ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات کے سلسلے میں یہ جگہ کا نام ''حاران'' نہیں، ''حران'' استعمال ہوا ہے۔ اور اُن کی جائے پیدائش ''حران'' نامی جگہ ہے جو یمن میں ہے، مذکورہ حران کے علاوہ ایک حران، ترکی کی جنوبی سرحد پر نصیبین اور غرفہ کے درمیان میں ہے جبکہ اسی نام کی ایک اور بستی دمشق میں اور دو بستیاں جو بنو عامر بن حارث بن انمار کی ہیں، بحرین میں واقع ہیں ''حران'' حر کی جمع ہے۔ اس قبیلہ کی آبادیاں ایک بڑے خطے میں قائم رہی ہیں۔ جن کے نام کے مواضع تاحال موجود ہیں۔ خود خاران میں ''حرءناوڑ'' (حر قبیلہ کا تالاب)، کیچ کے دشت میں ''حرءبینٹ'' (بلندی پر واقع حر قبیلہ کا مسکن) اور افغانستان میں ''حرات'' (حرلوگ) نامی مواضع ثابت کرتے ہیں کہ ''حر'' قبیلہ مختلف جگہوں میں بود و باش رکھتا رہا ہے مگر حاران نام کا ''حران'' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آئینہ خاران کے مئولف اثیر عبدالقادر شاہوانی نے ''سکندر نامہ'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ یہ علاقہ خاردار جھاڑیوں اور پودوں کا جنگل رہا ہے جس کا نام اسی مناسبت سے خاران یعنی کانٹوں کا خطہ رکھا گیا۔'' شاید سکندر نامہ کے مصنف

نے اس وسیع و عریض ریگستان کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ وہ کبھی اس خطے کو خاردار جھاڑیوں کا جنگل نہ لکھتے۔ جہاں خاردار جھاڑیوں کے وسیع جنگل موجود ہیں وہاں کسی مقام کا نام خاران نہیں ہے۔ اس قسم کے دیگر کئی مفروضوں پر مذکورہ کتاب کے مصنف نے خیال آرائی بلکہ دل لگی کی ہے۔ کبھی ''گورخران'' کے گور کو ساقط کہہ کر ''خران'' سے خاران کی تشکیل کرتے ہیں اور کبھی ''حار'' (گرم) کا مفروضہ گھڑ کر اسے ''حاران بطور گرم خطہ'' کی بات کرتے ہیں۔ آخر میں اپنا فیصلہ اس طرح سناتے ہیں۔

'' درحقیقت اس خطہ کا نام ''ہاران'' ہے جو مقامی زبان اور بلوچی اصطلاح میں بمعنی سیلاب مستعمل ہے۔ اور ہاران کا خاران بن جانا کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ بلوچی زبان میں ''ح۔ھ اور خ کی کوئی تمیز نہیں۔ مثلاً یہاں کے لوگ ''خدا'' کو ہدا، اور خُرما کو ''ہُرما'' کہتے ہیں.....''(3)

مذکورہ بیان بھی ایک ذہنی اختراع ہے خواہ مصنف کتاب نے گھڑا ہو یا عوام میں مشہور کردہ ایک بے بنیاد بات ہو یہ اور اس جیسی بیسویں سطحی باتیں غیر تاریخی اور غیر حقیقی ہوتی ہیں۔ اور علاقائی نام جو درحقیقت تاریخی آثار قدیمہ ہوتے ہیں یونہی چلتے چلتے اور مذاق مذاق میں رکھے نہیں جاتے بلکہ وہ اپنی جگہ خود بناتے اور اپنی شہرت تاریخی عمل کے ذریعہ قدرتی اور غیر ارادی طور پر از خود پھیلاتے ہیں۔

حاران سے قریب ترین دوسرا نام "خار" ہے جیسے "ہار" اور "حار" بھی لکھا گیا ہے۔ اس نام پر ایک ندی ایران کے بیرجند میں ہے جو اس کی شمال مغربی بلندیوں سے نکلتی ہے اور ہامون جھیل میں گر جاتی ہے۔ واضح ہو کہ یہ ایک قدیم قبیلہ کا نام ہے جسے کہیں "خار" اور کہیں "ہار" بولا اور لکھا جاتا رہا ہے۔ یہ قبیلہ کسی زمانے میں کشمیر کے خطے میں بودوباش رکھتا تھا۔ اس کے گھرانے آج بھی کشمیر میں موجود ہیں۔ اسی قبیلہ کے نام پر صوبہ سرحد میں موضع "خار" ہے۔ "خار" یا "ہار" صیغہ جمع میں "خاران" اور "ہاران" بن جاتا ہے۔ سابق سیستان کے کُرنگ کے قریب برلب ہاموں "خاران" نامی ایک قدیم ڈھیری بھی ہے کہ جو کہ بقول جی۔ پی۔ ٹیٹ ایک قدیم منہدم قلعہ کا ملبہ ہے۔(4) یہ نام صدیوں سے "ہاران" تلفظ کیا جاتا ہے۔ اور تحریر میں پہلی مرتبہ (فارسی اثرات کی بنا پر) "خ" سے کتاب "ظفر نامہ" اور ملفوظات صاحبقرانی میں لکھا گیا ہے(5) حالانکہ ایک مشہور ملک ہونے کی بنا پر عرب جغرافیہ دانوں اور سیاحوں نے اس کا نام "قارہ"، "قاران" اور "کاران" ہی لکھا ہے۔ عربی تصانیف "روضۃ الجنت"، روضۃ الصفا" اور کتاب المسالک اور ممالک وغیرہ میں یہ نام "قاران" لکھا گیا ہے جو قارہ کی جمع ہے۔ تیموری لشکر کے "نکودریوں" پر حملوں کے واقعات کی ذیل میں بھی علاقے کو "کاران" (ترکی تلفظ) تحریر کیا گیا ہے۔ نیز آئین اکبری میں بھی ابوالفضل نے اس خطے کے لئے "کاران" کا نام استعمال کیا ہے(6) پرانی تاریخی تصانیف میں سیستان سے متعلق تصانیف میں

"خاران" کے راسکوہ اور آس پاس کے لئے بلوچی لفظ "برفین" بمعنی "برف آلود" استعمال ہوا ہے(7) یاد رہے کہ "قارہ" ایک نامی گرامی جنگجو عرب قبیلہ رہا ہے جو مشہور عدنانی قبیلہ "خندف" کے طائفہ "ہون" کی ذیلی شاخ رہی ہے۔ جو کسی زمانے میں راسکوہ کے دامان میں کہیں بودوباش رکھ چکا ہے اور متعلقہ مقام کو اپنے قبیلہ کا نام دے چکا ہے۔

اس کے علاوہ یہ قبیلہ یا طائفہ بغداد کے نواح میں بھی آباد رہا ہے جہاں پر اس کے نام کا موضع ہے۔ اور حمص اور دمشق کے درمیان کا ایک موضع، بحرین کا ایک پہاڑی ویران مقام بھی اسی قبیلہ کے نام پر ہیں(8) جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عرب طائفے نے مختلف خطوں میں بودوباش رکھی ہے تو تاریخ میں اس طائفے کے جدامجد "قارہ" کا شجرہ نسب اس طرح دکھایا گیا ہے۔

" قارہ ولد عمرو ولد جاسم ولد عملیق ولد لاوذ ولد سام ولد نوحؑ "۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی کی ابتدائی سالوں سے بیسویں عرب قبائل کے طائفے ہندوستان اور سندھ کی طرف چلے آتے رہے اور کئی طائفے بلوچستان میں آباد ہوئے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بلوچ قبائل میں مدغم ہو کر بلوچ بنے۔ ایسے معلوم قبائل یا قبائلی طائفوں میں بولان (9)، بردی، (10) بلیدہ (11) بزہ، مزہ، قرمط، قحطانی، غزہ، عامری، لبنان، لوط، یزیدی، وغیرہ شامل ہیں۔ انھیں میں سے قبیلہ "قارہ" بھی ہے جو کسی نامعلوم سن میں راسکو کے دامان میں آباد ہو گیا تھا۔

جیسے کہ اوپر ہم نے کہا تھا کہ فارسی زبان کے اثرات کی وجہ سے اور سیستانی حکومتوں کے ادوار میں اس نام کو ''خاران'' کے تلفظ میں لکھا اور بولا جاتا رہا ہے جسے بلوچوں نے اپنے لہجے میں ''حاران'' کہا جواب بھی ''حاران'' کہا جاتا ہے جسے لکھائی میں اکثر ''ہاران'' تحریر کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ مذکورہ نام بنیادی طور پر عرب قبیلہ ''قارہ'' کی قدیم آبادکاری کی یادگار ہے جو جمع کے طور پر ''قاران'' استعمال کیا جاتا رہا ہے اور بلوچ فارسی کے ''خاران'' کی بنیاد پر اسے ''حاران'' تلفظ کرتے ہیں اور دیگر مبینہ خیال آرائیاں محض مفروضے ہیں۔

حواشی:

1۔ کتاب ''مجموعہ بلوچ تاریخ خاران'' صفحہ 25، مطبوعہ میر وزیر خان نوشیروانی اینڈ برادرز خاران۔

2۔ ایضاً صفحہ 32، مصنف کتاب نے انجیل مقدس کے پیرا نمبر 11- 12-13-14 10- صفحہ نمبر 29 باب پیدائش 28-10 کے حوالہ سے لکھا ہے

'' اور یعقوب بیر سبع سے نکل کر حاران کی طرف چلا۔''

مذکورہ حوالہ حضرت یعقوب سے متعلق ہے نہ کہ حضرت ابراہیم، یا اُس کے بھائی جس کا نام وہ ''حاران'' بتاتے ہیں، کے بارے میں ہے۔ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بھتیجے حضرت لوط کے ہمراہ حاران یا حران ہجرت کر گئے تھے۔ یہ ہجرت انہوں نے بابل کے علاقہ فدان آرام سے کی تھی۔

یہ اتفاق ہے کہ ضلع خاران میں ''لوط'' کے نام سے بڑا صحرا ہے۔ اور یہ یقیناً قوم لوط کی نسبت سے ہے جو کسی زمانے میں یہاں سکونت رکھتے تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ مذکورہ مقام حضرت لوط کی شخصیت کے نام پر ہو۔ جہاں تک روایتوں کی بات ہے تو کیچ علاقہ میں تربت کے ایک قدیم چشمہ کا پانی حضرت ابراہیمؑ کی نسبت سے ''پیغمبرءِ آپ'' (پیغمبر کا پانی) کہلاتا ہے۔ روایت یہی ہے کہ اسی ویرانے میں آپ تشریف لائے تھے۔ علاقے میں پانی نہیں تھا۔ لوگوں کی التجا پر آپ نے دعا کی اور چشمہ نکل آیا جو صدیوں سے رواں دواں ہے۔

آپ کی تبلیغ وحدانیت سے دین نمرودی اور اُس کی جھوٹی خُدائی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اس لئے نمرود نے جو اُس وقت کا لدیہ اور آدھی دنیا کا طاقتور بادشاہ تھا، نے حضرت ابراہیمؑ کو گرفتار کروا کر اُسے اپنے بلوچ جرگے کے ذریعہ آگ میں ڈالنے کی سزا دلوائی۔ یاد رہے کہ نمرود بلوچ اسی بلوچ ملک کا رہنے والا تھا۔ دشت کے سُنٹ سر کے مقام پر اُس کا تاریخی قلعہ ہوتا تھا جس کے آثار آج بھی عظیم الجثہ ڈھیریوں کی شکل میں نمرود کلات (قلعہ نمرود) کے نام سے سطح زمین پر موجود ہے اور قلعے کے پہلو میں وہ مقام بھی ظاہر ہے جس پر کئی ہفتوں تک آگ جلائی گئی تھی جہاں پر حضرت ابراہیمؑ کی سزا پر عملدرآمد کیا گیا۔ زمین کا وہ ٹکڑا آج بھی سوختہ سیاہ ہے جو ''سُکگیں ڈور'' کہلاتا ہے۔ یہ مقام صدیوں سے کبھی سیلابی مٹی کے نیچے سالوں تک دب جاتا ہے اور پھر سیلابی ریلے مٹی بہا کر اسے ظاہر کر دیتے ہیں۔ نمرود بلوچ کے اس قلعے کو آثار قدیمہ والوں نے ''بلوچستان کا سب سے بڑا شہر پناہ قرار دیا ہے'' (ملاحظہ کریں

"بلوچستان کے تاریخی گوشے" از الفت نسیم اور "بلوچستان ماقبل تاریخ" از ملک محمد سعید بلوچ مطبوعہ بلوچی اکیڈمی)

قدیم بلوچی روایتوں اور برسرزمین تاریخی آثار سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ ممکن ہے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوط کا سفر آخرت ابراہیمؑ کی پیدائشی وطن "حران" سے فدان آرام اور پھر ہمارے "حاران" کی طرف ہو۔ اور نمرود بلوچ وطن میں اللہ کی وحدانیت کی تبلیغ کو اپنے اور اپنی جھوٹی خودی کے لئے چیلنج گردانتے ہوں۔ بہرحال مندرجہ بالا تینوں تاریخی آثار تاریخ خاران کے مئولف کو استحکام بخشتے ہیں۔ جہاں تک عبدالقادر بلوچ کا سروچ کے بارے میں موقف ہے تو ہماری تحقیق اور جستجو میں خاران میں کوئی جگہ سروچ کے نام سے پایا نہ جاسکا البتہ ایک قدیم موضع اور اس کا پہاڑی سلسلہ "بسکروچ" کے نام سے موجود ہے۔ یاد رہے کہ انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا پردادا "سروچ" نامی شخص تھا اور خاران میں سروچ نامی بھی ایک جگہ ہے جو اُن کے نام سے منسوب ہے (صفحہ 32)

3۔ آئینہ خاران صفحہ 76-77۔

4۔ کتاب "سیستان" از جی پیٹ بیٹ، اردو ترجمہ پروفیسر انور رومان، صفحہ 310۔ قبیلہ ناروئی کی روایت کے مطابق مذکورہ ٹیلہ ہی قدیم خاران کا مرکزی مقام اور خاران قلعہ ہے۔ موجودہ خاران اپنے قدیم مقام سے ہٹ کر بسایا گیا ہے۔ جس کا قدیمی اصل نام بلخ رہا ہے۔

5۔ کتاب ایضاً، حاشیہ صفحہ نمبر 100۔

6۔ تفصیل کے لئے دیکھئے بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر، خاران، مطبوعہ ٹائمز پریس بمبئی 1907ء، صفحہ نمبر 3۔

7۔ مذکورہ بلوچی نام اس چیز کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ قدیم سیستان کے اس خطے میں ایک ہزار سال سے بھی پیشتر بلوچی زبان موجود تھی۔

8۔ دیکھئے "معجم البلدان" از یعقوب بن عبداللہ رومی حموی بغدادی، اُردو تلخیص از غلام جیلانی برق۔ صفحات نمبر 266 اور نمبر 276، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

9۔ "بولان" کے لئے ملاحظہ کریں اسی عنوان کا مضمون۔

10۔ مضمون "بُروھی" کی ذیل میں تفصیل پڑھیں۔

11۔ مضمون "بلیدی" ملاحظہ کریں۔

ڈوڈکی

" ڈوڈکی" لفظ سے جو معنی ذہن میں آتے ہیں وہ "ڈوڈک" والے یا ڈوڈک کے لوگ کے بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور معنی سطح زہن پر نہیں ابھرتا۔ یہ لفظ یا اصطلاح "تاریخ قلات" کے ضمن میں آخوند محمد صدیق نے اپنی تاریخ چہ "اخبار الابرار" میں دہوار قبیلہ میں موجود ایک طائفہ کا نام بتایا ہے۔ وہ اس نام کی وجہ تسمیہ ایک عجیب بے سروپا کہانی سے اخذ کرتا ہے جو صرف ان کی اپنی ذہنی اختراع معلوم ہوتی ہے یا پھر اُسے قبیلہ خواجہ خیل نے اپنی شہرت کے لئے ڈکٹیٹ کرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" میر بجار کی وفات کے بعد مغلوں نے آ کر قلات پر قبضہ کیا۔ ایک عرصے کے بعد مغلوں نے قلات کے دہواروں کے ساتھ قسم واقسام کیا کہ ایک دوسرے کو تلوار، بندوق، نیزہ، چھرا، زہر، پتھر، روڑا، لکڑی اور جوتے سے نہیں ماریں گے تا کہ ہمارے درمیان دوستی قائم رہے۔ چونکہ مغلوں کا شعار ہی ظلم کرنا تھا، دست تظلم دراز کرنا شروع کیا۔ قلات کے دہواروں نے آپس میں صلاح ومشورہ کیا کہ ہر قسم

کے ہتھیار اور زہر وغیرہ سے نہ لڑنے کی ہم نے قسم اٹھائی ہے اگر ان سے ہم مغلوں کو ماریں گے تو حق تعالیٰ کے ہاں ماخوذ ہوں گے پس اتفاق اس پر ہوا اور انہوں نے باجرے (ارزن) کی موٹی اور سخت روٹیاں پکائیں۔ ان روٹیوں کو کچھ دنوں تک سورج کی گرمی میں رکھ کر خشک کیا۔ پھر ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک روٹی بغل میں چھپائی اور مغل حاکم کے سلام کو گئے۔ اور ایک ساتھ انہوں نے مغل پر حملہ کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے بغل سے روٹی نکالی اور مغل کو مارا۔ بال آخر مارتے مارتے اُسے ہلاک کر دیا چنانچہ اب ان دہواروں کو ڈوڈکی کہتے ہیں۔"(1)

آخوند کو درج بالا کہانی ڈکٹیٹ کرانے والے دہواروں نے یہ بتایا نہیں کہ ڈوڈکی کس نسبت سے ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ڈوڈک، باجرے کی روٹی کا نام ہے۔ لیکن یہ نام غلط ہے باجرے کی یا جوار کی موٹی روٹی کو "ڈُڈُکی" کہتے ہیں اور یہ نسبت روٹی کے "ڈُڈُ" (سخت/ٹھوس) ہونے کی نسبت سے ہے۔ اور ڈُڈُکی سے ڈوڈکی نہیں بنتا۔ ویسے بھی مذکورہ کہانی از خود بتا رہی ہے کہ خود ساختہ ہے۔ کوئی گئے

سے گیا حاکم اس حد تک کمزور، خوفزدہ اور تنہا نہیں ہوتا کہ چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹے سے کاشتکار قبیلہ کے ساتھ لکڑی اور جوتے سے نہ لڑنے کا معاہدہ کرے۔ جبکہ قلات میں عددی اکثریت رکھنے والے دیگر طاقتور قبیلے موجود تھے جن کی موجودگی میں دہوار کے چند گھروں کی کچھ بھی حیثیت ہوتی نہیں تھی۔ اور پھر مغل حکمران جو بڑے بڑے ملکوں اور ان کی افواج کو خاطر میں نہیں لاتے تھے وہ کمزوروں سے اس قسم کا بیہودہ معاہدہ کیسے کرے گا۔

مذکورہ جھوٹی کہانی کے علاوہ آخوند نے یہ بتایا ہی نہیں کہ میر بجار کب اور کس سن میں مرا اور اس کا قلات کی حکومت سے کیا تعلق تھا۔ نیز مذکورہ مقتول مغل حاکم کون تھا۔ کہاں سے آیا؟ کیسے آیا؟ امن سے آیا؟ جنگ سے آیا؟ رشتے ناطوں سے آیا؟ آسمان سے گرا؟ زمین نے اگلا؟ بقول اس کے قبضہ کیا تو کیسے قبضہ کیا؟ جبکہ نہ قلات کی تاریخ میں کسی مغل حملے کا ذکر ہے اور نہ میر بجار میروانی (سوراب کا میروانی سردار) کے زمانے میں قلاتیوں کا کسی مغل لشکر سے لڑائی لڑنے کا ذکر ہے اور نہ ایسی کوئی روایت موجود ہے۔ جبکہ میر بجار ہی کی زندگی میں قلات کی حکومت پر احمدزئی بلوچوں کے جداامجد میر احمد خان 1666ء میں برسر اقتدار آئے تھے اور اس کے بعد سے 1948ء تک احمدزئی سلسلہ کا اقتدار ایک دن کیلئے بھی نہیں ٹوٹا تھا تو پھر مغل کہاں سے آ گیا۔ ثابت ہوتا ہے کہ آخوند محمد صدیق شیرازی کا مذکورہ بالا کہانی اس کے کتابچہ کے دیگر موضوعات کی طرح غیر حقیقی اور مفروضہ ہے۔

مذکورہ جھوٹی کہانی کے ذریعہ جس "ڈوڈکی" قبیلہ کی نشاندہی کی گئی ہے وہ قبیلہ نہیں ایک غیر بلوچستانی نقل مکانی کرنے والا طائفہ تھا جو علاقہ ڈیرہ غازیخان کے کوہ سلیمان میں قیصرانی بلوچ تمن کے علاقہ "ڈوڈک" سے نقل مکانی کر کے آئے تھے اور دہواروں کی اراضیات پر بطور بزگر کام کرتے تھے۔ جو پھر انہی کے بہی خواہ اور طائفہ بنے۔ "ڈوڈک" ملک کا مشہور و معروف آئل اور گیس فیلڈ ہے۔ مذکورہ لوگ اپنے سابق مسکن ڈودک کی نسبت سے پھر "ڈوڈکی" کہلائے۔

حواشی:

1۔ "اخبار الابرار" (فارسی) کا اردو ترجمہ بنام "تاریخ خوانین قلات" از میر گل خان نصیر صفحہ 29۔

ڈومبکی

ڈومبکی، بلوچوں کا پندرھویں صدی عیسوی کا ایک قبیلہ ہے جو کچھی میں آباد ہے اور لاہڑی گاؤں ان کا مرکز ہے۔ اکثر ڈومبکی اپنے کو رند نسل سے بتاتے ہیں۔ لیکن قبیلہ کا نام کسی ذات یا نسل کا اظہار نہیں کرتا۔ بلوچی قبائلی نظام میں جو قبیلہ اپنے کسی سابق مسکن کے نام سے شہرت پاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں سابق مسکن کو اپنی شناخت بناتا ہے تو یہ اس بات یا حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص نسل یا ذات نہیں ہے بلکہ اس کے سابق مسکن میں جہاں سے ہجرت کر گئے اور ذات یا نسل کے لوگ بھی ہوتے تھے جو اکثریت کے مرگ وزیست کے شریک تو ہوتے تھے لیکن ان کی قبیلائی شناخت اکثریت والی قبیلہ کی شناخت سے الگ رہا ہے۔ جب یہ صورت ہوگی تو ہجرت کرنے والا لشکر ایک خاص ذات کا نام اختیار نہیں کرتا بلکہ پھر وہ چھوڑے ہوئے مسکن یا گاؤں کے نام کو اپنی متفقہ شناخت بناتے ہیں۔ اور پھر قبیلہ کے اندر ہر کوئی اپنی چھوٹی اور بڑی شناخت کے ساتھ زندہ اور نامدار رہتا ہے۔ اور بڑے اور بالادست قبیلہ یا گروہ سے تصادم نہیں کرتا بلکہ اس کے تابع فرمان رہتا ہے۔

قبیلہ ڈومبکی کو رند تواریخ کا جسے رند شاعروں نے نادانی میں بلوچ تواریخ کا نام دیا ہے، محافظ اور ''محافظ خانہ'' بتایا ہے۔ قدیم رند قبائل کی تواریخ (قلمی) اور شجرہائے نسب کا

دپتر (ریکارڈ، دستاویزات) اسی قبیلہ کے پاس محفوظ رہے ہیں اس قبیلہ کے شعراء اور داستان گو انہیں سینہ بہ سینہ منتقل کرتے چلے آرہے ہیں۔

رائے بہادر ہتورام نے اس قبیلہ کے درج ذیل طائفے لکھے ہیں:۔

1۔میروزئی، 2۔وزیرانی، 3۔محمدانی، 4۔براہمانی، 5۔سہریانی، 6۔بھنڈ، 7۔بغدر، 8۔دیناری، 9۔شب کور، 10۔ٹالانی، 11۔گبول، 12۔جمنانی، 13۔کھوسہ، 14۔لاشاری، 15۔سنگیانی، 16۔گشکوری، 17۔گورگیج، 18۔غازیانی۔(1)

مندرجہ بالا طائفوں میں جو میر چاکر رند کے زمانے کے تشکیل شدہ قبیلے تھے وہ میروزئی، وزیرانی، محمدانی، براہمانی، بھنڈ، بگدار، گبول، کھوسہ، لاشاری، گشکوری، اور گورگیج تھے۔ لیکن وہ بنیادی قبائل چند تھے جن کی تشکیل مکران میں ہوئی تھی۔ اور ان قبائل کے نام کا لاحقہ ''آنی'' نہیں ہے۔ بلکہ وہ مفرد نام پر اور ''زئی'' لاحقہ کے ساتھ ہیں(2)

مندرجہ بالا ڈومبکی طائفوں میں وزیرانی، محمدانی، براہمانی اور دوسرے ''آنی'' لاحقے والے طائفے قلات اور سبی وغیرہ کے علاقے کے تشکیل شدہ طائفے ہیں۔ جبکہ میروزئی، بھنڈ، بگدار، گبول، کھوسہ، لاشاری، گشکوری اور گورگیج مکران کے تشکیل شدہ قبائل ہیں۔ میروزئی اور گشکوری کے سوا باقی قبیلے میر شیہک کے زمانے سے قبل بھی مکران میں موجود تھے۔ مگر لاشاری مشرقی مکران میں نایاب تھا۔ بھنڈ اور بگدار کچی دشت کے قبیلے تھے اور رندوں کی مغربی مکران آمد سے قبل وجود رکھتے تھے۔ بھنڈ اور

بگدار مکران کے جت (بلوچ شتر پال) تھے۔ نامور قبیلہ "جمالی" کے جدامجد جمال کو مکران میں اسی بھنڈ قبیلہ سے روایت کیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کئی لوگوں کے ذریعے عراق و ترکی تک اونٹ برآمد کرتا تھا۔ اس کی پانچویں پشت سے قبیلہ کا پہلا سردار منتخب ہوا جس کا نام ہذیل جمالی تھا۔ "بگدار" قبیلہ کا نام تو ہے لیکن اس کے معنی اونٹوں کے گلے رکھنے والا یا اونٹوں کے گلوں کا مالک جو اس قبیلہ کی بنیادی امارات کو ظاہر کرتا ہے۔

ڈومبکی جب تک قلات میں رہے تھے وہ ڈومبکی نہیں کہلاتے تھے بلکہ "براہیم زئی رند" کہلاتے تھے یہ براہیم زئی رند بڑے لڑاکو اور جھگڑالو ہوتے تھے۔ ابتداء میں یہ ایک قدیم موضع "ڈومبک" میں رہائش پذیر تھے۔ جہاں اور بھی جاٹ اور دیگر طائفے بھی تھے۔ یہ تمام ایک قبیلہ کی شکل میں ڈل کر براہانی کہلائے۔ ڈومبک کی چھوٹی سی وادی سراوان کے ناگاؤ پہاڑی سلسلہ کے دامن میں کلتاچ وادی کے مشرق کی طرف ہے۔ جسے رائے ہتورام اور انگریزی گزیٹئر نے ایرانی بلوچستان میں واقع بتایا ہے جو غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قلات سے مغرب کی طرف تا آخری حد ایرانی بلوچستان کوئی ایک ڈومبکی گھر بھی نہیں ہے۔ روایت ہے کہ "ڈومبک" وادی میں ایک بڑا سیلاب آیا تھا جس نے وہاں تباہی مچادی اور گاؤں ویران ہوا۔ بچے کھچے "براہانی" اور دوسرے رہائشی وہاں سے نکل کر "موضع لاہڑ میں بس گئے۔ یہاں وہ ڈومبک گاؤں کی نسبت سے ڈومبکی کہلائے۔ ان ڈومبکیوں میں براہانی رندوں کے

علاوہ دیگر طائفوں کے لوگ بھی تھے اور ڈومبکی ان سب کی شناخت تھی۔ مذکورہ علاقوں سے رند قبائل آہستہ آہستہ سنی اور کچھی کی طرف نقل مکانی کر رہے تھے۔ اسی نقل مکانی کے نتیجے میں "لاہڑ" موضع میں بسنے والے براہانی ڈومبکی اور ان کے بعض غیر رند ڈومبکی بھی ہجرت کر گئے۔ اور کچھی میں آباد ہوئے۔ اور وہاں یہ ڈومبکی اپنے دوسرے مسکن "لاہڑ" کی نسبت سے لاہڑی کہلائے۔ اور نئے موضع کا نام بھی ان لاہڑ کے ڈومبکیوں کی نسبت سے "لاہڑی" پڑ گیا۔ جو ان کے سابق مسکن کی نشاندہی کرتا ہے نہ کہ ان کے قبیلے کی۔ "لاہڑ" کے بعض ڈومبکی بجائے کچھی جانے کے نرمک میں آباد ہوئے اور پھر آس پاس پھیلتے گئے یہ "لاہڑی" ایک الگ قبیلہ بنا جو کہ وہی ڈومبکی ہی تھے۔ جن کا مرکزی طائفہ ان کا خالص گھرانہ براہیم زئی ڈومبکی تھا۔ یہ قبیلہ آج تک لاہڑی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ جو کہ وہی ڈومبکی ہیں۔ جنہوں نے کچھی میں لاہڑی آباد کیا۔ سراوان گزیٹئر نے لاہڑی قبیلہ کے بارے میں لکھا ہے کہ

> " اس کے چھ حصے ہیں۔ یعنی براہیم زئی حیدرزئی، زہیرانی، شادیانی، خلیجامی اور شنگرانی۔ پہلے دونوں قبیلہ کا مرکزہ ہیں اور ڈومبکی بلوچوں سے ماخوذ ہیں۔ باقی تمام بیگانے ماخذ کے ہیں۔ زہیرانی پُھو رند (3) ہیں۔ خلیجانی بلوچ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ شادیانی ذگر مینگلوں سے برآمد ہوئے اور

شنگرانی افغان ہیں(4)۔ نرمک قبائلی صدر مقام
ہے اور یہیں اکثر براہیم زئی، حیدرزئی، زبیرانی اور
شادیانی رہتے ہیں۔"(5)

حواشی:

1۔بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر سراوان، مطبوعہ گوشہ ادب 1997، صفحہ 294۔

2۔قدیم بلوچی قبیلائی نظام میں چند رہنما اصول قبیلے کی تشکیل میں کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

ہر شخص کے نام پر کوئی قبیلہ تشکیل نہیں پاتا۔ بلکہ کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام دینے کی صورت میں متعلقہ شخص کے نام پر تفاخر کے طور پر قبیلہ تشکیل پاتا ہے جو اس شخص کے نام کو رکھنے کی ایک صورت ہے۔ اور قبیلہ اُس سے شناخت پاتا ہے۔ اگر ایسے شخص کے نام کو اس کے بیٹے یعنی اولاد وراثتی طور پر اپنائیں تو ان کے نام کے ساتھ متعلقہ مشہور شخص کا نام آئے گا۔ اس کی صورت محدود ہوتی ہے۔ جیسے اگر متعلقہ شخص کا نام ہوت تھا اور بیٹوں نے اسے اپنی شناخت بنادی اور ہر بیٹا اپنے نام کے ساتھ ہوت کا استعمال کرے گا۔ اسی طرح نواسوں کے نام کے ساتھ بھی ہوت ہی استعمال ہوگا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہیگا جب تک کہ اس سلسلہ کو اس خاندان کا کوئی دوسرا شخص منقطع نہیں کرے اور اس کے نام سے کوئی نیا قبیلہ یا طائفہ نہ بنے۔ اس اصول کی مثال بلوچوں کے رند، ہوت، براہو، جاموٹ (جام ہوت)، سنگر، لاشار، زہری وغیرہ ہیں۔

بعض اوقات کسی مقصد کے تحت یا خوشی وغم شریکی کی بنیاد پر کچھ لوگ یا گروہ یا طائفہ کسی قبیلے کے اتحادی اور الحاقی بن جاتے ہیں تو وہ اپنی انفرادیت سے دست بردار ہوتے ہیں اور اس قبیلے کی نسبت سے اس کا ایک ذیلی طائفہ بن جاتے ہیں جیسے لاشار سے لاشاری، براہو سے براہوئی، گولہ سے گولائی، دہوار سے دہواری، رئیس سے رئیسی وغیرہ۔

تیسرے اصول کے تحت کسی مشہور شخص کے بیٹوں اور وارثوں کے ساتھ ساتھ اس کے قریبی عزیز اور گھرانوں کے افراد بھی متعلقہ مشہور شخص سے کچھ تعلق کی بنا پر اسے اپنی شناخت بناتے ہیں۔ اور ایک اتحادیہ قائم ہوتا ہے جن کا خون مشترک ہوتا ہے اس صورت میں اس شخصیت کے نام کے ساتھ اُس کے زئی (اپنے لوگ) منسلک ہوجاتے ہیں اور وہ تمام اس کے زئی بن جاتے ہیں جیسے میرو سے میروزئی، احمد سے زئی، محمد سے محمدزئی، زرک سے زرکزئی، دینار سے دینارزئی شاہو سے شاہوزئی وغیرہ۔

بعض اوقات کسی مقام کے رہائشی اپنے قدیم مسکن سے کہیں اور ہجرت کرجاتے ہیں اور اس مقام یا گاؤں کی نسبت سے نئے نام سے پہچانے جاتے ہیں اور یہی نام پھر ایک مشترکہ قبیلہ کی قبیلائی شناخت بن جاتا ہے۔ اس اصول میں ایک تخصیص یہ ہے کہ اگر سابقہ مقام میں ایک نسلی قبیلہ رہائش پذیر تھا اور وہی قبیلہ نئے مقام پر چلا گیا تو وہ اپنا سابق قبیلائی نام برقرار رکھتا ہے۔ اور دوسرے لوگ انہیں ان کے سابق گاؤں یا موضع کے نام سے شناخت کرتے ہیں اور اسی گاؤں کے نام سے پکارتے

ہیں۔ اس طرح نیا مقام پرانے مسکن کی نسبت سے نام پاتا ہے لیکن قبیلہ کا نام نہیں بدلتا۔ جیسے کہ ڈومبکی قبیلہ "لاہڑ" سے کچھی جا کر آباد ہوئے تو اُن کا نیا موضع ان کے سابق موضع "لاہڑ" کی نسبت سے "لاہڑی" یعنی "لاہڑ والے" ہو گیا مگر اس کے آباد کرنے والے اپنے سابق نام سے ڈومبکی ہی رہے۔

اس کے برخلاف اگر قدیم موضع میں مختلف طائفے آباد تھے اور وہ اجتماعی طور پر کسی اور مقام پر جا کر آباد ہوئے تو ان سب کی شناخت قدیم موضع کا نام ہوگا اور پھر وہی ان کا قبیلہ بنے گا۔ جیسے کہ گاؤں "لاشار" سے جانے والے لاشاری، مگسی سے جانے والے مگسی، گزگ سے جانے والے گزگی، گشکور سے جانے والے گشکوری وغیرہ۔ ان کے باسی مختلف اور متفرق طائفے یا طائفوں کے لوگ تھے۔ جن کی پھر قبیلائی نام یہی پڑے۔ قبیلہ کی تشکیل کا ایک اصول کسی شخص یا کسی قبیلہ کے نام "آنی" کے لاحقے کا استعمال ہے۔ قبیلائی تشکیل کا یہ طریقہ قدیم نسلی بلوچوں میں مفقود رہا ہے۔ اس کی ابتدا ترک نژاد رند قبائل سے تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی سے دیکھی گئی ہے۔ جنہوں نے ہنگامی حالات کے نتیجے میں "آنی" کا استعمال کیا ہے۔ جیسے کہ اگر جنگ کی تیاری اور دشمن کے خلاف ایک وسیع تر اتحاد بنایا جاتا یا پھر قبیلہ کو وسعت دینے کی خاطر عام گروہوں یا طائفوں کو قبیلہ میں داخلے کی اجازت دینی مقصود ہوتی تو اس صورت میں مرکزی مشہور شخصیت یا مرکزی طائفہ کے نام کے ساتھ "آنی" کا اضافہ کر دیا جاتا ہے یہ ایک وسیع کنفیڈریشن کی صورت ہو جاتی ہے جیسے شخصیتوں کی

نسبت سے :

کمبر سے کمبرانی، عمر سے عمرانی، نُوح سے نوحانی، شاہو سے شاہوانی، قلندر سے قلندرانی، گرگین سے گرگیناني وغیرہ وغیرہ۔

اور قبیلوں کی نسبت سے :

رئیس سے رئیسانی، میرو زئی سے میروانی، مندوزئی سے مندوانی، ہوت سے ہوتانی، جتک سے جتکانی، لانگہ سے لانگہانی، نوت سے نوتانی وغیرہ وغیرہ۔ مشرقی بلوچوں نے یہ تخصیص نہیں رکھی اور انہوں نے اسے بلا تخصیص قبیلہ کی تشکیل میں استعمال کیا۔

ایک دیگر اصول کے تحت بعض اوقات کوئی فوجی دستہ، یا جنگی لشکر کسی خاص نشانی یا وردی کی وجہ سے ایک نام پاتا ہے۔ پھر وہی خصوصی نشان اُس کے استعمال کرنے والوں کا قبیلائی شناخت بن جاتا ہے۔ اس کی مثال سُرپرہ (سر یعنی دستار پر پَر لگانے والا)، سیاہ پاد، (پیروں میں کالے بوٹ پہننے والے)، کُچک یا کُشک (سفید سیپی کے بٹن والے) وغیرہ وغیرہ۔

بعض اوقات پیشے کی نسبت سے قبیلہ تشکیل پاتا ہے۔ مثلاً لوہار سے لوہارانی، مُلا سے ملازئی، کوئلہ (انگار) بنانے والے سے انگاری، بگ (اونٹوں کا گلہ) پالنے والے سے بگدار، بگ چرانے والے سے بگ جٹ یا جٹ۔ ٹالبُر (قبیلہ یا لشکر کا لکڑہارا) سے ٹالبُر (ٹالپور) وغیرہ وغیرہ۔

3۔ زبیرانی لاہڑی کا جدامجد ''زبیر نامی رند تھا۔ جو میر چاکر رند کے ایک جوشیلے کماندار اور دست راست ''جاڑو رند'' کی اولاد میں سے تھا۔ یہ وہی جاڑو رند ہے جس نے سردار چاکر خان کی قول کی پاسداری کے آزمائش میں اپنے معصوم نوخیز بیٹے کی گردن تلوار کے ایک وار سے اڑادی اور قول کو بیٹے پر قربان نہیں کیا۔

4۔ شگرانیوں کے ایک معتبر فتح محمد نے ہمیں (1994) میں بتایا کہ ان کے طائفے کا افغان ہونا غلط ہے۔ ان کا جدامجد شیر دل رخشانی پنجگور کے مگی راستے پر پڑنے والا موضع ''شگر'' سے خون کر کے قلات کے کوہستان میں اپنے تیرہ لوگوں کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے دادا کا نام ''اوغان'' تھا۔ شاید اسی غلط فہمی میں انہیں افغان لکھا گیا ہے۔

5۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹئر سراوان مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 1997ء صفحہ 930۔

رند قبیلہ: علاقی عرب؟

رند قبائل بشمول اپنے سینکڑوں طائفوں کے شاید موجودہ وقت میں نمایاں بلوچ قبائل میں سب سے بڑی اکثریت رکھتا ہے جو تمام پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔ اس قبیلہ نے اپنی قدیم روایتی شاعری میں اپنے کو ''حلب'' سے آنے والا بلوچ قبیلہ کہا ہے اور اپنی تاریخ کو بلوچ تاریخ کا نام دیا ہے۔ اسی قدیم شاعری کو جو نسب نامہ کے نام سے مشہور ہے، بلوچ تاریخ کا ماخذ مانتے ہوئے مصنفین اور تاریخ نویسوں نے انہی سے اور ان کے ایران میں ورود کرنے کے زمانہ سے بلوچ تاریخ کی ابتداء کی ہے۔ حالانکہ یہ تاریخ اور متذکرہ زمانہ رندوں کے آمد کا زمانہ اور رند قبائل کی تاریخ ہے۔ بلوچ تو من حیث القوم موجودہ بلوچستان کے متحدہ مکران میں گذشتہ پانچ ہزار سال سے موجود رہا ہے۔ اسی طرح وادی مستونگ اور کوئٹہ میں ہزاروں سالوں سے اس کی موجودگی ثابت ہے۔ جو رند نہیں تھے۔ رند ہونا تو دور کی بات ہے بلکہ رندوں کا جدامجد اَلمش رومی بھی اُس وقت پیدا نہیں ہوتے ہوں گے۔ نامور مورخ ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ میں گندمی رنگ کے گدروشیائی بلوچوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کا ایک دستہ چیتے کی کھالوں میں ملبوس تھا اور شاہ ایران زرکسں کی افواج کے چھپن دستوں میں سے ایک تھا۔ یہ زمانہ حضرت مسیح کی پیدائش سے 485 تا 465 سال قبل کا زمانہ ہے۔ اسی طرح جب شاہ ایران کیخسرو نے توران کے افراسیاب کے خلاف جنگ کی تو اس میں بلوچ

جنگی سپاہ نے جو بے مثال کارنامے سرانجام دیئے وہ بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔ فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں ان واقعات کو نظم کیا ہے۔ واضح ہو کہ کیخسرو کا زمانہ 585ق م تا558ق م رہا ہے۔ یہ وہ زمانے تھے جب بلوچ ایک بڑی قومی حیثیت میں وجود رکھتے تھے۔ یقیناً یہ بلوچ رند ولاشاری وکورائی وجتوئی تو نہیں تھے۔ اور وہ ادوار ملاوٹی قوموں کا زمانہ نہیں رہا ہے۔ یقیناً وہی بلوچ قبائل ہی نسلی بلوچ قبائل تھے جن کی تاریخ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی سے شروع نہیں ہوتی۔ نیز وہ عظیم قوم اور اس کے قبائل اسی متحدہ مکران ہی کی سرزمین پر وجود رکھتے تھے۔ جبکہ "بلوچ" قوم کا جد امجد بلوچ (معرب بیلوص) کا وجود 8000 ق م میں ثابت ہے جس نے ملک لیڈیا اور قرب جوار پر دنیا کی پہلی بادشاہت قائم کی۔ صدیوں بعد انکی نسل کا مشرک نمرود بلوچ ،اسی مکران کی سرزمین کے گوادری دشت میں سکونت رکھتا تھا جس نے کالدیا پر حکمرانی کی۔جس کے قلعے کے دیوہیکل ملباتی آثار آج بھی "نمرود قلات" اور "دستگیں ڈور" کے نام سے موجود ہیں۔ ان تمام تاریخی شواہد کی موجودگی کے باوجود رند نسل کے سردار جلال خان کی سربراہی میں ایران میں داخل ہونے والے چوالیس پھاڑوں سے بلوچ قوم کی تاریخ کی ابتداء کرنا اور بلوچ قوم کو پندرھویں صدی عیسوی کی قوم بتانا یا تو جہالت اور بلوچ تاریخ سے چشم پوشی ہے یا پھر بلوچ قوم اور اس کی تاریخ سے دشمنی ہے۔ جہاں رند قبائل کا تعلق ہے یہ ثابت ہے کہ وہ باہر سے مغربی مکران میں داخل ہوئے۔ جس دور میں یہ چوالیس (1) قبائل آئے تھے اس دور کی کوئی محفوظ شاعری

ان کے پاس نہیں ہے اور جو ان کا محفوظ دفتر ہے جسے وہ بلوچی تاریخی دفتر کا نام دیتے ہیں اور کچھی کے ڈومبکیوں کے پاس ہے اس میں سبی اور تلی میں ان کی آبادکاری کا ذکر موجود ہے جو ثابت کرتا ہے کہ وہ سولہویں صدی عیسوی کی ابتدائی دو عشروں کے درمیان کی شاعری ہے۔ جس میں شاعر نے تقریباً سات سو سے نو سو سال قبل کی باتوں سے ابتدا کی ہے۔ جن کی صداقت کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنفین نے ان کے بارے میں مختلف خیال آرائیاں کی ہے۔ اور انہیں نسلاً بلوچ تسلیم نہیں کیا ہے اس بارے میں ایک یوروپی محقق لکھتا ہے :

" بلوچوں کی متداولہ روایت جو جلال خان یا جلال حان کے گرد گھومتی ہے اور جس کے چار بیٹے تھے۔ رند، ہوت، لاشار، کورائی اور ایک بیٹی مائی جتو، شک وشبہ کی زد میں آسکتی ہے کیوں کہ مکران کے ہوت تمام اسناد کی بنا پر اس علاقہ کے اصلی باشندے گردانے جاتے ہیں اور وہ خود بھی اپنے آپ کو رندوں اور علاقہ کے بلوچ قبائل سے علیحدہ نسل سمجھتے ہیں۔"(2)

ایک اور یوروپی مصنف میجر موکلر اپنے مقالہ میں رند قبائل کے بارے میں لکھتے ہیں :

" رند جو ٹھیٹ بلوچ ہونے کے دعویدار ہیں اور
حلب سے آئے ہیں سراسر مشکوک ہے بلکہ وہ لوگ
ہیں جو اعلاف نامی شخص یعنی قبیلہ موسومہ بہ علافی قحطانی
عمانی ہیں"(3)

اور تقریباً یہی نظریہ انگریز محقق ہولڈچ کا ہے جس کا حوالہ مکران گزیٹر نے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد 64 حصہ اول نمبر ایک 1895ء صفحہ 13 سے دیا ہے۔

محولہ بالا محققین کو رندوں کے عمانی عرب ہونے کا خیال اسی لئے ہے کہ یہ قبائل اسلامی دور کی ابتدائی صدیوں میں بلوچستان میں آئے تھے اور اسی زمانے میں متعدد عربی تجارتی، تبلیغی اور جنگی گروہ ہند و سندھ کی طرف آ رہے تھے۔ دوسری طرف رندوں کی شاعری میں انہیں شام کے حلب سے آنے والا بتایا گیا ہے اور شام عربی ملک ہے۔ اس کے علاوہ نویں دسویں صدی کے بعد چند عمانی قحطانی بھی مکران میں آباد ہو چکے تھے۔ اور بعد کے سالوں میں وقتاً فوقتاً عمانی عرب آتے رہے ہیں اور بلوچستان میں آباد ہوتے رہے ہیں جیسے کہ بڑ، بوسعیدی، قحطانی، اور دیگر عرب قبائل مزہ، غزہ، بردی، بولان، صیدا، بریدہ، صابرہ، یزیدی وغیرہ۔ اسی بنا پر انہوں نے رندوں کو بھی عمان سے آنے والے "علافی" فرض کر لیا۔ حالانکہ اُن کے اجداد کے نام، ان قبیلوں اور مساکن کے نام عربی کلچر سے مطابقت نہیں رکھتے اور اس کے برعکس زیادہ تر ترکی ہیں۔(4)

حواشی:

1۔ رندوں کی محولہ شاعری یعنی نسب نامہ میں چوالیس قبائل کی مغربی مکران میں آمد بقول ان کے سردار جلال خان رند کی سرکردگی میں ہوئی۔ اس کے ساتھ دوسری روایت یہ ہے کہ جلال خان کے قبائل ایرانی بلوچستان یعنی اُس وقت کے مغربی مکران میں پانچ سو سال تک رہے۔ اور جلال خان کے چار بیٹوں یعنی رند، ہوت، لاشار اور کورائی (کورائی قبیلہ کا نام ہے جو یقیناً کورا" کی نسبت سے ہے جو مشرقی مکران میں "کوڑا" تلفظ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا بیٹے کا نام کورا ہوگا نہ کورائی) تھے۔ جن کے نام سے قبیلے بنے۔ اور قبیلے دونوں میں نہیں بنتے۔ اس لئے ہم ماننے پر مجبور ہیں کہ کم از کم ایک صدی کے دوران اُس کے بیٹوں کے نام سے قبیلے بنے جو وہاں مختلف جگہوں پر آباد ہوئے اور انہیں اپنے نام سے شہرت دیدی۔ موضع لاشار کو ہم جلال خان کے ایک بیٹے کی نسلی خاندان پر مشتمل قبیلہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح علاقہ زاہدان میں رند نام کا موضع بھی ہے اُسے بھی اسی کے رند بیٹے کا نسلی قبیلہ مانتے ہیں۔ ہوت کے نام سے ایک موضع "ہیت" بھی موجود ہے (مغربی مکران کے بعض قبائل "و" کو "ی" سے بولتے رہے ہیں اور اب بھی بولتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بھی جلال خان کے ہوت بیٹے کی خاندان پر مشتمل قبیلہ کا مرکز رہا ہو۔ باقی "کورا" یا "کورائی" اور "جتو" یا "جتوئی" کے وہاں کوئی آثار نہیں ہیں یا کم از کم تا حال ہمیں ان کے بارے میں کسی قسم کی معلومات نہیں مل سکی ہیں۔ یہ بات تو ہر کوئی ماننے پر تیار ہے کہ جلال خان کے بیٹوں کے ناموں سے قبیلے وجود میں

آنے تک جلال خان زندہ نہیں رہا ہوگا ویسے بھی ان کا دعویٰ ہے کہ وہ مغربی مکران میں جہاں اُن کی نسل پھیلی، وہ پانچ سو سال تک رہے۔ اور جلال خان نے پانچ سو سال کی عمر نہیں پائی تھی۔

پھر اپنے دعوے کے دوسرے حصے میں وہ کہتے ہیں کہ جب (کیچ) میں جلال خان مر گیا اور اُسے دفن کرنے لے گئے تو ہوت کی ماں نے قلعہ کے دروازے بند کر دیئے۔ اور کہا کہ ملک کیچ اور سرداری کا حقدار اس کا کمسن بیٹا ہے جسکی عمر ابھی سات سال تھی۔ جب جنازہ سے واپس آئے تو اس کے چاروں بیٹوں یعنی رند، لاشار، ہوت، کورایا کورائی نے قلعہ سے باہر الگ الگ چھپر بنا کر بیٹھ گئے اور فاتحہ لی جبکہ ہوت قلعہ کے اندر پوشیدہ طور پر فاتحہ لیتا رہا۔ (تاریخ بلوچستان از ہتورام اور دیگر تمام تصنیفات)

ایک طرف تو روایت ہے کہ جلال خان مغربی مکران میں وارد ہوا جہاں اُس کی نسل پھیل کر ہزاروں نفوس تک پہنچ گئی اسی سرزمین پر اس کے بیٹوں کے نام سے قبیلے بنے جہاں وہ پانچ سو سال تک رہے اور اس دوران قبیلوں سے دیگر سینکڑوں طائفے وجود میں آئے۔ اور دوسری طرف پانچ سو سال کے بعد وہی جلال خان کیچ پر حاکم نظر آتا ہے۔ وہیں مرتا ہے اور اس کے چاروں بیٹے دوبارہ نوخیز ہو جاتے ہیں اور باپ کے فاتحہ پر الگ الگ بیٹھتے ہیں۔ جس ہوت کا قبیلہ اس زمانے تک ہزاروں کی تعداد تک پہنچ چکا تھا وہ ''ہوت'' اب از سر نو سات سال کا بن جاتا ہے۔ اور ملک کیچ کی حاکمی اور

سرداری کو اپنا حق جتا کر اس پر قابض ہو جاتا ہے۔ اگر جلال خان کی مغربی مکران میں آمد سے لے کر کیچ میں اُس کے مرنے کے درمیانی سال شمار کئے جائیں تو یہ کم از کم آٹھ سو سال بنتے ہیں جو جلال خان کی عمر بن جاتی ہے۔ اور اس کا ہر بیٹا دوبارہ جنم لیکر دوسری مرتبہ اپنے اپنے نام کے قبائل جنم دیتے ہیں۔

اس قسم کی بے سروپا کہانیاں تواریخ کو مشکوک بناتی ہیں۔ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ جلال خان اور اس کے قبائل کربلا کے واقعہ کے دوران ایران اور مُرکی کی سرحد پر واقع حلب نامی گاؤں سے مغربی مکران کے بمپور اور متصل علاقوں میں داخل ہوئے جہاں جگین اور ہارین (ہارون) بندر بھی واقع تھے اس علاقے کا شمال مشرقی سرحد سیستان تھا۔ یہیں پر وہ آباد ہو کر پھر پورے مغربی مکران میں پھیلتے رہے اور ان کے کئی گروہ مشرقی پہاڑیوں اور دشت وغیرہ تک بھی آ کر آباد ہوئے۔ جن کی مقامی قدیمی نسلی بلوچ، رئیس قبائل (غیر ترکمان نسل) اور جاٹ قبائل نے مزاحمت کی اور ان مزاحمتوں کی بنا پر وہ اندرون مکران یعنی مند و کیچ کے اضلاع میں ورود نہ کر سکے۔ کیچ کا ملک اس زمانے میں رئیس قبیلہ کے قبضے میں تھا۔ اس زمانے میں قبیلہ ''ہوت'' کا بھی کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ اگر اس روایت کو کہ ''ہوت'' قبیلہ رند قبیلہ کا برادر قبیلہ ہے تسلیم کیا جائے تو پھر کیچ میں ''ہوت'' قبیلہ کی آمد ایک لمبے عرصے کے بعد ہوگی۔ کیوں کہ مغربی مکران سے علاقہ کیچ میں رند قبائل (بشمول ان کے ہم نسل قبائل) کی آمد کو روکنے کیلئے مقامی قبائل کا اعلان تھا کہ

" ہوش بے پہ گوش بے"

" کاہ بے پہ ساہ بے"

یعنی اگر آنے والے نے کھجور کا ایک خوشہ بھی توڑا تو اُس کے بدلے اُس کے کان کاٹ دیئے جائیں گے اور اگر کسی کی مویشی نے اُن کے علاقے میں گھاس چری تو اُس کے مالک کو قتل کیا جائے گا۔ اور اس قول کے نتیجے میں کشت وخون بھی ہوتے رہے۔ اور کئی پشتوں تک ہوتے رہے۔ اور انہیں مزاحمتوں کے نتیجے میں رند اور ان کے اتحادیوں کی یلغار کوہستانی علاقوں کی طرف ہوا تھا۔ جب سردار شیہک رند کا زمانہ آیا تھا تو وہ مشرقی مکران کے آخری کونے سرمکران یعنی کولواہ میں آباد تھے۔ اگر رندوں کا کیچ ملک پر کسی قسم کی بالادستی یا عمل دخل ہوتا تو سردار شیہک اور سردار چاکر خان کا مرکز کولواہ کے آشال قلات کی بجائے کیچ قلات ہوتا۔ رندوں کی شاعری میں بعض واقعات کو "کیچ مکران" سے جو منسوب کیا گیا ہے تو اُن سے مراد "خاص کیچ نہیں ہے بلکہ "کولواہ" ہے جو کیچ مکران میں واقع تھا۔

جلال خان کے ہمراہ جن چوالیس قبائل کا ذکر روایتی شاعری میں ملتا ہے تو ان میں آدھے سے زیادہ قبیلے وہی ہیں جن کی تشکیل کولواہ، قلات اور کچھی اور سبی میں ہوئی ہے۔ اور جلال خان اُن قبائل کی تشکیل سے سینکڑوں سال قبل وجود رکھتے تھے اور اُسے کبھی بھی مغربی مکران کی سرزمین دیکھنا نصیب نہیں ہوا ہے اگرچہ ایک دو مقامات کے

آثار کو ان کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ جیسے کہ پنجگور میں ایک مٹی کی قدیم ڈھیری "جلاری "حاک" (جلال خان کی ڈھیری) واقع ہے جسے اُس کا ایک وقتی قلعہ کے آثار بتایا جاتا ہے۔ جو کہ یقیناً غلط ہے۔ پنجگور میں تو صدیوں بعد بھی رندوں کے چند گھر بھی نہ بن سکے۔ جو اس ڈھیری کی روایت کے جھٹلانے کو کافی ہے۔

نیز یہ خیال بھی اپنی جگہ درست ہے کہ جلال خان مع اپنے چوالیس قبائل کے مغربی مکران یعنی ایرانی بلوچستان میں آباد ہوئے۔ وہ قبیلے جو اُن کے ہمراہ ایران میں باہر سے آئے تھے وہ کون کون سے قبیلے تھے۔ ان کے نام کسی کو معلوم نہیں ہیں۔ جو قبیلے سردار شیہک یا اُس کے والد شہداد کے ساتھ مغربی مکران میں آئے تھے آیا ان میں متذکرہ چوالیس قبائل کے بھی طائفے شامل تھے یا نہیں، اس بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا۔ مختصر یہ کہ جلال خان اور اس کے ہمراہ آنے والے قبیلے، اس کا زمانہ آمد ایرانی بلوچستان میں پانچ سو سال کی سکونت اور مزید سینکڑوں طائفوں کا جنم، صدیوں بعد وہاں سے رندولاشار وغیرہ قبائل کی نقل مکانی، مشرقی مکران میں آمد، کیچ میں مفروضہ حکمرانی، کیچ میں جلال خان کی صدیوں بعد موجودگی اور مرنے کی کہانیاں ایسی گھتیاں ہیں جو سلجھنے والی نہیں ہیں کیوں کہ تقریباً سات آٹھ سو سال کے واقعات کی کڑیاں کہیں نہیں ملتیں۔ البتہ اس ضمن میں چند حاصل کردہ نتائج اپنی جگہ بالکل درست اور حقائق ہیں:۔

(الف) یہ کہ جلال خان، ترکی اور ایران کی درمیانی پٹی کے موضع حلب سے واقعہ کربلا کے دوران ایران میں وارد ہوئے اور اس کی بڑی وجہ ایران میں امن وامان کا تھا۔

(ب) یہ کہ جلال خان ایران ہی میں اپنے قبائل کے ساتھ آباد ہوا اور جتنی بھی عمر پائی وہیں انتقال کر گیا۔

(ج) یہ کہ میر شیہک رند کے گھرانے کا شجرہ جلال خان تک جو صرف چار پشتوں تک ہے مشکوک ہے۔ کیونکہ کوئی پشت 25 سے 30 سال سے زیادہ کا نہیں ہوتا اور یہ ناممکن ہے کہ شیہک رند ایک سو بیس یا ڈیڑھ سو سال کے دوران، سات آٹھ سو سال قبل کے میر جلال خان تک پہنچے۔ اگر واقعی یہ شجرہ چار پشت تک صحیح ہے تو پھر یہ جلال خان کوئی دوسرا یا تیسرا یا چوتھا جلال خان ہوگا اور اس سے اوپر رند ولاشار وغیرہ فرزندان جلال خان کا جو نام آتا ہے یہ سارا سلسلہ بہت مختصر اور یقیناً غلط ہے۔ اسی طرح جلال خان اوّل سے میر احمد المعروف بلوچ تک کا شجرہ بھی مشکوک اور غلط معلوم ہوتا ہے۔

(د) جلال خان کے اوّلین اجداد کے نام، رند ولاشار وغیرہ قبائل کے اسماء اور اُن مواضعات کے نام جہاں جلال خان کے قبیلے آباد ہوئے، اکثر ترکی نام ہیں۔ جو ان کے ترک ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ چونکہ مغربی مکران تا حدود کیچ خطہ ہزاروں سالوں سے بلوچ نسلی قبائل کا مرزبوم ہے اس لئے یقینی ہے کہ مذکورہ ترک نسل قبیلے روایت کردہ پانچ سو سال کے دوران ہی بلوچ قوم میں مدغم ہوئے اور بلوچ کہلائے۔

(ر) خود جلال خان وغیرہ کا جدامجد اغلمش رومی، ترکستان کا ایک بادشاہ گذرا ہے (الفرائد الدریہ، اظہر اللغات) جو ترکی کے شاہی شہر "اناطولیہ" کے موضع "روم" کا باشندہ تھا۔ اسی "روم" کے موضع میں اُس کے نام کا قدیم قلعہ "اغلمش دژ" واقع تھا جسے "کوشک اغلمش" بھی کہتے تھے۔ جب تاتاری فاتح تیمور لنگ برلاس نے ترکی پر یلغار کر کے اناطولیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور حاکمان ملک اور معززین شہر کو زنجیروں سے باندھا تھا تو انہیں اسی "روم" کے کوشک اغلمش میں محبوس کر دیا جو نیم تباہ شدہ حالت میں تھا لیکن اس کی فصیل ثابت تھی۔ اسی کوشک میں تاتاریوں کے شاہی سواریاں یعنی گھوڑے اور ان کے چاکر وغیرہ کو بھی رکھا گیا تھا۔ اس طرح جلال خان اور اس کی نسل کا ترک شاہی خاندان سے ہونا ثابت ہے۔ یہی نسلی غرور آج تک ان کے رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔

> " ان کے خالص النسب ہونے کی شہرت اتنی ہے کہ ہر بلوچ جائز یا ناجائز ذریعے سے اپنے کو رندوں کا ہم خون بتانے کی پوری کوشش کرتا ہے... وہ اپنے فخر، خود پسندی اور بلوچ ضابطہ اخلاق کے نکات کے سلسلے میں بہت حساس ہیں۔
>
> " ایک جام، جام ہوسکتا ہے لیکن نسلاً جدگال ہے۔ لہٰذا بلوچوں کی شاہانہ نسل کا ہمسر کیسے ہوسکتا ہے؟"

ان کی پسندیدہ کہاوت ہے "(مکران گزیٹر
مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحات
739-740۔

موکلر لکھتا ہے کہ

" قبیلہ نے کبھی کسی کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا
اور اس کا کوئی فرد کسی کے تابع نہیں۔ اس احساس
برتری کی مثال یہ ہے کہ جب چاکر رند دلّی گیا تو وہ
تخت پر بیٹھ گیا اور اُس کے ساتھی اُس کے بازوؤں اور
دیگر حصّوں پر اور ایک آدمی کو اور جگہ نہ ملی تو وہ اُس کی
چوٹی کے سرے پر بیٹھا جس پر تخت ٹوٹ گیا۔ اور
سب گر پڑے۔ " (مکران گزیٹر، گوشہ ادب
کوئٹہ، 1997ء صفحات 741-742)

2۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "ہوت" قبیلہ ایک پُرانا قبیلہ ہے۔ اور صدیوں سے وہ رند قبائل کی بجائے قبیلہ رئیس سے منسلک ہے اور اپنے کو رئیس قوم کا جو اپنے کو مکران کا بنیادی قوم "بیج دار" سمجھتا آرہا ہے، مرکزی قبیلہ اور سردار گھرانہ کہتا ہے۔ اس کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ

" جلال خان کا ایک بیٹا ہوت نامی ضرور تھا لیکن
قبیلہ کا ہوت بن جلال خان سے کوئی تعلق نہیں ہے

بلکہ جو ہوت کیچ کا حاکم تھا وہ رئیس قبیلہ سے تھا اور اس
کے باپ کا نام میر عالی رئیس تھا۔ (ایک نظم ایک
تاریخ، صفحہ 133)

مندرجہ بالا روایت کیچ کے موسیٰ زئیوں کی ہے۔ کیچ کے موضع تربت میں جو رئیس قبیلہ آباد ہے ان کو ہوت بھی کہتے ہیں اور رئیس بھی۔ اسی طرح پنجگور کے تاریخی حاکم میر کبیر رئیس نے، جو شمالی خطہ "سرحد" (کرمان کے مغربی اضلاع) کا بھی حکمران تھا، جب قلات وزہری پر یلغار کر کے ان پر قابض ہوا اور جو خوانین بلوچ کا جدِ امجد ہے، ہوت بھی کہلاتا ہے۔ قاضی نور محمد گنجابوی نے جو فارسی زبان میں منظوم "جنگ نامہ نصیر خان" (نوری) لکھا ہے اس میں وہ میر کبیر رئیس کو قبیلہ ہوت سے اور میر چاکر رند کے "رُفقاء واقربایش" تحریر کرتا ہے۔ ہوت قبیلے کی اپنی روایتیں بھی ایک موقف کی نہیں ہیں:۔

" وہ رندوں سے خونی یگانگت کے دعویدار ہیں۔
اور بلوچ بیت کی سند پر انہیں کے ہم جد مانے جاتے
ہیں۔ "میر جلال کے چار بیٹے تھے۔ لاشار اور رند
سردار تھے۔ اور ہوت اور بلوچ گلہ بان تی' (جلال
خان کے بیٹوں میں "بلوچ" نامی نہیں تھا۔ نسیم)

(ڈسٹرکٹ گزیٹر بلوچستان، مکران ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ۔
1997ء، صفحہ 735)

کچھی گزیٹر کے مرتب کنندگان نے ان کی درج ذیل روایت کا تذکرہ کیا ہے:۔

" مکران کے ہوت متفقہ طور پر علاقے کے قدیم
باشندے سمجھے جاتے ہیں اور وہ خود بھی رندوں اور علاقہ
کے دیگر بلوچ قبائل سے ایک الگ نسل ہونے کے
دعویدار ہیں"۔

(بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر، کچھی ڈسٹرکٹ ،مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 288 وایضاً سبی ڈسٹرکٹ صفحہ 996)

مندرجہ بالا متضاد روایتوں کو دیکھتے ہوئے یورپی مصنفین نے انہیں "ہوت" سے ملتے جلتے ایک قدیم قبیلائی نام "اورتیائی" یا "ہوریتائی" سے قرار دیا اور لکھا کہ یہ علاقے کے قدیم باشندے ہیں جن سے سکندر مقدونی کو مکران ولس بیلہ کے سفر کے دوران واسطہ پڑا تھا:۔

" اغلب ہے کہ وہ اوریتائی یا ہورتیائی کے
باقیات ہوں جو سکندر کو مکران کے راستے مغرب کی
طرف جاتے ہوئے ملے تھے۔"

(ڈسٹرکٹ گزیٹر سبی، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 996، اور ڈسٹرکٹ گزیٹر مکران مطبوعہ ایضاً صفحہ 675،735)۔

یورپین مصنفین کا مذکورہ خیال ایک بے بنیاد خیال ہے۔ وہ اکثر ملتے جلتے ناموں سے متاثر ہو کر تحقیق سے گریز کرتے ہوئے سطحی خیال آرائی کرتے ہیں، اور قاری کو گمراہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ انہیں سکندر اعظم کے زمانے کے "ہوریتائی" اور بلوچوں کے "ہوت" قبیلہ کے ناموں میں صرف معمولی سی مشابہت نظر آئی تو جھٹ سے فیصلہ صادر کر دیا کہ "ہوت" قدیم ہوریتائی ہیں۔

واضح ہو کہ لفظ ہوریتائی بنیادی طور پر صرف "حوری" ہے۔ لفظ "تائی" یونانی زبان میں "گروہ، لوگ" کے معنی دیتا ہے جسے "قبیلہ" کے معنے بھی دیئے جاتے ہیں، یونانی ہی میں اس لفظ کا ایک مترادف "یائی" ہے۔ "حوری تائی" سے مراد "حوری" قبیلہ یا "حوری لوگ" ہیں اور انہوں نے بھی اسے انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

" حوری" لفظ "حور" (معرب خور) کی نسبت سے ہے۔ "خور" خلیج، کھاڑی کو کہتے ہیں۔ یعنی سمندری پانی کا وہ حصہ جو بہاؤ سے ہٹ کر جھیل کی صورت میں ٹھہرا ہو۔ ایسی کھاڑیوں میں بڑی کشتیاں خریدنے کی استطاعت نہ رکھنے والے غریب مچھیرے چھوٹے داموں کے ساتھ مچھلیاں پکڑتے ہیں اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے رہے ہیں۔ یہی مچھیرے "حور" کی نسبت سے "حوری" کہلاتے تھے۔ جو سکندر کے وقت اور آج بھی ساحل سمندر کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں اور آج بھی بلوچی زبان میں

''حوری'' (HOORREE) اور سندھی اور جدگالی میں بالترتیب ''ماچھی'' اور ''میانی'' کہلاتے ہیں۔ وسیع معنوں میں اور معاشی لحاظ سے ان کا شمار میدوں میں ہوتا ہے یہ کوئی نسلی یا جدّی قبیلہ نہیں ہے بلکہ مشترکہ روزگار یا کسب کی بنا پر یہ حوری کہلاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں بھی یہ گروہ لس بیلہ، پنجگور اور کیچ کے علاقوں میں اسی نام سے موجود ہیں۔ پنجگور اور کیچ اور ایرانی بلوچستان میں یہ ندّیوں سے اپنا روزگار کماتے ہیں۔ ان ''حوریوں'' یا یونانی زبان کے ہوریتائیوں کا قبیلہ ''ہوت'' سے کوئی تعلق نہیں ہے اور بلوچ معاشرے میں یہ پست حیثیت کے حامل ہیں۔

3۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر، مکران ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 703۔ علافی عرب، حارث علافی کی نسل ہے۔ حارث نے حجاج بن یوسف سے شکست کھائی اور بھاگ کر سندھ چلا آیا تھا۔ یہ 86ء کا واقعہ ہے۔

4۔ اشاریہ نمبر 1 کے ''ز'' کی ذیل میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

رئیس

رئیس قبیلہ بلوچستان و ایران وسیستان وغیرہ میں پھیلا ہوا قدیم بلوچ قبیلہ ہے۔ اس کے بڑے مراکز مشرقی و مغربی مکران میں واقع ہیں۔ یہ قبیلہ اپنے کو مکران کا قدیم ترین بنیادی (بیج دار) قبیلہ کہتا ہے۔ بعض بلوچ قبائل اپنا شجرہ نسب جس میر حمزہ سے ملاتے ہیں وہ اسی قبیلہ سے تھا اور دسویں صدی عیسوی کی ابتداء میں سندھ کے ہباری (1) حکمرانوں کی طرف سے مکران کا حاکم یا گورنر تھا۔ غزنوی حکمرانوں کے دور میں بھی مکران کی حکومت اسی قبیلہ کے پاس رہی ہے۔ معدانیہ دور حکومت میں جب حکمرانی مکران کی وراثت پر معدان کے بیٹوں عیسیٰ اور ابوالعسکر کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو گیا تو اسی قبیلہ کے معتبرین اور جنگجوؤں نے ابوالعسکر کو جھوٹا ثابت کر کے اُسے ملک سے بھگا دیا اور شاہی دربار میں قاضی مکران کی سربراہی میں وفد بھیج کر عیسیٰ کے حق میں فیصلہ کرایا۔ (2)

کتاب ''سیستان'' کے مصنف جی۔ پی ٹیٹ اس قبیلہ کو سیستان کے قدیم شاہوں کی مدد کرنے والا بااثر قبیلہ اور آدھے سیستان کا ''آقائے زمین'' لکھتا ہے:۔

'' رئیس خاندان کے لوگ کسی وقت سیستان کے
ڈیلٹا کے جنوب میں اور سرحد (3) کے ملحقہ اضلاع

میں چھائے ہوئے تھے روایات کے مطابق رئیس
''روشناس'' تھے یعنی شہنشاہ کے حضور شرفیابی رکھتے
تھے اور انہیں مقامی خود اختیاری کی مراعات حاصل
تھیں۔جس کی وجہ سے وہ کیانیوں اور سیستان کے
دیگر حکمرانوں کے تابع نہ تھے۔ یہ مراعات انہیں
بہت پہلے دی گئی تھیں اور کچھ پتہ نہیں کس بادشاہ نے
یہ عطا کیں یا وہ کون سے خانوادہ کا عہد تھا لیکن یہ انہیں
دشمنوں کے خلاف شاہ کو موثر امداد دینے کے بدلے
دی گئی تھیں۔

رئیس کسی وقت بمپور کے شمال میں سرحد کے
جنوب مشرقی ضلع کی نامی گرامی اور بااثر نسل تھی۔غز
قبائل کا کچھ حصہ ان کے ساتھ آباد ہو گیا اور رشتوں
ناطوں کی بدولت غز رئیس کہلانے لگا (4) سیستان
کے رئیس ان سب کے سردار تھے، جب سیستان میں
امن مفقود ہو گئی تو کچھ رئیس افراد کابل کو ہجرت کر گئے
جہاں ان کے اخلاف موجود ہیں (5)

پرانے وقتوں میں کہا جاتا تھا کہ سیستان کے شمال

میں ''کیانی'' اور جنوب میں رئیس ''آقائے زمین
'' تھے اور تمام دیگر قبائل اور ان کی ملکیت انہیں دو
خاندانوں کے ماتحت تھی۔''(6)

اسی کتاب کے ضمیمہ دوم میں ''غز'' قبیلہ (7) پر بحث کرتے ہوئے مصنف
رقمطراز ہے :

'' رئیس جو کسی وقت سرحد میں ایک بہت
زبردست قبیلہ تھے جس کے باقیات کیچ اور سیستان
میں آج بھی موجود ہیں اور جن میں آج بھی جسمانی
ساخت کے کئی ایرانی خصائص برقرار ہیں اپنے کو غز
بھی کہتے ہیں اور رئیس بھی۔''(8)

اس تاریخی قبیلے کے کئی طائفوں نے مختلف بادشاہوں کے ادوار میں
ہندوستان، کشمیر، افغانستان وغیرہ میں جنگی مہمیں سر کیں اور پھر ان کی اکثریت انہی
علاقوں میں رچ بس گئی بعض نے وہاں پر چھوٹی بڑی حکومتیں اور سرداریاں قائم کیں اور
پھر یہ جنگی گروہ بڑے قبیلے بن گئے جہاں پر ان کے تاریخی آثار موجود ہیں۔مثال کے
طور پر چترال پر رئیس خاندان نے میر حمزہ رئیس (ثانی) کی سرکردگی میں اپنی حکومت
قائم کی جو امیر تیمور لنگ کے ہاتھوں تباہ ہو گئی۔جس کے نتیجے میں کئی رئیس گھرانے
بدخشان کی طرف ہجرت کر گئے سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں رئیسوں نے دوبارہ

اپنی طاقت مجتمع کر کے چترال کی حکومت پر قبضہ کرلیا۔ جسے 87-1585ء میں کٹوریہ خاندان نے ختم کیا اور رئیسوں کا قتل عام کیا جس سے کئی رئیس گھرانے دوبارہ بدخشان کی طرف نکل گئے اور انتقام کی تیاریاں کرنے لگے۔ رئیسوں کے قتل عام نے کٹوریہ خاندان پر عوام کے اعتماد کو ٹھیس پہنچایا جس سے کٹوریہ بادشاہ محترم شاہ کی پوزیشن کمزور پڑ گئی۔ 16-1615ء میں رئیسوں نے بدخشانیوں کی بھرپور حمایت سے رئیسوں کے سربراہ محمود رئیس کی کمان میں چترال پر دھاوا بول دیا اور محترم شاہ گرفتار کرلیا گیا اور اس کی جان بخشی کر کے اُسے مع اہل وعیال کے کیس بھیج دیا گیا۔ چند سال ہی گذرے تھے کہ کٹوریہ خاندان نے اقتدار پر قبضہ کرایا اور محمود رئیس کو قتل کر دیا گیا۔ اور اُس کے خاندان کو تیسری بار پھر بدخشان کی طرف دھکیل دیا گیا لیکن رئیسوں کی انتقام گیری ختم نہیں ہوئی اور انہوں نے والی بدخشان محمود شاہ کی مدد سے چترال پر حملہ کر کے حکومت پر قبضہ کرلیا یہ واقعہ 35-1634ء میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کے بعد چترال، بدخشان اور مستوج کے علاقوں پر وقفے وقفے سے رئیسوں کی حکومت بنتی اور مٹتی رہی اور آخر کار 1774ء میں خاندان خوش وقتی نے فرامرز شاہ کی سرکردگی میں رئیسوں کو اقتدار سے محروم کر دیا اور رئیسوں کا آخری شاہ، عبدالقادر بن محمود رئیس قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد رئیسوں کے اقتدار کا سورج اُس خطّے میں طلوع نہ ہو سکا (9)

اسی طرح مکران کے خطّے میں یہ قبیلہ صدیوں تک حکمرانی کرتا چلا آ رہا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی کی شروعات میں جب قلات اور گردونواح پر حکمران سیوا خاندان

(10) کو بعض بلوچ اور جاٹ باغیوں نے پریشان کر رکھا تھا تو حاکم قلات نے پنجگور ملحقہ علاقوں پر حکمران رئیس قبیلہ کے میر کبر رئیس کو جو شمالی خطہ "سرحد" پر بھی بالادستی رکھتا تھا، مدد کیلئے پکارا تو انہوں نے اپنے رئیس لشکر کے ساتھ قلات کے حکمران کی مدد کی اور باغیوں کا قلع قمع کرنے کے ساتھ ساتھ قلات کے نالائق حاکم کو بھی اقتدار سے محروم کیا۔ میر کبر رئیس نے زہری کے علاقے پر بھی قبضہ کرلیا جو اسی نالائق حاکم کے زیر اقتدار تھا جہاں اُس کا بیٹا "سنگمیں" برسر اقتدار تھا (11) قلات کی حاکمیت جو پھر پورے بلوچستان پر حاوی ہوگئی پاکستان کے قبضہ تک اسی قبیلہ رئیس کے میر کبر کے خانوادے کے پاس چلی آ رہی تھی جس کا آخری خان، میر احمد یار خان بلوچ تھا۔ جس کا قبیلائی طائفہ احمدزئی ہے۔ احمدزئی طائفے کا جدّ امجد براہوجد گال جنگ (12) کا ایک اتحادی ہیرو میر احمد خان ایلتا زئی ولد سردار میر ایلتا زخان (دوئم) ایلتا زئی تھا جو فاتح قلات میر کبر رئیس سے نویں پشت پر تھا۔ (13)

مذکورہ بالا تمہید کے بعد ہم اس اہم اور نامور قبیلے کی اصل اور نسل کے بارے مفروضہ تحریروں کی طرف آتے ہیں جو کسی فیصلہ پر منتج نہیں ہوتے ہیں اور اس قبیلہ کی نسلی حقیقت ابھی تک پردہ اخفا میں ہے۔ جس کی وجہ تمام مصنّفین ومؤرخین کی غیر محققانہ تحریریں اور لفظی مناسبتیں اور مفروضے ہیں۔ انگریزی دور کے گزیٹر مرتب کنندگان نے شک کی بنا پر اس قبیلہ کو عرب مصنّفین کے "زط" (جاٹ) پر محمول کیا ہے جو کسی زمانے میں مکران سے عراق تک پھیلے ہوئے تھے:۔

" رئیس ملک میں سب سے بڑا قبیلہ سمجھا جاتا
ہے۔ یہ سارے کیچ اور پنجگور، پیشکان کے مغربی
ساحل کے ساتھ ساتھ ایرانی مکران کے باہو اور
دشتیاری تک رہائش پذیر ہیں۔ وہ علاقے کے دیگر
بلوچوں میں سب سے زیادہ اہم اور معزز ہیں اور اپنے
کو سماجی لحاظ سے دوسرے تمام قبائل سے برتر سمجھتے
ہیں۔ وہ لس بیلہ کے جاموٹوں (14) سے قربت
رکھتے ہیں اور انہیں اپنا سمجھتے ہیں۔ وہ علاقے میں
کب آباد ہوئے اس کا انہیں علم نہیں۔ یہ ممکن ہے
کہ وہ اُن قدیم زط یا جدگال (15) باقیات سے ہوں
جو مکران کے باشندے تھے (16) اور جن کا ذکر عرب
مصنفین نے کیا ہے۔ دوسرے گروہ ان کو "بیجدار"
کا نام بھی دیتے ہیں جس کے معنی "بنیادی" کے ہیں
جو علاقے میں ان کی قدیم آبادکاری کو ظاہر کرتا ہے۔
(17)"

گزیٹر مرتب کنندگان کا رئیس قبیلہ کو ممکنات کی حد تک جاٹ آبادکاروں
کے باقیات قیاس کرنا ایک غیر تحقیقی بات اور ان کا مفروضہ ہے۔ محض جاموٹ قبیلہ سے
ان کی تاریخی تعلق کی بنیاد پر جاٹ ہونے کا مفروضہ قائم کرنا دراصل تحقیق سے انحراف کا
بہانہ ہے۔ جبکہ حقیقتاً جاموٹ قبیلہ کا خود بھی جاٹ قبیلوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ
تاریخی طور پر نسلاً رئیس قبیلہ کے کیچ حکمرانوں کی نسل سے ہے۔ جس کا جدِ امجد میر ہوت
تھا جسے سندھی اور مکران کے جاٹ جام ہوت بھی کہتے تھے۔ یہی "جام ہوت" سندھی
لہجے میں "جاموٹ" کہا جاتا تھا۔ میر ہوت کے شہزادگان میر عالی، میر پٹوں وغیرہ بھی
سندھی میں جام عاری، جام پٹوں کہلاتے تھے۔ سندھ کے صوفی شاعر شاہ عبداللطیف
بھٹائی نے پٹوں کیلئے قبیلائی طور پر جام ہوت (جاموٹ) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو
جاموٹ کا جاٹ نہ ہونے کے موقف پر مہر تصدیق ہے (18)

نامور مؤرخ سردار خان گشکوری نے اپنی تصنیف "ہسٹری آف بلوچ
ریس اینڈ بلوچستان" میں زہری قبیلہ پر بحث کرتے ہوئے قبیلہ رئیس کو ہندی الاصل
لکھا ہے (19) جو دراصل گزیٹر کے خیالات کا عکس ہے۔ اور ان کی کسی مبینہ تحقیقی
کاوش کا نتیجہ نہیں ہے۔

کتاب "سیستان" کے مصنف جی۔ پی۔ ٹیٹ سیستان و کرمان پر غز ترکوں
کے تباہ کن حملوں اور مکران میں ان کے ورود کے پیش نظر خیال ظاہر کیا ہے کہ شاید رئیس
قبیلہ غز نسل سے ہے۔ اسی خیال کے تحت اس نے لکھا ہے کہ رئیس اپنے کو غز بھی کہتے

ہیں اور رئیس بھی جس کا حوالہ ہم نے پچھلے سطور میں دیا ہے۔ یہ خیال آرائیاں چند محدود روایتوں کی بنیاد پر کی گئی ہیں کسی تحقیق کا نتیجہ نہیں ہیں۔ ویسے بھی اس قبیلہ کی اصل ونسل پر کسی بھی محقق کی کاوشیں نظر نہیں آتیں۔ لیکن غُز اصلیت کا نظریہ یقیناً حقیقت سے قریب ترین ہے۔ کیچ کی تحصیل تُمپ اور مغربی مکران کے پشتین کے چند رئیس اکابر اپنے اِس قدیم قبیلے کو پورے یقین کے ساتھ تُرک نسل بتاتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔ کئی تاریخی تُرک شخصیتوں کا تذکرہ تواریخی کُتب میں ملتا ہے جو قبیلہ رئیس سے تھے۔ مثال کے طور پر قسطنطنیہ کے سلطان سلیمان دوئم (1520-1566ء) کے دورِ حکومت میں قسطنطنیہ کا دفاعی فوجی تُرک امیر البحر سیدی رئیس (20) جس نے جاوا کے سمندر میں لنگر انداز پُرتگیزی طاقتور لشکر سے تاریخ کی خوفناک ترین بحری لڑائی لڑ کر اُسے تہس نہس کر دیا تھا (21) ایک اور ترک جنگجو امیر البحر پیری رئیس (22) تھا جس نے بحر سویز میں مصری بیڑے کی کمان کر کے مسقط کو پُرتگیزوں کے قبضے سے چھڑا لیا تھا۔ اِسی طرح سیستان کی تاریخ کی ایک اہم شخصیت ملک سابق رئیس رہے ہیں جنہیں تُرک شخصیت کہا اور لکھا گیا ہے (23) بعینہٖ تُرکوں کے قلعوں کی حفاظت اور دشمنوں کا کھوج لگانے کیلئے ایک گھوڑ سوار دفاعی لشکر کا تذکرہ ملتا ہے۔ جسے مصنّف سیستان نے تُرکمان گھوڑ سوار اور غزوں کی اولاد لکھا ہے۔ جب مکران کی حاکمیت پر معدانی ملوک کے مابین جھگڑا چل پڑا تو غزنوی لشکر اور مکرانی لشکروں کے درمیان بڑی جنگ چھڑ گئی اور غزنویوں کو شکست ہو گئی لیکن فوراً ترک گھوڑ

سوار لشکر نے مکرانی لشکر کی فتح کو شکست میں بدل دیا۔ یہ گھوڑ سوار تمام تر رئیس قبیلے سے تھے جو پھر اِس قبیلہ کا ایک طاقتور طائفہ بنے جنہیں بلوچی میں "رئیس بور سوار" کہا جاتا ہے۔ یہ طائفہ مشرقی اور مغربی مکران میں کافی تعداد میں پھیلا ہوا ہے۔ مذکورہ تمام تذکرے اور حوالے قبیلہ رئیس کو نسلاً تُرک ثابت کرتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نسلاً وہ غزتر کمانوں سے ہیں جیسے کہ مصنّفین اسی رُخ پر بات کرتے ہیں۔ اور ان کا "زط" یا جاٹوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حواشی:

1۔ سندھ پر 853-852ء میں قبیلہ قریش عرب کے ایک جری شخص عمر بن عبدالعزیز بن ہبار بن اسود نے قبضہ کر لیا جسے ایک منصف مزاج اور روادار حکمران بتایا جاتا ہے۔ اس نے 854ء میں عباسی خلیفہ متوکل کو خط لکھا اور اس پر واضح کر دیا کہ سندھ پر اس کے سوا کسی کی حکومت نہیں چل سکتی اور نہ کوئی دوسرا حکمران یہاں امن قائم کر سکتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ سندھ پر اس کی حکمرانی تسلیم کی جائے۔ بندہ آپ کے نام کا خطبہ پڑھے گا اور آپ کا وفادار رہے گا۔ خلیفہ متوکل نے سندھ کی مسلسل بدنظمی اور وہاں کے حاکموں کی متزلزل وفاداری کے پیشِ نظر عمر بن عبدالعزیز کو سندھ کا والی تسلیم کر لیا۔ متوکل کی 861ء میں وفات کے بعد وہ ایک خودمختار حکمران بن بیٹھا۔ یہ ہبّاری خاندان ڈیڑھ سو برس تک سندھ پر حکمران رہا۔ 1025ء میں محمود غزنوی نے اس خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ کیا۔ (برصغیر اور عرب مؤرخین، تالیف خورشید احمد فاروق، حاشیہ

صفحہ 158) 912ء کے کچھ عرصہ بعد جب مروج الذہب کے مصنف مسعودی، سندھ کے دارالحکومت منصورہ آئے تو وہاں پر ہباری خاندان کا ابو منذر عمر بن عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز حکمران تھے۔

2۔ دیکھئے کتابیں ''کبران'' از الفت نسیم، مطبوعہ رئیس آئی پبلشرز کوئٹہ سال 1994ء اور 2001ء، ''تاریخ بیہقی'' اور ''سیستان'' از جی پی ٹیٹ۔

3۔ کتاب ''بلوچستان وتمدن دیرینہ آں'' میں مصنف ایرج افشار سیستانی نے سلسلہ کوہ تفتان، پنج انگشت و مور پیش کے علاقوں کو ''سرحد'' لکھا ہے۔ ''سیستان'' میں جی۔ پی۔ ٹیٹ، کرمان کے مشرقی اضلاع کو ''سرحد'' کا نام دیتا ہے۔ دراصل قدیم سرحد ایک وسیع و عریض خطے کا نام تھا۔ جو موجودہ تفتان کے شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ ایران کے اندرونی بلوچ علاقوں پر مشتمل تھا اور بلوچ سرداروں اور حاکموں کے زیر تسلط ہوتا تھا۔ جغرافیائی طور پر یہ سیستان میں واقع تھا۔ اس کا مرکز لاڈز ہوتا تھا۔ پندرھویں صدی کے اختتامی اور سولہویں صدی کی ابتدائی سالوں کے درمیانی عرصے میں سرحد، پنجگور کے تاریخی حاکم اور فاتح قلات میر کمبر رئیس کے زیر تسلط تھا۔

4۔ مکران سے رند قبائل کی بطرف قلات وکچھی مہاجرت کے دوران غز رئیس بھی کافی ہمراہ تھے اور من حیث القبیلہ مکرانی بلوچی میں ''گزگ'' کہلاتے تھے۔ (غزگ یا گزگ، غز کی جمع صورت ہے) جنہوں نے رندوں کے ایک اتحادی طائفہ کی حیثیت سے اپنا الگ موضع بنایا۔۔ جو آج تک موجود ہے اور پیش کی آواز کی بجائے زبر کی

آواز میں ''گزگ'' کہلاتا ہے۔ موجودہ وقت میں یہ طائفہ معدوم ہو چکا ہے۔ ''غز'' نام دراصل ''اوغز'' ہے جسے اوغوز'' کی صورت میں بھی لکھا گیا ہے۔ یہ ایک بربریت پسند اور جنگجو ترک قبیلہ تھا جس کے زیر تسلط کیسپئن کا علاقہ تھا۔ بحر کیسپئن کا اصل اور قدیمی نام بھی ''اوغز'' رہا ہے۔ جو اس طاقتور ترک قبیلہ کا بلاشرکت غیرے خطہ رہا ہے۔ اوغز یا غز (یہ نام سیستانیوں نے ''غز'' کی صورت میں رواج دیا ہے) قبیلہ کی نسل موجودہ ترکمن اقوام ہیں۔ کتاب سیستان میں جی۔ پی۔ ٹیٹ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ کیچ کی آبادی کا ایک اہم حصہ (رئیس قبیلہ)، بمپور کے شمال اور جنوب کے علاقوں اور علاقہ سرحد کا طاقتور حصہ غزوں کی اولاد ہیں جنہوں نے رئیسوں میں شادیاں کیں (سیستان، اُردو ترجمہ پروفیسر انور رومان صفحہ 452 حاشیہ)

یاد رہے کہ بارھویں صدی عیسوی کی ابتداء سے چند عشرہ قبل غز لشکروں نے جنوبی سیستان کے بلوچ علاقوں تک تباہی پھیلائی تھی اور اپنی نو آبادیاں بنائی تھیں۔ جی پی ٹیٹ لکھتا ہے کہ صوبہ کرمان کے مشرقی ترین علاقہ یعنی سرحد میں غز عنصر آج بھی موجود ہے جہاں کے موجودہ یار احمد زئی، گمشادزئی وغیرہ جو آجکل دامنی یا سرحدی کہلاتے ہیں یقیناً غزوں کی اولاد ہیں (سیستان، اُردو ترجمہ پروفیسر انور رومان، مطبوعہ بینظیر انٹر پرائزز، کوئٹہ، 1985ء صفحہ 540)

5۔ کتاب ''ایضاً'' صفحہ نمبر 26 حاشیہ۔ کابل، کندھار، ہرات، بادغیس وغیرہ میں آج بھی رئیس موجود ہیں لیکن ان کی کوئی قبیلائی مرکزیت نظر نہیں آتی۔ پشین، چمن کے

اچکزئیوں اور چند قبیلوں میں آج بھی رئیس گھرانے موجود ہیں لیکن کوئی متحدہ طائفہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ مشرقی بلوچستان میں (ایرانی بلوچستان کے علاوہ) میں آج بھی رئیس واضح اکثریتی بلوچ قبیلہ ہے لیکن متحدہ قبیلہ کی حیثیت کھو چکا ہے اور اُس کے سینکڑوں طائفے اور پھلیاں دیگر قبیلوں کی ذیلی شاخیں بن چکی ہیں اور ''رئیس'' نام کا استعمال کرنیکی بجائے بالادست قبیلہ کا نام استعمال کرتے ہیں یا انفرادی طور پر محض لفظ بلوچ کا استعمال کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنے ہم نسلوں سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ اسی بیگانگی نے اس اکثریتی اور ماضی کے طاقتور جنگجو قبیلے کو عدم کے قریب کر دیا ہے۔ جو یقیناً ایک المیہ سے کم نہیں ہے۔ اپنی قابل فخر نسل سے بیگانگی کا ہی نتیجہ تھا کہ فاتح قلات میر کمبر رئیس کی نسل خوانین قلات نے کبھی اپنے کو اومان سے آنے والے (قبیلائی لحاظ سے نامعلوم) لکھا، کبھی کسی برز کوہ سے آنے والوں (جن کا کوئی وجود نہیں) کی اولاد کہا اور کبھی اپنے کو کولواہ کے میر دانیوں کی شاخ بتایا۔ غیر بلوچ مصنفین (پٹھانوں) نے انہیں خلجی پٹھان لکھا۔ یہ المیہ نہیں تو کیا ہے کہ حکمران خاندان اپنے ناموں کے ساتھ بلوچ لکھتے ہوئے بھی اپنی خاندانی قبیلائی تاریخ سے نابلد ہوں۔ آفرین ہو قاضی نور محمد گنجابوی (مصنف تحفۃ النصیر فارسی) ہنری پاٹنجر (سفرنامہ سندھ وبلوچستان) اور سردار خان گشکوری (مصنف ہسٹری آف بلوچ ریس اینڈ بلوچستان) کو جنہوں نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے خوانین بلوچ کو اُن کے آباواجداد اور ان کی نسل سے رُوشناس کرایا ہے۔

6۔ ''سیستان'' صفحہ نمبر 26 اور 27۔

7۔ غُر کیلئے دیکھئے اشاریہ نمبر 4۔

8۔ واضح ہو کہ سیستان کے مصنف کا مذکورہ بیان صرف سیستان کے ایک محدود علاقے کے رئیسوں سے متعلق ہے۔ موجودہ وقت میں کیچ اور مکران کے دیگر علاقوں کے رئیسوں میں غُر عنصر کی موجودگی کی روایت نہیں ملتی۔ پندرھویں صدی کے دوران غر گھرانوں کی رندوں کے ساتھ بطرف قلات ہجرت کے بعد مکران میں یہ نام معدوم ہو گیا ہے۔

9۔ ''کمبران'' ایڈیشن دوئم، سال 2001ء صفحہ 48-47 اور تاریخ چترال از منشی محمد عزیز الدین، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور سال 1987ء۔ مذکورہ خطے میں رئیسوں اور دیگر بلوچ قبائل کی آبادکاری کافی پُرانی ہے۔ اسی اطراف میں صدیوں تک بلوچوں کا ایک ملک ہوتا تھا جو ''بیلوس'' اور ''بلوس'' کے نام سے مشہور تھا۔ جس کے خاتمے کے بعد بلوچ بغیر مرکزیت کے منتشر ہو گئے۔ سیستان کا مصنف لکھتا ہے:۔

'' بلوچ صوبہ کرمان تک ہی محدود نہ تھے بلکہ خراسان میں کافی علاقے تک پھیلے ہوئے تھے۔ روضۃ الجنت فی الاوصاف مدینۃ الہرات کے مصنف کے مطابق وہ تیرھویں چودھویں صدی میں ہرات کے شمال میں بادغیس کی طرف آبادی کا ایک اکثیر التعداد اور خانہ بدوش حصہ تھے۔ اب بھی افغانستان کے ضلع زمیند اور کی آبادی میں بلوچ ایک غیر اہم عنصر نہیں ہیں'' (سیستان، صفحہ 541)

10۔ سیوا خاندان اور اس کے قلات پر حکمرانوں کا تذکرہ اے۔ ڈبلیو، ہیوگز نے اپنی

تصنیف ''دی کنٹری آف بلوچستان '' میں کیا ہے اور روایتاً کیا ہے۔ تاریخی تذکروں اور حوالوں میں اس خاندان یا اس کے حکمرانوں کا ذکر نہیں ملتا۔ ہیوگز اس خاندان کو ہندو مذہب سے بتائے ہوئے لکھتا ہے کہ معلوم نہیں اس نے کتنا عرصہ قلات پر حکومت کی البتہ اتنا معلوم ہے کہ سیوا خاندان کا خاتمہ میر کمبر کے ہاتھوں ہوا۔ ایک اور انگریز مصنّف ہنری پاٹنجر اپنی تصنیف ''سفرنامہ سندھ و بلوچستان'' میں لکھتا ہے کہ یا تو اس ہندو خاندان کے آخری حکمران کا نام سیوا تھا یا پھر یہ کوئی خاندانی لقب تھا جو اس خاندان کے لوگ اقتدار پر آتے وقت اختیار کرتے تھے۔ اس کے مطابق سیوا خود قلات میں مستقل قیام کرتا تھا اور اس کا بیٹا سنگین اس کے نائب کی حیثیت سے زہری میں بود و باش رکھتا تھا۔ پاٹنجر کے اس بیان پر ملک محمد سعید بلوچ نے اپنی تصنیف ''بلوچستان تاریخ کی روشنی میں'' لکھا کہ تاریخ کے اوراق ان کے ذکر سے خالی ہیں اور معلوم نہیں کہ وہ کونسا سیاسی و سماجی پس منظر تھا کہ جس کی بنا پر ایک ہندو خاندان کو عہد وسطیٰ میں قلات پر اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ کریں ''کمبران''۔

11۔ ''سفرنامہ سندھ و بلوچستان''، حصّہ دوئم، اُردو ترجمہ از پروفیسر انور رومان صفحات 77-79۔

12۔ ''براہوجدگال جنگ'' سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں لڑی گئی۔ جو سوراب کے میروانی قبیلہ اور بُلفت جدگالوں کے مابین جھلاوان کی متنازعہ اراضیات اور

چراگاہوں پر بمقام سوراب لڑی گئی جو پھر پورے جھلاوان، سراوان و خاران کے چند علاقوں تک پھیل گئی۔ اس جنگ کا خاتمہ 1666ء سے پیشتر فریقین کے درمیان معاہدے سے ہوا جس کی رُو سے بیلہ سے خضدار کی جانب ایک پہاڑی مقام ''پٹی ڈیڈار'' دونوں کے درمیان سرحد ٹھہرائی گئی۔ شمال کی طرف کی متنازعہ اراضیات اور چراگاہیں میروانیوں اور اتحادیوں کی تسلیم کی گئیں جبکہ جنوب کی طرف کی متنازعہ اراضیات اور چراگاہیں بلفت جدگال اور اُس کے اتحادیوں کی تسلیم کی گئیں۔ چونکہ اس لڑائی کی کمان میروانی سردار گھرانہ ''براہو'' کے ہاتھ میں تھی اور دوسری طرف مقابلے میں جدگال تھے اس لئے یہ ''براہو جدگال جنگ'' کے نام سے مشہور ہے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ کریں۔ ''ایک نظم ایک تاریخ'' اور ''براہو جدگال جنگ ءِ شیئر''۔ واضح ہو کہ اس لڑائی میں ''براہو'' میروانیوں کے اتحادی گروہ یا لشکر ''براہو'' کی نسبت سے پھر ''براہوئی'' کہلائے۔ اس طرح اس اتحادیہ کی تاریخ 1666ء سے شروع ہوتی ہے۔

13۔ میر احمد ایلتا زئی کا نسب نامہ ان کے جدّ میر کمبر رئیس تک، ''میر حسن خان کی حکمرانی'' کی ذیل میں ملاحظہ کریں۔ میر احمد ایلتا زئی کے زمانے میں قلات کی حاکمیت اُن سے چھن گئی تھی۔ اپنے خاندانی مُلک اور حاکمیت کے ممکنہ حصول کیلئے انہوں نے میر بجّار براہو کی سرکردگی میں جدگالوں کے خلاف لڑائی میں میروانیوں کا ساتھ دیا۔ اسی اتحادیہ کی کامیابی کے نتیجے میں ایلتا زئی قلات پر دوبارہ برسر اقتدار آئے اور 1666ء میں میر احمد ایلتا زئی حکمران قلات کے دوسرے دور کے پہلے خان بنے۔ میر احمد

ایلتازئی کے خاندانی اتحادی پھر میر احمد کی نسبت سے ''احمدزئی'' کہلائے جو ابھی تک خوانین بلوچ کا قبیلہ چلا آرہا ہے۔

14۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز، مکران ڈسٹرکٹ ۔ نیز ''جاموٹ'' کیلئے دیکھیں ''جاموٹ اور کچھی کے جاٹ'' اور ''جام خاندان۔۔۔مفروضے اور حقائق''۔

15۔ گزیٹر کے مرتب کنندگان زط اور جدگال میں فرق نہیں کرسکے ہیں عربی تصنیفات میں جاٹ قبائل کو معرب کرکے ''زط'' کہا اور لکھا گیا ہے۔ جو کسی دور میں پنجاب سے لے کر عراق تک کے درمیانی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ جن کا تذکرہ دیگر مصنفین کے علاوہ خود انگریز مصنفین نے بھی کیا ہے۔ ''جدگال'' لفظ ''جاٹ'' کے لئے مستعمل نہیں ہے۔ بنیادی طور پر یہ لفظ ''جٹ گال'' ہے۔ جس کے معنی ''جٹوں کی بولی بولنے والے'' کے ہیں۔ یہ ایک بلوچی لسانی اصطلاح ہے۔ جو ان بلوچوں کیلئے بولا جاتا ہے جنہوں نے مرور زمان اپنی بلوچی زبان چھوڑ کر جٹوں یعنی سندھیوں کی زبانی اپنالی ہے۔ واضح ہو کہ بلوچ سندھیوں کو جٹ کہتے رہے ہیں۔ لفظ جٹ، بلوچی میں جت اور جڈ کہا جاتا رہا ہے۔ مذکورہ اصطلاح جٹگال اور جدگال دونوں طرح سے بولا جاتا رہا ہے۔ تفصیل کیلئے دیکھیں کتاب ''کہبران'' صفحہ نمبر 71 اور ''بلوچ اور بلوچستان کے تاریخی گوشے'' صفحہ نمبر 121۔

16۔ زطّ (معرب) یعنی جاٹ مکران کے باشندے نہیں تھے بلکہ ہندوستان کی سمت سے آئے تھے اور عراق تک اپنی نوآبادیاں قائم کر چکے تھے۔ عربی لغت القاموس میں

ہے کہ ''زطّ، جٹ کا معرب ہے جو ہندی الاصل لوگ ہیں'' اسی طرح دوسری عربی لغت ''محیط'' میں درج ہے کہ زط، ہندوستان کی ایک نسل جٹ کا معرب ہے''۔ وولٹر زاپنی فارسی لغت میں لکھتا ہے۔

'' جاٹ نامی قبیلہ ہندوستان کے صحرائی باشندوں میں سے ہے جو بہت بدنام ہیں۔''

(''ہندوستان کے جپسی'' از ڈیوڈ میک رشی کیگن پال مطبوعہ ٹرنچ اینڈ کمپنی لندن 1866ء)

محققین کے مطابق جاٹوں کی مغرب کی سمت گھرانوں کی صورت میں جانا دراصل اپنے گایوں اور بھینسوں کے چراگاہوں کی تلاش کیلئے تھا۔ وہ اپنے مال مویشیاں چراتے، چراگاہوں پر ڈیرہ ڈالتے اور ان پر قبضہ کرتے اور اپنی نوآبادیاں قائم کرتے جاتے تھے۔ ابتدائی جانے والوں کو دیکھتے دیکھتے دیگر گھرانے اور گروہ بھی ان کے پیچھے چلتے گئے۔ حتیٰ کہ تیسری صدی کے اختتام تک وہ ایران کے اندرونی اور ساحلی علاقوں میں کافی پھیل چکے تھے۔ لیکن بعض گھرانے اسلام کے ورود سے بھی پہلے بابل میں آباد تھے اور زط کے نام سے ان کی ایک نہر کا بھی تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے۔ مشہور جغرافیہ نویس اور سیاح بلاذری نے ایرانی خطے رام ہرمز اور اراجان کے درمیانی علاقے میں ایک ملکِ زطّ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ دسویں صدی عیسوی تک جاٹوں کے بیسوں گاؤں شام، عراق، بحرین، ایران، سعودی عرب، بصرہ اور گردونواح میں بس چکے تھے۔ قبل

اسلام جاٹوں نے سندھ کی دراوڑ آبادی کو بیدخل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی جو بھیل، کول، گونڈ، کوہلی، باگڑ وغیرہ قبائل پر مشتمل تھے اور صدیوں سے سندھ کے مالک تھے۔ بلوچستان کا علاقہ بدھا (موجودہ کچھی و نصیر آباد) اور قیقان (جھالاوان) ان جاٹوں کے مضبوط مراکز شمار ہوتے تھے۔ مکران میں جاٹوں کی نو آبادیات کے آثار بے شمار مواضعات کے ناموں کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ نام اُن آبادکار جاٹ قبائل کے ہیں جو ان جگہوں پر آباد تھے۔ واضح رہے کہ مصنّفین نے جنہیں جاٹ کہا ہے۔ وہ تمام آبادکار جاٹ نہیں تھے بلکہ ان میں گوجر، راجپوت اور قدیم کشمیری گروہ بھی تھے۔ جن کا الگ الگ تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ ذیل میں مُشتے از خروارے ان قدیم مواضع کا نام دیا جا رہا ہے جو مکران میں آباد جاٹ قبائل (بشمول گوجر، کشمیری وغیرہ) کے نام تھے:۔

" آوار (آواران) مشکی (مشکئے)۔ کورواہ (کولواہ)۔ جھمبُر۔ مادہ (ماڈگ ء کلات)۔ اڑہ نوندڑہ۔ پیلار۔ جھبری۔ مالار۔ آندر۔ کوزک۔ بیدی۔ ماشی۔ دُرون۔ نال۔ بسول۔ کندر۔ گوندر (گوادر) پسا۔ زُمبر۔ مکور۔ کرانچ (کلانچ) دڑام۔ کراتو (کلاتو)۔ کاروات۔ سوڑ۔ گھنڈ۔ (گھنڈان)۔ آکارہ۔ کیٹر۔ کلنگر/ کلنگل۔ کاٹا

(کاٹمگ)۔ سانجی۔ درروار۔ کوچہ۔ تلینٹ۔ حر۔ درابول/ درابیلا۔ بیلا (بیلسو)۔ کورا۔ مند۔ باہو۔ بم (بمپشت، بمپور)۔ مار۔ کوہاڑ۔ نہنگ۔ بگّن۔ سُلو۔ گورو۔ مہیر۔ گکن۔ گھنڈ۔ کیل/ کول۔ گُلمبر۔ بالیچہ۔ سانہ/ سانو۔ کسانہ/ کسانو۔ ہلول۔ کاش۔ کاشی۔ بھل۔ دیول/ دیبل۔ (روایتوں میں اسے تُرک قبیلہ کہا گیا ہے لیکن یہ نام قدیم جاٹوں کی فہرست میں دیکھا گیا ہے۔ ہندوستان میں یہ قبیلہ موجود ہے اور جاٹوں میں شمار ہوتا ہے)۔ تمہل۔ پیشن۔ مٹینگ۔ پشن۔ تگر۔ کنٹ۔ تلار۔ ڈڈھے۔ کوشک۔ چب۔ گوڑ (گوڑ ء کلات بلیدہ)۔ ڈھونڈ (تُمپ قلعہ کا قدیم نام)۔ تمرت (اسے بھی روایتاً تُرک طائفہ بتایا جاتا ہے لیکن یہ قبیلہ ہندوستان میں جاٹ شمار ہوتا ہے)۔ بنگہ۔ پُردم۔ پنجگر (اس قدیم قبیلہ کو بھی روایتاً تُرک بتایا جاتا ہے لیکن یہ کشمیری قبیلہ ثابت ہوا ہے)۔ سریکول (سریکوران پنجگور) اور کئی دیگر نام۔

بعض جاٹ قبیلوں کے باقیات سترھویں صدی عیسوی کے آخر تک مکران کے رئیس اور رند قبیلوں میں چھوٹے چھوٹے طائفوں کی شکل میں موجود رہے ہیں اور بعض ابھی تک غیر اہم طور پر بڑے بلوچ قبیلوں میں موجود ہیں جیسے کورواہ، چنال، چھانگا، لانگاہ، مسوری وغیرہ۔

17۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر، ڈسٹرکٹ مکران، مطبوعہ ٹائم پریس بمبئی 1907ء صفحہ 98۔

18۔ حوالے کیلئے ملاحظہ کریں ''سندھی ادب کی مختصر تاریخ'' از عبدالمجید میمن سندھی، رسالو غلام محمد خانزئی، کتاب ''سچل سرمت'' اور تفصیل کیلئے ہماری تصنیف ''ایک نظم ایک تاریخ کا ضمیمہ ''براہوجد گال جنگ اور رئیس قبیلہ'' مطبوعہ رابعہ خضداری آرٹس اکیڈمی، خضدار بلوچستان۔

19۔ صفحہ 268، مطبوعہ نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، سال 1984ء۔

20۔ سیدی رئیس کا پورا نام سیدی علی رئیس اور اس کے باپ کا نام سیدی حسین رئیس تھا۔ وہ ایک عالم فاضل شخص اور بحری علوم کا ماہر ترک امیر البحر تھا جو بحر اومان سے بحرہ بلوچ کے انتہائی مشرقی کنارے تک کے درمیانی بحری خطے میں قسطنطنیہ کی حکومت کے بحری دفاعی معاملات کا نگران تھا۔ وہ ایک نامور بحری انجینئر اور جہاز ران تھا۔ جس نے کئی بحری جنگوں میں حصہ لیا۔ اور فتوحات حاصل کیں۔ وہ

قسطنطنیہ کے حکمران سلیمان دوئم کے بحری دفاعی بیڑے کا سپریم کمانڈر تھا۔ وہ ایک علمی محقق سیاح بھی تھا۔ جو اپنے وقت کا سب سے بڑا بحری انجینئر مانا جاتا تھا۔ وہ پندرہ تک زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اور تین زبانوں ترکی، عثمانی اور چغتائی میں معیاری شاعری کرتا تھا۔ اور تخلص کے طور پر کاتبی کا استعمال کرتا تھا۔ اُسکی تصنیفات میں ''الکائنات''، ''مرات الممالک'' اور ''محیط'' عالمی معیار کی ہیں۔ جن میں کائنات کے بارے میں اور خصوصاً بحری دنیا سے متعلق نایاب معلومات ہیں۔ مرات الممالک دراصل اُس کا بحری سفرنامہ ہے جس میں سمندری دنیا کی بے شمار معلومات کا خزانہ موجود ہے۔ ان معلومات میں بحر بلوچ کے بارے میں بھی کئی سیاسی، معاشی، جغرافیائی اور بحری معلومات کا خزانہ دستیاب ہے۔ (گالیصوں گوٹ وٹن جون'' (سندھی) از سید حسام الدین راشدی)۔ سیدی کا انتقال قسطنطنیہ میں 1574ء میں ہوا۔

21۔ مذکورہ لڑائی کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:۔

> '' یہ لڑائی اتنی خوفناک اور وحشتناک تھی کہ میں نے اپنی بحری زندگی میں اس سے بڑی خوفناک لڑائی نہ دیکھی اور نہ سُنی تھی۔ تاریخ میں اس سے بڑی اور خونی لڑائی کی مثال نہیں ملتی۔ میرے پاس اس لڑائی کا چشم دید منظر اور سرگذشت بیان کرنے کیلئے

الفاظ ہی نہیں ہیں۔ بہر حال جیسا بھی ہوا دشمن کو
عبرتناک شکست اور بربادی کا سامنا ہوا اور اپنے
بچے کھچے آدمیوں کو لے کر بھاگ پڑا۔"

22۔ پیری، سیدی، بھیگو، ہوتمان، رند، چاکر، رستم، جلار، جلائی جیسے بے شمار ترکی نام رئیس قبیلے کی وساطت سے بلوچ قوم کے حصّے میں آئے ہیں جواب بلوچی نام کہلاتے ہیں۔

23۔ سابق رئیس اور چند دیگر رئیس اکابرین کے بارے میں کتاب "تاریخ سیستان" درحدود 445ھ۔ 725ھ" بہ تصحیح ملک الشعرا بہار (فارسی)، مطبوعہ مطبع دولتی، شیراز ایران 1337ھ، میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ساجدی/ سگھیتائی

ساجدی قبیلہ، جھلاوان میں واقع گریشہ وادی کا قبیلہ ہے۔ بنیادی طور پر اس کے اکابرین پنجگور کی وادی کچک سے متعلق رہے ہیں جو جلمب زئی کہلاتے تھے۔ میر ساکا خان جلمب زئی ان کا ایک مشہور جنگجو شخص ہوتا تھا جس کا قلعہ، کچک میں ساکا قلات ہوتا تھا۔ میر ساکا خان کو روایتوں میں کچک کی تاریخی رئیس شخصیت "نذر محمد" رئیس (1) کے خانوادے سے کہا جاتا ہے جو گھوڑوں کے کاروبار میں ہندوستان کے راجپوتانہ میں آمدرفت رکھتا تھا اور پھر وہیں کا ہو رہا۔

انگریز مصنّفین نے حسب معمول "ساکا" نام کی مناسبت سے اس قبیلہ کو قدیم ساکاؤں سے منسوب کر کے سگھیتائی بتایا:۔

" بعض مصنّفین ساجدیوں کو سیتھی ماخذ یعنی قدیم
سگھیتائی اور سکندر کے ساتھ شمال سے آنے والی فوج
کے حصّہ کی اولاد سمجھتے ہیں (2) جھلاوان میں قبیلہ کا
غالب پاڑہ ساکائی یا ساکازئی ہیں (3) جو واقعی
سیتھی ماخذ کے ہیں (4) ساکا اب بھی کیسپین کے
سرحدات پر موجود ہیں۔

پولیٹیکل ایجنٹ کیپٹن ٹمپل کا خیال تھا کہ
ساجدی خالص بلوچ تھے لیکن باہمی شادیوں سے
بتدریج جہلاوانی براہوئیوں سے گڈمڈ ہوگئے
تھے(5) مقامی بیانات کے مطابق ساجدی ابتداء
میں کوئی اٹھارہ قرون (6) پہلے شمال سے آئے اور
پنجگور کے قریب وادی کچک میں متمکن ہوگئے جہاں
ان کے قدیم دیہات، ساکا قلات کے کھنڈرات اب
بھی موجود ہیں۔ "(7)

مذکورہ بالا بیان ایک بے بنیاد اور من گھڑت مفروضہ ہے۔ صرف ساجدی نام کا سگھیتائی سے قدرے مطابقت دیکھ کر گزیٹیر کے مصنفین نے انہیں سگھیتائی اور سیتھی لکھ دیا۔ نہ کوئی سند پیش کی اور نہ اپنی کوئی تحقیق بتائی۔ اسی طرح یہ بھی دو جملوں میں لکھ دیا کہ ساجدی، سکندر کے لشکر کے فوجیوں کی اولاد ہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیسے۔ سکندر کے کون سے فوجی کچک آکر مقیم ہوگئے تھے جو یہ ان کی نسل ہوگئے۔ ساجدی سردار گھرانے کا "ساکازئی" نام سن کر فوراً کہہ دیا کہ "یہ واقعی سیتھی ماخذ کے ہیں" نہ کوئی حوالہ، نہ بحث، نہ دلیل نہ سند نہ ساجدیوں کی اپنی کوئی تاریخی روایت کا تذکرہ، کچھ بھی نہیں اور فیصلہ صادر کردیا۔

ان کا مزید کہنا ہے کہ ساجدی شمال سے آکر کچک میں مقیم ہوگئے جو بالکل ان

کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ اگر کہیں کسی ملک یا مقام سے نقل مکانی کرکے آئے ہوتے تو یقیناً اس ملک یا سابقہ مقام کی نسبت سے ان کے قبیلہ کا نام بنتا۔ جبکہ ایسا نہیں ہے اور کچک اپنی جگہ پورے بلوچستان میں سگھیتائی کے نام سے کسی قبیلہ کا وجود نہیں رہا ہے۔ جس قبیلہ کو وہ ساجدی کہتے ہیں کچک میں یہ نام وجود نہیں رکھتا تھا۔ یہ نام وادی گریشہ میں اپنایا گیا۔ کچک میں قیام کے دوران اس قبیلہ کا مرکزہ جلمب زئی کہلاتا تھا۔ کچک سے ان کی نقل مکانی کا پس منظر یوں ہے کہ کچک کے قبیلہ جلمب زئی کے ایک قدیم طائفہ میران زئی کا سید محمد جونپوری جب ہندوستان سے بطرف ٹھٹھہ اور ایران گئے تو اس کے اہل خاندان کے کئی لوگ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ جن میں ایک نوجوان ساجد بھی ان کے ساتھ تھا وہاں خاران کا ایک معمولی ملا محمد اٹکی (خاران کے موضع اٹیک کا رہائشی) بھی ان کے مریدوں میں شامل ہوگیا تھا۔

سید محمد کے بمقام فرح وفات پانے کے بعد ساجد اور ملا محمد اٹکی اپنے چند لوگوں کے ساتھ کیچ کے مقام تربت چلے آئے اور یہاں مہدوی دین کی تبلیغ کرنے لگے۔ تقریباً وہاں تین سال رہے اور خفیہ طریقہ سے مہدویت کو پھیلاتے رہے جب عام لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ اسلام کی نہیں کسی اور دین کی تبلیغ کرتے ہیں تو معاملہ فہم لوگ ان کے خلاف ہوگئے۔ اسی مخالفت کی بنا پر ساجد اپنے دو چار مریدوں کے ہمراہ وادی کچک چلے گئے اور ملا محمد اٹکی کو کیچ میں اپنا جانشین چھوڑ گئے (8) کچک ان کے آباؤ اجداد کا قدیمی وطن تھا۔ کچک میں قبیلہ جلمب زئی نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور وہ

تیرہ سال تک گچک بی میں رہے اور مہدوویت کو پھیلاتے رہے۔ پھر نا معلوم وجوہات کی بناء پر وہاں سے کئی جلمب زئیوں کے ساتھ جہلاوان کی طرف نقل مکانی کی اور گریشہ کے شمالی پہاڑوں میں ایک چھوٹی سی وادی کو اپنے مذہب کے پرچار کرنے کیلئے محفوظ پا کر وہیں سکونت اختیار کی۔ یہی نیا مقام پھر اس کے نام پر "کوچہ ساجد" مشہور ہو گیا۔ جو آج تک یہی نام لئے ہوئے ہے۔ اسی کوچہ ساجد کے آباد کار جب اس تنگ وادی سے نکل کر گریشہ کے کھلے اور وسیع میدان میں آباد ہوتے گئے تو کوچہ ساجد کی نسبت سے "ساجدی" کہلائے، جو تمام کے تمام ذکری مہدوی (9) تھے۔ دیگر جلمب زئی جو کوچہ ساجد سے باہر آباد ہوئے تھے وہ گچکی زئی کہلاتے تھے۔ جن گچکی زئیوں نے ذکری دین قبول نہیں کیا تھا۔ وہ ساجدی میں شمار نہیں ہوتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ دین کی شراکت داری اور رشتوں ناطوں میں سب پر ساجدی نام حاوی ہو گیا۔ اور گچکی زئی گریشہ میں پس منظر میں چلے گئے۔ جو گچکی زئی گریشہ وادی سے نکل کر دوسرے مقامات میں آباد ہوئے وہ آج تک گچکی زئی کہلاتے ہیں۔ جن کا بنیادی قبیلہ "جلمب زئی" ہے۔

گریشہ میں ساجدی قبیلہ بننے کے بعد پہلا سردار جو منتخب ہوا تھا وہ بلبات جلمب زئی تھا جو یہاں پر بلبات گچکی زئی کہلایا۔ بلبات گچکی زئی کے زمانے میں گریشہ کے مقامی جٹ اور گجر قبیلوں نے ساجدیوں سے مقبوضات پر لڑائی لڑی جس میں ساجدی فتحیاب ہوئے اور جٹوں اور گجروں کی کئی قیمتی اراضیات اور چراگاہیں انہیں

اپنے ان مقتولوں کے خون بہا میں مل گئیں جو جٹوں اور گجروں کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔

" بلبات گچکی کی چوتھی پشت سے ان کے ایک طاقتور سردار میر ساکا خان نے گریشہ میں پہلا قلعہ تعمیر کیا جو ساکا قلات کہلایا۔ ساکا خان ساجدی کہلاتا تھا۔ اس کے بعد قبیلہ ساجدی نام آور ہوا اور ان میں سرداری کا سلسلہ وراثتاً چل پڑا سردار ساجدی کا سلسلہ نسب معروف عالم دین اور مہدویت کے بانی سید محمد جونپوری سے ملتا ہے جو اس طرح ہے:۔

" سردار عبدالکریم (1996-97) ولد سردار بہرام خان ولد سردار ساکا خان ولد سردار خان محمد ولد سردار حیات خان ولد سردار ساکا خان ولد سردار حیات خان ولد سردار ساکا خان ولد دینار ولد فتیان ولد دوستین ولد بلبات گچکی ولد للا ولد زارین ولد سُند وولد کٹھ ولد کیا ولد دوستین ولد میران ولد ساجدین ولد میران ولد ساجد ولد محمد میران ولد سید محمد جونپوری قوم میران زئی سکنہ دانا پور جونپور انڈیا۔" (10)

حواشی :

1۔نذر محمد رئیس کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔صرف اتنا روایت کیا جاتا ہے کہ گچک سے سرحد کولواہ تک کا ایک مقامی حکمران تھا۔جس کو سیر کرنے کا بہت شوق تھا وہ اپنے شوق کو پورا کرنے کے ساتھ گھوڑوں کا بھی کاروبار اپنے کارندوں کے ذریعے کرتا تھا۔اسی شوق کی تکمیل میں وہ اپنے چند کارندوں اور محافظوں کے ساتھ کئی مرتبہ ہندوستان کے راجھستان وغیرہ میں آمدورفت رکھتا تھا۔اسی آمدورفت کے دوران اُس نے جودھپور کے راجپوت حاکم کی بیٹی سے پسند کی شادی کی۔اس طرح اس نے جودھپور کو اپنا گھر بنایا اور آمدورفت کا سلسلہ برقرار رکھا۔گچکی قبیلہ کی اصل و نسل کے ضمن میں مکران گزیٹر میں نذر محمد سے متعلق ایک کہانی اس طرح بیان کی گئی ہے۔

" ایک بلوچ حکمران نذر محمد کا اکلوتا بیٹا کمال خان ،جسے اُس نے اپنے رشتہ داروں کے فریب کارانہ اُکساوے پر شدت جذبات سے مغلوب ہوکر مارڈالا۔یہ تہیہ کرکے اُس کے رشتہ داروں میں سے کوئی گدی پر نہ بیٹھے گا وہ کچھ عرصہ اپنے کسی موزوں وارث کا متلاشی رہا۔اُس کے ایلچی کرنگا میں اُترے

جواب اوکھا منڈل (ریاست بڑودہ) کا حصہ ہے
جہاں سے انہوں نے سمت جی ابن سڈل جی کو بروز
جمعہ بمطابق مگرسہ تیرھویں سموت 1614 (قریباً
1558ء) کو اغوا کیا۔سمت جی جودھپور کے
ارمبھدا ودھے راجپوتوں کا رشتہ دار تھا اور اُس نے
دلپبو بنت نذر محمد سے شادی کی اور حاکم مکران بنا۔"

آگے لکھتے ہیں کہ جس کتاب سے یہ معلومات لی گئی ہیں وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ اُس کی اولاد اب گچکی کہلاتی ہے۔اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ ایک پرانی کتاب تھی جو ریاست نوانگر (کاٹھیاواڑ) کے شاہی بروٹ کے قبضہ میں تھی۔ (بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز ، مکران ، موضوع "گچکی" مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء)

2۔"بعض مصنفین "میں سے کسی ایک مصنف کا بھی نام بتایا نہیں گیا ہے جو ثابت کرتا ہے کہ یہ ان کا ایک بہانہ ہے۔

3۔ساکازئی سردار خیل یا سردار گھرانہ ہے۔جس کا جد امیر ساکا خان ولد میر دینار گچکی زئی تھا۔

4۔ "سیتھی ماخذ" کے ضمن میں کوئی سند یا دلیل پیش نہیں کی گئی ہے۔یہ ان کا ایک

مفروضہ ہے۔

5۔ ''خالص بلوچ'' کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ وہ کون سا قبیلہ یا ماخذ تھا۔ جہاں تک براہوئیوں سے گڈمڈ ہونے کی بات ہے تو براہوئی بھی کوئی غیر بلوچ نسل نہیں ہے۔ دراصل وہ بنیادی نکتہ کی وضاحت نہیں کر سکے ہیں۔ درحقیقت ساجدیوں نے اپنے ایک جنگجو شخص میران جلسب زئی کی سرکردگی میں براہو جدگال جنگ میں میر بجار براہو کی مدد کی۔ اسی اتحاد کی بنا پر میران کا لشکر ''براہوئی'' کہلایا یعنی میروانی طائفہ ''براہو'' کا اتحادی اس کے علاوہ ''براہوئی'' کی اور کوئی تعریف نہیں ہے۔ اسی اتحادی ہونے کو مئولف نے ''براہوئیوں سے گڈمڈ ''ہونے کا نام دیا۔ لسانی حوالہ سے ساجدی بلوچی بولنے والا قبیلہ ہے۔

6۔ ایک قرن تیس سال کا ہوتا ہے۔ اٹھارہ قرون، پانچ سو چالیس سال کا عرصہ بنتا ہے۔ بلوچ کا قرن ایک پشت یا پیڑھی ہوتا ہے جس کا عرصہ پچیس سے تیس سال کا درمیانی عرصہ بنتا ہے۔ ساجدی سردار گھرانہ کا نسب نامہ چوبیس پشتوں یا پیڑھیوں پر مشتمل ہے 97-1996ء کے سردار سے ان کے جدامجد تک کے پیڑھیوں کا عرصہ چھ سو سے سات سو سال تک بنتا ہے۔

7۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز جھلاوان ڈسٹرکٹ، موضوع، ساجدی، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء۔

8۔ اٹیک، خاران ضلع میں ایک قدیم موضع ہے۔ مذکورہ ملا محمد اسی موضع کا کوئی پیش امام تھا۔ جس نے کیچ میں مہدویت کا باقی ماندہ سارا کام کیا۔ مہدویت میں ''ذکر'' کی ابتداء اسی نے کرائی۔ جس سے اس دین کے پیروکار ''ذکری'' کہلائے۔ روایت کیا جاتا ہے کہ یہ ملا شروع میں قلات بلوچ کے حکمران میر کمبر رئیس کے دربار سے منسلک تھا اور ملازئیوں کی ایک تاریخی پنجگوری شخصیت ملا شارسان کا شاگرد تھا۔ اور میر کمبر کی سید محمد جونپوری سے مبینہ ملاقات میں ملا محمد اٹیکی بھی ساتھ تھا۔ اور جو پھر اس کا مرید بنا۔

9۔ چونکہ مہدوی نماز کی بجائے صرف اللہ ہُو اور چند دیگر کلمات کا ذکر کرتے تھے اس لئے ذکری کہلائے اور اب ان کا دین ذگری دین کہلاتا ہے۔

10۔ مذکورہ شجرہ نسب 97-1996ء میں ساجدی سردار عبدالکریم ساجدی نے لکھوایا تھا۔

سردار خان گشکوری کے مفروضے

الف۔ بُھو قبیلہ اور وجہ تسمیہ :

بلوچ مورخین میں جناب سردار خان گشکوری ایک ثقہ محقق ہیں اور بلوچ تاریخی تحقیق میں جتنی عرق ریزی انہوں نے کی ہے۔ اُن کے اور جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری کے علاوہ باقی اکثر نام نہاد مورخین نے کہیں سچی تاریخ اور کہیں خود ساختہ اور بے بنیاد روایتوں سے اپنی کتابوں کو مزین کیا ہے۔ جن کی حقیقت علم کی وسعت اور تحقیقی کاوشوں کے نتیجے میں کھل رہی ہے۔ اور اُن کی تصنیفات کا جھوٹا سحر ٹوٹ رہا ہے۔

جناب سردار خان گشکوری کی تصنیفات میں بھی کئی موضوعات پر مفروضے قائم کئے گئے ہیں۔ جن کا ہم یہاں تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں موجود حقائق بیان کریں گے۔ اس وقت اُن کی تصنیف ''چاکر اعظم'' ہمارے مطالعے میں ہے جسے معروف بلوچ رائیٹر عبدالغفار ندیم نے اُردو کے قالب میں ڈالا ہے۔ اصل کتاب انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ سولہویں صدی عیسوی کے رند اتحادیہ میں شامل ''بُھو'' قبیلہ ایک تاریخی قبیلہ رہا ہے اور جو زمانہ قدیم سے کیچ مکران کے حدود میں موجود رہا ہے ہے۔ جب مغربی مکران سے رند قبیلے کیچ مکران کے حدود میں داخل ہوئے تھے تو ان میں ''بُھو'' نامی قبیلہ کوئی نہیں تھا۔ تقریباً دو صدی بعد رندوں نے مکران میں اپنے

مرکز کولواہ (آوارن ضلع) سے بطرف سیوستان (کچھی وسیوی) نقل مکانی کی تو کئی غیر رند قبیلے بھی رند اتحادیہ میں شامل ہو کر ان کے ساتھ چلے۔ ان میں قبیلہ ''بُھو'' کے گروہ بھی تھے۔ جو بقول سردار خان اپنے تین سرداروں میر جاڑو، میر باہر اور میر بجار کی زیر قیادت کلانچ سے روانہ ہوئے اور وقت مقررہ سے پہلے کیچ پہنچے (کیچ کی بات غلط اور مفروضہ ہے۔ شیہک کا قلعہ اور رندوں کا مرکز کولواہ کا ''آشال'' نامی موضع تھا۔ کولواہ اُن دنوں ''سرمکران'' یعنی مغرب کو جاتے ہوئے پہلا سرا اور مشرق کو جاتے ہوئے آخری سرا (حدّ) کہلاتا تھا۔

''بُھو'' قبیلہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

> ''بُھو''، رند امیر جلال خان کی براہ راست نسل سے ہے۔ بُھو، امیر چاکر کی سیادت و سربراہی میں اصلی رند آبادی پر مشتمل تھے بعد ازاں ایک ہی تنے سے کئی شاخیں بلاواسطہ نکلیں۔ (صفحہ نمبر 110 و 111 کا حاشیہ)

مذکورہ بیان گشکوری صاحب کا اپنا خیال ہے۔ جیسے کہ اوپر ہم نے کہا ہے کہ ''بُھو'' قبیلہ مکران میں رندوں کی آمد سے پہلے موجود تھا۔ جب بعض رند گروہوں نے کیچ کے دشت میں بھوؤں کے خشکابہ راضیات میں اپنے گدان نصب کئے تو بھوؤں نے اپنی زمینوں پر قبضے کے خوف سے رند گروہوں کی مزاحمت کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کیچ کے اکثر علاقوں میں جہاں پر پہلے سے موجود قبیلے آباد تھے، انہوں نے

رندوں کی اپنے زیر قبضہ علاقوں میں آبادکاری کی مزاحمت کی۔ یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ یہ علاقے ویران پڑے ہوئے نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر رند قبیلہ اپنی آبادکاری کے شروع میں کیچ کی حدود سے دور جیسے کولواہ، رخشان وغیرہ میں آباد ہوئے۔ کولواہ کے آشال کو مرکز بنانے کی یہی وجہ تھی۔ اور وہاں ہندی قبیلے ''کولواہ''، ''بیدی'' اور مادہ وغیرہ کے باقیات تھے جو مزاحمت نہ کر سکے۔ موضعی نام کولواہ، اسی ''کورواہ'' کی بلوچی ادائیگی ہے۔ اس قبیلہ کی باقیات اب بھی مکران کے بعض قبائل میں موجود ہیں۔

موجودہ وقت میں ''پُھو'' قبیلہ کے باقی ماندہ منتشر گھرانے ضلع کیچ اور ایرانی بلوچستان میں گمنام حیثیتوں میں موجود ہیں۔ ان کا کوئی سربراہ نہیں اور ''بلوچ'' کے عمومی نام کے پردے میں رہ کر اپنی نسل کے لوگوں یا گھرانوں سے پوشیدہ ہیں۔ مکران میں یہ رجحان بیشتر قبائل کو اپنی مرکزیت اور برادری سے بیگانہ کر چکا ہے۔

کیچ کے تحصیل مند اور دشت کے گنتی کے پُھو اپنے کو رند نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ وہ رندوں سے صدیوں قبل موجود ہوتے تھے اور دشت کی بیشتر اراضیات کے مالک ہوتے تھے۔ انہیں سبی اور کچھی وغیرہ کے پھو قبیلہ کا کوئی علم نہیں ہے۔ ان کا قبیلائی خالص بلوچی نام بھی ان کے قدامت کا ثبوت ہے جبکہ رندوں کے اکثر قدیم شخصی اور قبیلائی نام تُرکی الاصل نام ہیں جو ''پُھو'' کے مقابلے میں ان کے نووارد ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اب آئیں اس قبیلہ کے نام ''پُھو'' کی طرف جس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

> '' پُھو'' کے بلوچی زبان میں لفظی معنی روئی کے گالے کے ہیں۔ اور ادبی معنی سُفید اور صاف وشفاف کے ہیں''(صفحہ 111 کا حاشیہ)

مذکورہ معنی اور تشریح اس لفظ کے تاریخی اور اصل معنی بھی نہیں ہے اور نہ اس اصطلاح یا نام کو واضح کرتے ہیں۔ روئی کو بلوچی میں ''پُھکی'' کہتے ہیں۔ جسے مشرق کو نقل مکانی کرنے والے بلوچ بھول اور کھو چکے ہیں۔ اور ہندی اور سندھی کے اثرات کے تحت وہ اسے ''کرپاس'' کہتے ہیں۔ بلوچی میں یعنی قدیم اور خالص بلوچی میں ''پُھو'' بالوں کو کہتے ہیں۔ مغربی بلوچ بھی اب تقریباً اس خالص بلوچی لفظ کو ترک کر چکے ہیں اور اس کی جگہ سر کے بالوں کیلئے فارسی ''مُو'' کی بلوچی کردہ شکل ''مُود'' استعمال کرتے ہیں اور بدن کے نسبتاً باریک اور کوتاہ بالوں کیلئے ''پُٹ'' کا لفظ بولتے ہیں۔ نہایت باریک اور الجھے ہوئے سفید بالوں کو پُھو کہتے ہیں۔ یہ پُھو کی موجودہ تعریف ہے۔ پھپھوندی والے سفید ہلکے جالے کو بھی پھو کہتے ہیں۔ ''پھو بندگ'' پھپھوندی لگنا، خراب ہونے کی ابتداء کیلئے مستعمل ہے۔ ''پُھو'' قبیلہ قدیم قبیلوں میں ایک ایسا نسلی گروہ یا خونی سلسلہ ہوتا تھا جس کے بدن بالوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ نہ صرف بدن بلکہ ان کا چہرہ بھی کثیر بالوں والا ہوتا تھا۔ آج بھی قبائل میں ایسے لوگ

بہت ہیں جو کثیر بالوں والے ہیں۔ ان کثیر بالوں کی نسبت سے ان لوگوں کو "پھو" کہتے تھے۔ اس زمانے میں اس کے کوئی ادبی معنی نہیں ہوتے تھے۔ اس صفت سے متصف کسی بھی شخص کو "پُھوڑ" کہتے ہیں، اسی صفت کا حامل ایک جڑی بھی ہے جسے "منور پُھوڑ" کہتے ہیں۔ خالص بلوچی کا یہ قدیم لفظ اب اپنے قدیم معنوں میں کُردی یعنی براہوئی میں محفوظ ہو گیا ہے۔

ایرانی بلوچستان میں ایک قدیم قبیلہ "مندش" ہے۔ جو اپنے کو کیچ کے علاقہ "مند" کا قدیم حقیقی مالک بتاتا ہے جواب تقریباً رند بالادستی اور ملکیت میں ہے۔ ان کا نام "مندش" (مند والے) بھی اس سچائی کا اظہار ہے۔ ان کے ایک معتبر شخص کینگی کا کہنا ہے کہ پُھو قبیلہ انہی سے ہے یعنی مندش ہے۔ اور وہ محض اپنے کثیر جسمانی بالوں کی وجہ سے پُھو کہلائے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ کیچی دشت میں ابھی تک اُن کی اراضیات پھوؤں کے ساتھ مشترک ہیں اور تقسیم نہیں ہوئی ہیں اور کافی اراضیات پھو آباد کر کے کھا رہے ہیں۔

ب۔ جلال خان۔ رند جدِ امجد

جلال خان، بلوچی روایتوں، قلمی نسخوں، قدیم بلوچی شاعری کے حوالوں اور ان کی سند کی بنیاد پر موجودہ دور کے کثیر التعداد بلوچ قبائل رند، لاشاری، کورائی، ہوت اور جتوئی کے جدِ امجد ہیں۔ جن کی مغربی بلوچستان کے خطہ بمپور وغیرہ میں ورود کے زمانے کا صحیح تعین نہیں کیا جاسکا ہے۔ رندوں کی قدیم شاعری میں کہا گیا ہے کہ وہ واقعہ کربلا کے دوران یا بعد یزید کی مخالفت و جارحیت کے نتیجے میں چوالیس قبیلوں کو ساتھ لے کر حدود ایران میں بلوچ خطے میں پہنچے۔ اس طرح بعض مصنفین نے ان کے ایران میں داخلے کے زمانے کو 670ء و 680ء کا زمانہ لکھا ہے۔ "بلوچ قوم، تاریخی واقعات اور حقائق" کے مصنف سیستان کے ایک حکمران شمس الدین کے بارے میں لکھتے ہیں جن کا ذکر رندوں کی متذکرہ شاعری میں کیا گیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ جس زمانے میں سیستان میں مذکورہ شمس الدین حکمران تھا وہ وہاں آئے تھے۔

> " اس وقت سیستان کا بادشاہ شمس الدین تھا اور اس کے بلوچوں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ 681ء میں شمس الدین کو جب کہ وہ نماز جمعہ ادا کرنے جارہا تھا حسن بن صباح کے فدائین نے برسر بازار شہید کر دیا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا بیٹا بدرالدین جو اس کی فوتگی کے بعد تخت پر بیٹھا، اس سازش اور ارتکاب جرم میں شریک تھا..... بدرالدین بلوچوں کا دشمن ہوا اور اس کا رویہ

بلوچوں کے ساتھ معاندانہ تھا۔ اس لئے جلال خان اپنے قبائل
لے کر مکران کے ہارین بندر کی جانب چلا آیا۔ "(1)

جناب سردار خان گشکوری نے امیر جلال خان کا زمانہ (1100-1185ء) تحریر کیا ہے۔ اور سیستان میں ملک شمس الدین صفاری کی حکمرانی کا زمانہ 559 ہجری لکھا ہے جس کے وقت جلال خان سیستان سے ایرانی بلوچستان کے بمپور میں چلا آیا(2) جبکہ سندھی تاریخ "تحفۃ الکرام" میر جلال خان کو حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانے کے مکران کے گورنر "ہارون مکرانی" (3) کی اولاد سے بتاتا ہے جو 705ء کی شخصیت تھی۔ واضح ہو کہ رند شجرہ نسب پر جلال خان کا باپ "ہارون" ہے۔ لیکن وہ کسی بھی تحریر میں "ہارون مکرانی" نہیں کہلاتا ہے۔

جناب سردار خان گشکوری نے لکھا ہے کہ وہ بمپور ہی میں رہے اور وہیں فوت ہو گئے (4) جبکہ ہتورام نے اپنی تاریخ میں رند روایتوں کے حوالے سے اس کی فوتگی کیچ میں دکھائی ہے۔ اور لکھا ہے کہ جب اُسے قبر کر کے لوگ واپس آئے تو اس کے بیٹے ہوت کی ماں نے قلعہ (کیچ) کے دروازے بند کر دیئے اور کیچ پر اپنے بیٹے کا حق جتایا۔ اور ہوت کی عمر اس وقت سات برس کی تھی (5) حالانکہ جس زمانے میں رند قبیلہ کیچ ملک کے آخری مشرقی سرحد "سرمکران" یعنی کولواہ میں پہنچے تھے تو جلال خان صدیوں پہلے مر چکا تھا اور وہ کیچ تک پہنچا ہی نہیں تھا اور اس کے بیٹوں کے نام کے قبیلے ایرانی بلوچستان میں ہی تشکیل پا کر ہزاروں کی تعداد تک پہنچ چکے تھے۔ اور یہ جتنا

کچھ بھی لکھا جا چکا ہے سارا مشکوک اور مفروضوں اور قیاس آرائیوں پر مبنی ہے۔ اس طرح ان کے سلسلہ نسب کی باتیں یا تحریریں بھی متضاد ہیں۔ جناب سردار خان گشکوری نے میر چاکر رند کے والد سردار شیہک رند کو میر جلال خان سے آٹھویں پشت پر لکھا ہے اور اس کا شجرہ نسب یوں درج کیا ہے:۔

" میر شیہک رند ولد میر اسحاق خان رند ولد میر
کالو خان رند ولد میر منان رند ولد میر بیزن رند ولد میر
بلوچ خان ولد میر رند خان ولد میر جلال خان" (5)

تاریخ بلوچستان میں رائے ہتورام نے میر جلال تک، میر شیہک کا سلسلہ نسب یون درج کیا ہے:۔

" میر شیہک ولد میر شہداد ولد میر عبداللہ خان
ولد میر رند ولد جلال خان" (6)

ہوت قبیلہ کا مرکز ضلع کیچ کا تمپ رہا ہے۔ اور ان کے گھرانے کیچ اور کلاتو وغیرہ میں آباد رہے ہیں۔ ان میں کسی گھرانے کے پاس قبیلہ کے جد امجد ہوت تک کا کوئی شجرہ نسب دستیاب نہیں ہے۔ پنجگور اور قلات کے تاریخی حکمران اور خوانین قلات کے جد امجد میر کبر رئیس کو بھی مصنفین نے ہوت نسل سے کہا ہے۔ اور میر کبر کا سلسلہ نسب میر حمزہ نامی رئیس تک موجود ہے۔ لیکن اس شجرہ نسب میں نہ جلال خان درمیان میں آتا ہے اور نہ ہوت۔ اس کے برخلاف رند ولاشار وغیرہ کے شجرہ ہائے نسب میں کسی

حمزہ کا نام نہیں آتا۔ اگرچہ ہتورام نے رندوں کے جد امجد اعلمش رومی کو نبی صلعم کے عم حضرت امیر حمزہ کا بیٹا لکھا ہے(7) جو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اسلامی تواریخ سے متفقہ طور پر ثابت ہے کہ ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں بچی تھی اور اعلمش رومی ایک ثابت شدہ اور مصدقہ ترک بادشاہ تھا جو ترکی کے شہر اناطولیہ کے موضع "روم" کا باشندہ تھا۔ جسکی نسبت سے وہ رومی کہلاتا تھا۔

اس طرح اس مختصر سے جائزے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ میر جلال خان سے متعلق اکثر تحریریں مشتبہ اور مفروضہ ہیں جو ایک طویل اور وسیع تحقیق کے متقاضی ہیں اور ایسی تحقیق کی ابتدا مغربی بلوچستان اور ایران زمین سے کرنی ضروری ہے۔

حواشی:

1۔ احمد خان قیصرانی، مطبوعہ پائلٹ ایجوکیشن پراڈکٹس۔ لاہور صفحہ 52۔

2۔ "چاکر اعظم" مطبوعہ ایم ایم ٹریڈرز کوئٹہ 1985ء صفحہ 115۔

3۔ تحفتہ الکرام نے "ہارون مکرانی" کو مکران کا گورنر لکھا ہے۔ جبکہ دیگر تواریخ میں "محمد بن ہارون مکرانی" ہے جو حجاج بن یوسف کی طرف سے مکران کا گورنر تھا اور دیبل کی مہم میں محمد بن قاسم کی کمان کی افواج کا جرنیل تھا۔

4۔ چاکر اعظم از سردار خان گشکوری، مطبوعہ ایم ایم ٹریڈرز کوئٹہ، 1985ء صفحہ 115۔

5۔ ایضاً۔

6۔ تاریخ بلوچستان، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1998ء صفحہ 15-14۔

7۔ ایضاً صفحہ 16۔

ج۔ ماہری/مہیری

مذکورہ بالا نام دو قدیم قبیلوں کے نام ہیں۔ ماہری قبیلہ ایک عرب قبیلہ ہے جسے المہری لکھا جاتا ہے۔ جبکہ مہیری پندرھویں صدی عیسوی میں بلوچوں کے رند قبائل کے ساتھ مکران سے آنے والا ایک جت (1) قبیلہ تھا۔ اس قبیلہ کی چند ایک معروف شخصیتیں بلوچی شاعری اور رند روایات میں مذکور ہیں۔ یہ بڑا مالدار قبیلہ تھا جس کے پاس اونٹوں، گایوں اور بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑ ہوتے تھے۔ قویل جت، اپنے وقت کے مشہور بلوچی شاعر ہو گزرے ہیں۔ اس قبیلہ کی ایک جوان اور خوبصورت عورت گوہر تھی جو ایک نہایت ہی امیر اور مالدار عورت تھی۔ بارہ مسلح چرواہے چھتیس محافظ، اعلیٰ نسل کے کتوں کے ہمراہ اس کے اونٹوں، گایوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ چراتے تھے۔ اس کی تین چار اور خوبصورت بہنیں تھیں۔ روایات میں ان کے کسی باپ یا بھائیوں کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ اسی گوہر کو پناہ دینے اور اس کے اونٹوں کے تھنوں کو کاٹ دینے کے جُرم میں رندوں اور لاشاریوں میں مشہور تیس سالہ لڑائی چھڑ گئی تھی جس کے نتیجے میں سمّی رندوں اور کھچی لاشاریوں سے چھن گئی اور دونوں جنگجو قبیلوں کے بیسویں طائفے اور ان کے اتحادی بلوچستان سے بے وطن ہو کر دیار غیر میں پناہ گزین ہوئے اور آپس میں اور غیروں کیلئے صدیوں تک لڑتے رہے۔

مذکورہ گوہر کا قبیلہ "مہیری" کہلاتا تھا۔ جو کچھی کے ایک نہری علاقہ کچھروک میں آباد تھی۔ بعض مصنفین نے اسے ایرانی بلوچستان سے آنے والا قبیلہ بتایا

اور بعض نے عربوں کا ماہری (المہری) سے منسوب کیا۔ ''دی لٹریری ہسٹری آف بلوچیز'' میں جناب سردار خان گشکوری نے بھی مہیری کو عرب قبیلہ ''ماہری'' بتایا ہے (2) جو غلط ہے۔ انہوں نے یہ دھوکہ مہیری کے ملتے جلتے نام سے کھایا ہے۔

'' مہیر '' پاکستانی صوبہ بلوچستان کے مکران کے ضلع کیچ کی تحصیل مند کا سرحدی موضع ہے۔ اسی موضع پر پاکستان و ایران ممالک کی سرحد بندی ہوئی ہے۔ اور اسی موضع میں دونوں ممالک کی سرحدی محافظوں کی چوکیاں آمنے سامنے قائم ہیں۔ پندرھویں صدی کے دوران یہ علاقہ جٹ قبائل کا مسکن تھا۔ یہاں پر جٹوں کے نام سے ایک جوئے آب سیاہ بنام ''جٹ جو'' ہوتا تھا اور یہ نام آج بھی ان کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔ گوہر اور اس کے اعزاء اسی ''مہیر'' کے باسی تھے۔ اور اسی مسکن کی نسبت سے ''مہیری'' کہلائے۔ ماہری قبیلہ کا مہیری جت قبیلہ سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔

حواشی:

1۔ واضح ہو کہ ''جٹ'' قبیلہ، جاٹ یا جٹ قبیلہ سے الگ ہے۔ جٹ بلوچی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی شتر پال اور اونٹ چرانے والے کے ہیں۔ یہ پیشہ ورانہ نام ہے۔ کسی بھی قبیلہ کا شتر پال جٹ کہلاتا ہے۔ قدیم شتر پال اپنے پیشے کی نسبت سے بلا تخصیص قبیلہ ایک الگ قبیلہ بن گیا ہے، ان کا سرکردہ شخص بلوچی میں میر جٹ کہلاتا ہے۔ کچی گزیٹر میں تحریر ہے کہ۔

'' مسٹر ہیوگز بٹلر نے 1901 کی مردم شماری رپورٹ میں تشریح کی ہے کہ جاٹوں میں بھی اندرونی تمیز ہے۔ بلوچ، شتربانوں اور چرواہوں کو جاٹ قبیلہ کے اندر جت طائفہ پکارتے ہیں۔ یہ شتربان دیگر جاٹوں سے مختلف زبان بولتے ہیں اور ان کی کئی رسمیں بھی الگ ہیں۔ ماخذ کے لحاظ سے بھی وہ جاٹوں سے علیحدہ ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بلوچوں کے ساتھ اُن کے چرواہوں کی حیثیت سے آئے۔''

(بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر ڈسٹرکٹ کچھی، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997، صفحہ 305)

2۔ ''دی لٹریری ہسٹری آف بلوچیز حصہ اول مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، ایڈیشن 2010، صفحہ 90۔

د۔ میروانی قبیلہ

مصنف کتاب صفحہ ۱۲۴ پر میروانیوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:۔

'' باوثوق روایات کے مطابق اس وقت قلات کا حاکم میرواڑی قبیلے کا عومر تھا جو اس جگہ کا متنازعہ مگر مستقل قابض تھا۔''

حاشیے میں مصنف نے فارسی کتابچہ "اخبار الابرار" مصنف آخوند محمد صدیق کا حوالہ دیا ہے جس کی کتاب خود اسی فیصد مفروضوں اور من گھڑت بیانات کا مجموعہ ہے۔ اکثر مصنفین نے اسے تنقید کا نشانہ بنایا ہے(1) آگے لکھتے ہیں:۔

" ہمیں میرواڑیوں کے بارے میں بہت کم
معلومات حاصل ہیں، جو کہ ایسے لوگ ہیں جن کی نہ
کوئی تاریخ ہے نہ روایات ہیں اور نہ ادب ہے۔ وہ
ایک ایسا معمہ ہیں جس کو تاریخ حل کرنے سے قاصر
ہے۔ یہ شہر ایک بڑی سخت مزاحمت کے بعد چاکر کی
طاقت وقوت کے سامنے زیر ہو گیا۔"(2)

جناب گشکوری کے درج بالا خیالات پر صرف افسوس ہی کیا جاسکتا ہے کیونکہ جو شخص تاریخ پر کام کرتا ہے تو گھر بیٹے صرف دوسروں کے غلط ملط مفروضوں پر مبنی کتابوں پر انحصار کر کے تاریخ سے انصاف نہیں کرسکتا اور بلوچ قوم اور اس کے قبائل کے ماضی وحال کی روایات اور معلومات کے حصول کیلئے ہر طالب علم تاریخ کو محقق بننا پڑتا ہے۔ اور قبائل کے گھروں تک جانے کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اُن سے تعاون لینا پڑتا ہے ان کے ساتھ ہر قبیلہ اور اُس کے علاقے کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ تمام بلوچوں کی تاریخ کوئٹہ کی لائبریریوں میں تلاش نہیں کی جاسکتی۔ یہ کوئی یورپ اور ہندوستان کی تاریخ کا کام نہیں ہے کہ ایک دو لائبریریوں سے استفادہ کر کے کسی

موضوع پر کتاب مکمل کرلی۔ جس قوم کی تاریخ کی بنیادیں ابھی تک پس پردہ ہوں اُس کی تاریخ پر ایک مضمون تحریر کرنے کیلئے بھی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ موصوف نے اور میر گل خان نصیر اور ان کے پیروکار ویسے تو بلوچستان کے سیلانی ہوتے تھے لیکن تاریخی تحقیق کیلئے کسی ایک ضلع یا قبیلہ کے پاس جانے کی تکلیف نہیں کی۔ اور پھر یہ لوگ بیانات اور ریمارکس ایسے داغ دیتے ہیں جیسے انہوں نے بلوچستان کی ایک ایک اینٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا ہے۔

گشکوری صاحب اور میر گل خان نصیر موحوم اور کچھ نہ کرتے صرف کوئٹہ کراچی کے سفر کے دوران ایک رات سوراب میں کسی میروانی کے مہمان بنتے تو انہیں مزید تحقیق کے کئی راستے مل جاتے تھے اور محولہ بالا جیسے خشک اور مایوسانہ رائے زنی کی انہیں ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اگر یہ بھی ان سے نہیں ہوسکتا تھا تو انگریزی گزیٹر بھی ان کی تھوڑی بہت مدد کرسکتا تھا۔ ملاحظہ کیجئے:۔

" میرواڑی ایک اہم براہوئی قبیلہ ہے۔
جھلاوان اس قبیلہ کے راج وطائفے ہیں۔
گوہرام زئی، کرمشاہ زئی، فقیر زئی، سومار زئی اور
جیئندانی۔ وہ سب میرو سے اپنا شجرہ نسب ملاتے
ہیں۔ مغربی بلوچی بولتے ہیں اور اپنے آپ کو
براہوئی کی بجائے بلوچ سمجھتے ہیں۔ ان میں مالی ادا

کرنے والے پاڑے حالد، کوتوال، گزبُر، کلیچو،
جلمبانی، رستمانی، صلاحی، کنرزئی، کورنک اور گجر
ہیں۔ جہلاوانی میروانی زیادہ تر پروار (مشکے)،
نوندڑہ، پیلار اور جھاؤ کی وادیوں میں پائے جاتے
ہیں۔ جہاں اُن کی زمینیں ہیں اور مجموعی طور پر میروانی
ملک کہلاتی ہیں۔ مالی ادا کرنے والے پھاڑے
اپنے ریوڑوں کے ساتھ دریائے مشکے کے آس پاس
کی پہاڑیوں میں اور پورے میروانی علاقہ میں
پھرتے رہتے ہیں۔ جہلاوانی میروانیوں کا سردار
فقیرزئی طائفہ سے ہے جو اپنے قبائلیوں کے ہاں جام
کہلاتا ہے اور نوندڑہ میں رہتا ہے۔ جدگالوں سے
لڑائیوں کے بعد میروانیوں میں خانہ جنگی رہی اور
نوشیروانیوں سے ان کی جنگیں بہت مظلوم قضوں کا
موضوع ہیں۔"(3)

ایک غیر ملکی ہمارے پہاڑوں کے بیچ پہنچ سکتا ہے مگر ہمارے تاریخ نویس مین سڑک کے کنارے کے میروانی تک نہیں جاسکتا۔ اور تاریخ و تحقیق اپنے گھر میں تھالی میں مانگتا ہے۔ میر گل خان نصیر مرحوم میروانی کے میرو کو سوراب اور مشکئے سے تلاش

نہیں کرسکا لیکن ہزاروں میل دور کرمان کی البُرز کے کوہستان سے اُسے برآمد کرتا ہے۔ سبحان اللہ۔ کتنا تاریخی انکشاف تھا جسے بیچ راستے میں بے لحاظ تاریخ نے دفن کردیا۔

جہاں تک سردار خان گشکوری کا یہ کہنا کہ میروانیوں کی نہ تاریخ ہے نہ ادب ہے تو انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ بلوچی شاعری کی تاریخ میں رند شاعری کے بعد سب سے بڑی اور ضخیم شاعری میروانیوں کی ہے۔ جس کے بارے میں یورپیوں کو بھی علم تھا۔

" میروانی علاقے کے ماہرین انساب، مورّخ
اور شاعر ہیں اور اہل سیف و قلم ہیں۔"(4)

جہلاوان اور اس کے آس پاس شاید ہی کوئی ایسی رزم آرائی ہو جس پر میروانی شاعروں نے نظم نہ کہی ہو اور اُسے شاعری میں محفوظ نہ کیا ہو۔ میروانیوں کے مرکزی شہر نغاڑ سوراب سے لڑی جانیوالی مشہور لڑائی جو میروانیوں اور جدگال قبائل کے درمیان طویل عرصے تک لڑی گئی، جسے گھر بیٹے تاریخ لکھنے والے مورّخین نے میروانیوں اور سردار چاکر رند کی سربراہی میں ہونے والی لڑائی لکھا جس کو میروانی شاعر نے "براہو جدگال جنگ ءِ شیئر" کے نام سے جستجو کرنیوالوں کیلئے محفوظ کیا جو بلوچی شاعری کا ایک بے نظیر شاہکار ہے(5)

گشکوری صاحب کے کہنے کے برعکس نہ میروانیوں کی اصل گم ہے نہ ان کی تاریخ اور روایات گم ہیں لیکن ان تک پہنچنے والی نظر چاہیے(6)

حواشی:

1۔ملاحظہ کیجئے آخوند کی تصنیف "اخبار الابرار" کا اُردو ترجمہ از میر گل خان نصیر بنام "تاریخ خوانین قلات" صفحہ نمبر 12 اور صفحہ نمبر 14 اور "بلوچستان تاریخ کی روشنی میں" از ملک محمد سعید دہوار صفحات نمبر ۷۸۶ اور ۷۸۴۔

2۔میر چاکر کی سربراہی میں رندوں کی میروانی سے کوئی لڑائی نہیں ہوئی ہے۔ یہ جھوٹا قصہ آخوند محمد صدیق نے اپنی تاریخچہ "اخبار الابرار" میں اپنے ذہن سے گھڑا ہے۔ نہ میر عمر قلات کا حاکم رہا ہے اور نہ قلات سے اس کا تعلق رہا ہے۔ وہ سوراب کے نغاڑ میں رہتا تھا اور میروانی سردار تھا۔ جو جدگالوں کے حملہ میں مارا گیا۔ میر عمر اور میر چاکر ہم عصر بھی نہیں تھے۔ دونوں کے زمانوں میں ایک صدی سے زیادہ کا فرق ہے۔ میر چاکر اور رندوں کے خلاف مزاحمت جدگالوں نے کی جن کے سربراہ خمیر جدگال اور سردار کانبو خان نامی تھے۔ قلات کا نچارا قلعہ انہی جدگالوں کے قبضے میں تھا۔ لڑائی رندوں اور جدگالوں کے درمیان ہوئی تھی جس میں سردار کانبو خان مارا گیا۔ اس لڑائی کے نتیجے میں نچارا قلعہ رندوں کے ہاتھ آ گیا۔ جہاں پر میر مندہ خان رند حکمران بنا۔ تفصیل کیلئے گذشتہ صفحات کی طرف رجوع کریں۔

3۔ملاحظہ کریں ڈسٹرکٹ گزیٹر جھلاوان اور ڈسٹرکٹ گزیٹر مکران میں موضوع "مکران"

4۔ڈسٹرکٹ گزیٹر مکران، موضوع "میروانی"۔

5۔ملاحظہ کیجئے کتابیں "ایک نظم ایک تاریخ" اور "براہوجدگال جنگ ءِ شیئر" از الفت نسیم۔

6۔ میروانی تاریخ اور روایات کے لئے ملاحظہ کیجئے گذشتہ صفحات میں موضوع "میروانی/گرگناڑی"۔ تفصیل کیلئے کتاب "تاریخی نبشتانک (بلوچی)" از الفت نسیم، مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، 2009ء۔

ر۔ نمرودی/نُمردی

جناب سردار خان گشکوری نے نمرود پر لکھتے ہوئے دیگر حوالوں سے لکھا ہے کہ وہ چیتے کی کھال پہنتا تھا اور ایسی رتھ پر سواری کرتا تھا جسے چیتے کھینچتے تھے۔ اس جانور کو کلدانی اور عبرانی دونوں زبانوں میں نیمرہی کہتے تھے۔ پھر اس نیمرہی کی وضاحت حاشیے میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> " اسی نام کی مناسبت سے ابھی تک ہمارے ہاں ایک قبیلہ نُمرودی یا نُمردی کے نام سے موجود ہے۔ اسی کو وسیع تر معنوں میں نمرودی کہا جاسکتا ہے جس کے معنی نمرود کے پیروکار یا اس کی اولاد کے ہیں"۔(1)

1۔کتاب "چاکر اعظم" صفحہ 9 کا حاشیہ۔

جناب سردار خان گشکوری کی مذکورہ وضاحت ایک بے بنیاد اور من گھڑت بات ہے جس کا مقصد ''نمرود'' کے نام کی نسبت سے کسی قدیم قبیلہ کی موجودگی ثابت کرنا ہے۔ جبکہ حقیقتاً نمرود کے نام سے کسی الگ قبیلے کا کبھی وجود نہیں رہا ہے۔ نمرود خود کو نمرود بلوچ کہتا اور کہلواتا تھا اور اس کی نسل نے بھی اسی نام کو برقرار رکھا تھا۔ لہذا جناب سردار خان کا قبیلہ نمرودی کی وضاحت غلط ہے اور اسکی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ جہاں تک قبیلہ ''نہمر دی'' کا تعلق ہے جسے انہوں نے نمرودی سے مشابہت رکھنے پر ''نمرود'' کا قبیلہ اور ''اسکی اولاد'' لکھا، وہ پندرھویں صدی کا ایک الگ ہوت بلوچ قبیلہ ہے جو اس زمانے میں خضدار کے مشرق کی کیرتھر پہاڑی سلسلے میں بود و باش رکھتا تھا۔ جس کا ذکر آئین اکبری میں ابوالفضل نے بھی کیا ہے اور اسے ''نہمر دی بلوچ'' قبیلہ لکھا ہے جس کا مرکز ''جلفت بلوچ'' طائفہ ہوتا تھا جو اب بھی موجود ہے۔ عرب اور ایرانی مصنفین نے اس نام کو ''نمری'' اور ''النمری'' بھی لکھا ہے۔ لیکن بنیادی نام ''نہمر دی'' یعنی نو 9 جنگجوؤں کے اتحادی یا لوگ ہے۔

نہمر دی نام کے بارے میں روایت ہے کہ مکران کا ایک مقامی حاکم ملک سعد نامی تھا جو کہ حضرت علیؓ کے خلافت کے ایام میں بڑا طاقتور اور سرکش تھا۔ جب مکران پر عرب افواج کے حملے کا خطرہ بڑھ گیا تو ملک سعد نے علاقے کے نو بڑے قبائل سے ایک ایک جنگجو کمانڈر چُنا اور ان کی سرکردگی میں نو بڑے مسلح لشکر تشکیل دیئے ان لشکروں کے لوگ اپنے نو سپہ سالاروں کی نسبت سے ''نہمر دی'' کہلائے۔ واضح

ہو کہ عدد نو 9 کو بلوچی زبان میں ''نُہہ'' کہتے ہیں۔ اس عہد سے یہ ایک قبیلے کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

جب حجاج بن یوسف نے مکران کے مقامی گورنر محمد بن ہارون کو اسی نہمر دی قبیلہ سے تھے، دیبل کی مہم پر محمد بن قاسم کا ساتھ دینے کیلئے کہا تو انہوں نے مکران سے بھی اپنا لشکر تشکیل دیا جو اسی قبیلے سے تھے۔ دیبل کی مہم میں نہمر دی قبیلہ کے لوگ لسبیلہ اور سندھ کی پہاڑی علاقوں میں بستے گئے، پندرھویں صدی کے دوران وہ بڑی عددی اکثریت رکھتے تھے اور بہت طاقتور تھے۔

جناب سردار خان گشکوری کا مفروضہ نمرودی قبیلہ کا نہمر دی سے کوئی تعلق نہیں۔ اور وہ ایک من گھڑت اصطلاح ہے جس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

ز۔ نوحانی قبیلہ

قبیلہ نوحانی پندرھویں سولہویں صدی عیسوی میں نہایت ہی اہم قبیلہ رہا ہے۔ مکران سے لے کر لسبیلہ تک اس قبیلہ کی بڑی ناموری رہی ہے۔ کولواہ کا علاقہ تمام تر اس کی بالادستی میں رہا ہے۔ اس کی اتحادیہ میں بلوچ قبائل کے علاوہ کئی بلفت قبیلے بھی شامل رہے ہیں۔ رندوں کی کچھی کی طرف نقل مکانی میں اس قبیلہ کا بڑا دستہ میر عمر نوحانی کے کمان میں رندوں کے ساتھ شامل تھا۔ بعد میں یہ رند اتحادیہ ہی میں شُمار ہوتا تھا۔ اس قبیلہ کی اصلیت یا بنیاد کے بارے میں کوئی تحریری مواد دستیاب نہیں ہے۔

سردار خان گشکوری نے اپنی زیر مطالعہ کتاب میں اس کے بارے میں لکھا ہے :

" نوحانی قبیلہ قدیم ترین بلوچ قبائل میں سے
ایک ہے اور روایت ہے کہ وہ پیغمبر نوح علیہ السلام
کی اولاد ہیں۔ اس لئے نوحانی کہلاتے ہیں"(1)

گشکوری صاحب کا اس بارے میں حضرت نوح علیہ السلام کی نسبت کی روایت کا تذکرہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس قسم کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ اور بلوچ نظام قومداری میں لاحقہ "آنی" اولاد کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ کسی جنگی اتحادیہ کی تشکیل کی صورت میں اپنایا جاتا ہے جب ایک مرکزی شخص یا "زئی" کے گرد مختلف گروہوں یا لشکروں کا اجتماع ہو۔ سولہویں صدی کے بعد بعض قبیلوں نے اپنا قبیلائی دامن بڑھانے کیلئے اس لاحقے کا قدیم اصولوں کے خلاف استعمال کیا۔ اگر یہ قبیلہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کا ہوتا اور اس سے نسبت رکھتی تو یقیناً بنی نوح کہلاتا یا نوحی کہلاتا۔ نوحانی کبھی نہیں کہلاتا اور یہ لاحقہ قدیم زمانے میں قدیم بلوچ اوطان میں نظر نہیں آتا۔

" نوحانی" کی روایت پورے بلوچستان میں صرف پنجگور میں ایک تاریخی لڑائی کے ضمن میں ملتی ہے۔ یہ لڑائی ایرانی گجر (قاچار) جارح لشکر اور پنجگوری قبائل کے مابین کوہ بُن کے مقام پر لڑی گئی۔ پنجگوری قبائل کا سرکردہ قبیلہ "رئیس" قبیلہ ہوتا تھا جس کا جنگجو جرنیل "نوحان" نامی ایک سردار تھا جس کا قبیلہ نامعلوم ہے۔

ایرانی جارح لشکر کا سپہ سالار شاہ پور نامی قاچار تھا۔ اُس وقت کے حاکم پنجگور رئیس قبیلہ کی لڑاکو شخصیت میر کمبر رئیس نے اپنے لشکر سے نوحان کی مدد کی۔ ایرانی سپہ سالار شاہ پور میر کمبر کے ہاتھوں قتل ہوا اور ایرانی گجر لشکر پسپا ہوا۔(2)

اگر مذکورہ "نوحان" نوحانی قبیلہ کا جداامجد تھا تو پھر وہ رند قبیلہ سے کسی صورت نہیں ہوسکتا کیوں کہ پنجگور کے حدود میں رندوں کو مقامی قبیلہ رئیس اور دیگر نے گھسنے اور ٹکنے نہیں دیا تھا۔ اور وہ باہر سے رخشان کی طرف بڑھے تھے۔ اس صورتحال میں "نوحان" کا رئیس قبیلہ سے ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔ اگر وہ رئیس الاصل تھا تو پھر وہ میر کمبر رئیس کے خانوادے سے ہوں گے اور خوانین قلات، میروانی اور نوشکی کے ذگر قبیلہ کے ہم نسل ہیں(3) ذگروں کا ان دنوں مرکز کچک کی وادی ہوتا تھا جہاں ان کی قدیم آبادی کا ثبوت "ذگرانی کھور" (ذگروں کی ندی) کے نام سے آج بھی موجود ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خوانین قلات کے بارے میں آخوند محمد صدیق نے اپنی فارسی کتابچہ "تاریخ الابرار" میں ایک روایت کا تذکرہ کیا ہے جو مندرجہ بالا قیاس کی تصدیق کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

" زرّک، دُرّک اور ذکریا تین بھائی تھے،
زرّک سے احمدزئی اور کمبرانی، دُرّک سے نوحانی
بلوچ اور ذکریا سے ذگر مینگل وجود میں آئے۔"(4)

اس روایت کے پس منظر میں جو خاکہ ہے وہ بہت جاندار ہے۔ میروانی احمدزئی (کمبرانی)، میر کمبر رئیس حاکم پنجگور و سرحد اور فاتح قلات وزہری کا خانوادہ ہے۔ ذگر بھی پنجگور کے کچک کا رئیس قبیلہ رہا ہے۔ جو بعض گچکی اور رخشانی رندوں کے ساتھ بطرف قلات نقل مکانی کر گئے تھے اور قلات کے دشت گوران میں پہلے سے آباد مینگل رندوں کے پہلو میں آباد ہوئے اور پھر اکثریتی مینگل (5) کے غمی خوشی کے ساتھی بن کر مینگل بن گئے۔ لیکن اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے نسلی نام "ذگر" سے دستبردار نہیں ہوئے۔ جیسے کہ رند مینگل نام "رند" سے دستبردار ہوئے۔

" نوحان" بھی جیسے کہ ہم نے کہا تھا، پنجگوری کی شخصیت تھی۔ اگر یہی نوحان ہی نوحانی قبیلہ کا جدّ ہے تو پھر آخوند محمد صدیق کی بیان کردہ روایت ایک صحیح روایت ہے اور "نوحانی" کا رند قرار پانا مشکوک ٹھہرتا ہے۔ ممکن ہے کہ "نوحانی" بھی ذگروں کی طرح رندوں ہی کے تعاقب میں نقل مکانی کر گئے ہوں اور ان سے کسی مقام پر مل گئے ہوں اور پھر رند اتحادیہ کے رکن بنا دیئے گئے ہوں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے نام سے کوئی موضع اور یادگار بطور نشانی وجود نہیں رکھتا۔ کیچ کی تحصیل تمپ اور قرب وجوار میں چند گھرانے نوحانیوں کے ہیں۔ وہ اپنے کو رندوں سے منسوب نہیں کرتے اور نہ وہاں رند، نوحانیوں سے نسلی قربت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ نہ رند ان کے بارے میں قدیم رشتوں سے آگاہ ہیں اور نہ کہ نوحانی اپنی اصل اور قدیم علاقے کے بارے میں جانتے ہیں۔

حواشی:

1۔ زیر نظر کتاب "چاکر اعظم"، حاشیہ صفحہ 119۔

2۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے کتاب "کمبران" صفحات 10۔51 اور 52۔

3۔ "ذگر" کے لئے ملاحظہ کریں موضوع "میر بجار کی رندوں سے لڑائی کی تیاری" کا حاشیہ نمبر 5 اور موضوع "میر بجار کا علاقہ سوراب اور وڈھ میں بلوچوں کا قتل" اور اس کا حاشیہ نمبر 2، اور موضوع "مینگل"۔

کمبرانی اور میروانی کے لئے دیکھیں موضوع "کمبرانی" اور اس کا حاشیہ نمبر 2، اور موضوع "میروانی، گرگناڑی" اور اس کے حاشیے۔

4۔ آخوند محمد صدیق کی تصنیف "اخبار الابرار" کا اردو ترجمہ بنام "تاریخ خوانین قلات" مترجم میر گل خان نصیر، صفحہ نمبر 22۔ ذگر قبیلہ کے جدّ امجد کا نام اس کتاب میں ذکریا لکھا گیا ہے جو آخوند کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ "ذگر" خالص بلوچی نام ہے اور قبیلہ کے جدّ امجد کا نام رہا ہے۔ پندرھویں صدی کے کوہستانی بلوچ کو "ذکریا" جیسا شہری نام سوجھتا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے اپنے علاقائی ماحول سے اور مسلسل ورثے میں آنے والے بلوچی نام اپناتے تھے۔ آخوند کے اس مفروضہ نام کو گزیٹر نے بھی اپنایا اور میر گل خان نصیر نے بھی اور لکھا کہ "ذکریا" براہوجد گال جنگ میں بھی شامل تھا۔ جو کہ غلط بیان ہے۔ اس جنگ پر کہی گئی میروانی شاعر کی نظم میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ جنگ کے ابتدائی دنوں میں ذگروں کی طرف سے جو لشکر میروانیوں کا اتحادی بنا اس

کا سرکردہ شخص ''سماعیل ذگر'' تھا۔جس کے نام سے قبیلہ سالانی تشکیل پا گیا بعد میں سماعیل نے جنگ سے کنارہ کشی اختیار کی اور ذگر قبیلہ نوشکی جا چکا تھا۔اور جنگ میں شریک نہیں تھا۔اس طویل نظم کی تفصیلی کہانی میں کہیں بھی ''ذکریا'' نامی کسی شخص کا نام نہیں آتا۔جو یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ نام ذگر قبیلہ میں وجود نہیں رکھتا تھا۔زرک سے میر گل خان نصیر نے ''زرکزئی'' قبیلہ کا جد امجد مراد لیا ہے (دیکھئے ''تاریخ خوانین قلات '' کے صفحہ 23 کا حاشیہ) جو غلط ہے۔وہ دوسرا زرک تھا جس کے باپ کا نام ''تنگہ'' (جدگالی کے زیر اثر ''تنگسو'' مشہور ہے) تھا اور قبیلہ کا ریکس توک تھا۔جسے گزیٹر والوں کو غلط طور پر ''زرخیل'' لکھوایا گیا ہے۔خوانین قلات کے نسبی سلسلے کا یہ ''زرک'' اور ہے۔اس کا باپ ''میرزہرا ابن میر کمبر ابن میر سعد تھا۔یہ نام احمدزئی خوانین کے شجرہ نسب میں دیکھا جا سکتا ہے۔نیز ''زرک'' کے لئے دیکھئے موضوع ''زرکزئی''۔

5۔ ''مینگل'' کے لئے دیکھیں موضوع ''مینگل''۔

سرزمین بلوچ کے مصنّف مولائی شیدائی کے مفروضے

رحیم داد مولائی شیدائی، سندھ کا ایک معروف بلوچ مصنّف تھا۔اس نے کئی کتابیں سندھی اور اُردو میں لکھیں۔ان کی ابتدائی کتابوں میں مفروضوں کا انبار نظر آتا ہے۔مفروضوں کے علاوہ انہوں نے کئی یوروپی، فارسی اور عربی معروف کتابوں کے غلط اور بے بنیاد حوالے دیئے ہیں جو اُن کتابوں کے مصنّفین نے بیان ہی نہیں کئے ہیں۔مذکورہ نقائص سب سے زیادہ ان کی کتاب ''سرزمین بلوچ'' میں نظر آتے ہیں۔ تاہم بعد کی کتابوں میں انہوں نے یہ رویہ اپنایا نہیں ہے اور تحقیق کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ان کی تصنیف ''جنّت السندھ'' (سندھی) پڑھ کر یہ یقین ہی نہیں آتا کہ ''سرزمین بلوچ'' واقعی انہی کی تصنیف ہے۔چونکہ وہ لسانی حوالہ سے براہوئی سپیکنگ تھے اس لئے جگہ جگہ وہ لسانیت سے مغلوب نظر آتے ہیں اور غیر حقیقی اور بے بنیاد حوالوں سے کام چلاتے ہیں۔بلوچ قوم پرستی سے مغلوب ہونے کی بنا پر وہ ایک ذمہ دار مؤرخ کا کردار ادا کرتے نظر نہیں آتے جیسے کہ ہم نے اوپر کی سطروں میں کہا کہ ان کے یہ تمام نقائص اور کمزوریاں زیادہ تر اسی ''سرزمین بلوچ'' نامی تصنیف میں نظر آتی ہیں۔یہاں ہم چند مفروضوں اور غیر حقیقی بیانات قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

'' سرزمین بلوچ '' کے صفحہ نمبر 25 پر ''براہوئی'' بلوچوں کے بارے میں مفروضہ قائم کرتے ہیں:۔

" براہوئی پہلے بلوچ تھے جو شام، کردستان اور
گیلان سے ہو کر بحرہ خضر کے جنوبی ساحل سے لے کر
سیستان کے راستے بلوچستان میں وارد ہوئے اور اس
طول اور طویل سفر میں انہوں نے ترکمانوں اور
ایرانیوں سے رشتہ کیا اور عیسوی صدی کی شروعات
میں انہوں نے قلات کے اردگرد سکونت اختیار کی۔
"(1)

صفحہ نمبر 26 پر لکھتے ہیں:۔

" انہوں نے جٹوں کو نکال کر میر عمر میرواڑی کے
زیر اثر سکونت اختیار کی، غرض میرواڑی پہلے بلوچ
تھے جنہوں نے بلوچستان میں قدم رکھا.....
بلوچستان کا حکمران میر عمر کی اولاد سے ہے اور احمدزئی
خاندان کہلاتا ہے"۔(2)

مزید لکھتے ہیں:

" ان کا قدیم وطن حلب تھا۔ بلوچ میر حمزہ کی اولاد
ہیں جو قریش کا ایک ممتاز امیر تھا بعض لوگ عام
طور پر غلطی سے امیر حمزہ کو عم رسول صلعم تسلیم کرتے

ہیں۔"(3)

صفحہ نمبر 27 پر ابن حوقل بغدادی کا غلط حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

" ابن حوقل بغدادی جو ہجری چوتھی صدی کا سیاح
ہے وہ اپنے سفر نامہ میں بیان کرتا ہے کہ براہوئی کچھی
اور گنداوہ میں موجود تھے"۔

حالانکہ ابن حوقل نے کہیں بھی براہوئی کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے اور نہ کہ اتنی تفصیل دی ہے۔ انہوں نے کرمان میں کئی گروہوں (زم) کی بود و باش کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں ایک "زم بُردھی" ہے۔ انہوں نے بُردھی کو براہوئی بنا دیا۔ بُردھی اب بھی بلوچستان اور سندھ کے بلوچوں کا ایک قدیم قبیلہ ہے جسے سندھ میں "بردی" بولا اور لکھا جاتا ہے۔ بعضوں نے اِس "بُردی" اور "بلیدی" کو ایک نام اور ایک قبیلہ لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔ ابن حوقل نے پھر دوسرا قبیلہ "بدھا" کا تذکرہ کیا ہے اور اسے غیر یقینی طور پر "بدھا" یا بندھا لکھا ہے۔ اس کے بارے میں انہوں لکھا ہے کہ قندابیل (گنداوہ کچھی) میں بود و باش رکھتے ہیں یہاں بھی مولائی شیدائی نے ڈنڈی ماری اور "بدھا" کو براہوئی میں بدل کر قلمی ہیرا پھیری کی۔ یہاں اُس نے قندابیل کو گنداوہ اور کچھی لکھا جبکہ اسی کتاب کے صفحہ 184 کے حاشیے میں وضاحت کرتا ہے کہ "قندابیل آج کل نیارو بیلو کہلاتا ہے اور یہ لسبیلہ میں ہے" حالانکہ لسبیلہ میں کوئی نیارو بیلو نامی جگہ نہیں ہے البتہ "وایارہ" نامی موضع ہے۔

صفحہ نمبر 35 پر لکھتے ہیں:۔

" پہلے بلوچ براہوئی تھے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد پہلی صدی میں بلوچستان میں وارد ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہود کی سلطنت کا شام اور فلسطین میں خاتمہ ہو چکا تھا۔ "(4)

صفحہ نمبر 75 کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ

" ڈومبکیوں کا دفتر شعر بھی صاف بتاتا ہے کہ براہوئی قبائل قدیم براہوئی ہیں۔"

مذکورہ حوالہ بھی غلط اور بے بنیاد ہے۔ ڈومبکی کے شعری دفتر میں کہیں بھی براہوئی کا نام نہیں آتا۔ اور آنا بھی نہیں چاہیے کیوں کہ یہ شعری دفتر (دستاویز) سولہویں صدی کے قبائل کا تذکرہ کرتا ہے جب لفظ "براہوئی" وجود نہیں رکھتا تھا۔ یہ تو 1664ء اور 1666ء کے درمیانی سالوں کی مختلف بلوچ قبائلی گروہوں کی اتحاد یہ تھی جس پر پچھلے صفحات میں کئی موضوعات کی ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔

مزید صفحہ نمبر 89 پر لکھتے ہیں:۔

" ابن حوقل بغدادی اپنے سفرنامہ میں اس قوم کو براہوئی کے نام سے لکھتا ہے اور کہتا ہے یہ قوم کچھی گنداوہ سے لے کر سراوان تک پھیلی ہوئی ہے مگر سخت اور جنگجو ہے۔"

اس پر ہم نے پہلے کہا ہے کہ یہ جھوٹا حوالہ ہے۔ اس پیرے میں شیدائی صاحب نے نام "سراوان" کا بھی اضافہ کیا ہے جو ابن حوقل کے زمانے میں وجود نہیں رکھتا تھا۔ "سراوان" اور "جہلاوان" کی تشکیل سولہویں صدی کے وسط میں خوانین قلات کے ایک جدّ اور پہلا حکمران قلات "میر کبیر رئیس" نے کی تھی۔ ابن حوقل کے فرشتوں کو بھی "سراوان" کا پتہ نہیں تھا۔

اس غلط بیان سے پہلے کتاب کے صفحہ نمبر 88 پر سندھی تاریخ "چچ نامہ" کے غیر حقیقی حوالہ دے کر لکھتے ہیں:۔

" چچ نامہ میں ذکر ہے کہ رائے خاندان کے راجاؤں کے زمانہ میں جو بڑی سزاؤں والے مجرم ہوتے تھے ان کو "بروہی پہاڑوں" میں جلاوطن کیا کرتے تھے۔"

چچ نامہ میں بھی کہیں "بروہی پہاڑوں" کا ذکر نہیں ہے۔ ہاں البتہ اس دور کے کئی تاریخوں میں یہ ذکر ضرور ہے کہ خضدار کا علاقہ "کالا پانی" مشہور تھا۔ جہاں بعض حکمران اپنے مجرموں کو وہاں محبوس رکھتے تھے۔ "بروہی پہاڑوں" کے الفاظ پہلی دفعہ انگریزوں نے وسطی ہربوئی سلسلے کی پہاڑیوں کیلئے استعمال کیا۔ جن میں براہوئی قبائل رہتے ہیں۔ چچ نامہ کا حوالہ جھوٹا حوالہ ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ نمبر 91 پر بلیدیوں کے بارے میں درج ذیل مفروضہ قائم کرتے ہیں:۔

" بلیدی جو مکران میں تین سو برس قبل مسیح علیہ
السلام موجود تھے ان کی طوائف الملوکی کا دور ۱۷
صدی تک قائم رہا۔ بلیدی یا بروی اصل میں وسط
عرب میں نجد کے باشندے ہیں۔ ان کا اصلی وطن
بُریدا ہے جو ریاض کے شمال میں ہے۔..... ان
بریدیوں یا بلیدیوں نے جب مکران میں آ کر سکونت
اختیار کی تو یہاں اپنے وطن کی یادگار میں اس وادی کا
نام بھی بریدا رکھا۔ جس کو یونانی جغرافیہ دانوں نے
بلیدیا کہا۔"

ان نگارشات پر پچھلے صفحات میں بحث ہو چکی ہے۔ "بریدہ" ایک عرب قبیلہ تھا جو بلوچستان میں دو تین مقامات پر آباد ہوا اور یہ آبادکاری اسلامی دور کے ہیں اسلامی دور سے قبل بلیدہ کا میدانی علاقہ "زامووران" کہلاتا تھا۔ اور اب بھی کہلاتا ہے۔ اور اس کا جنوبی پہاڑی علاقہ "گوڑ" کہلاتا تھا (5) جہاں کسی زمانہ میں ہندی قبیلہ "گوڑ" نقل مکانی کر کے بس گیا تھا۔ ہندوستان میں اس قبیلہ کا مسکن "گوڑگاؤں" مشہور ہے نیز ان کا یونانیوں کا حوالہ بھی بالکل غلط اور لاوجود ہے۔ یونانیوں نے کسی تاریخ میں "بلیدہ" کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور نہ کہ ان کا گذر مکران جسے انہوں نے گدروشیا لکھا ہے، کے اس شمالی حصے سے ہوا ہے۔

صفحہ نمبر 92 پر مزید لکھتے ہیں:۔

" قبل مسیح علیہ السلام بلیدہ کے بلیدئی آفتاب
پرست تھے اُن کی آفتاب پرستی دنیا کی قدیم قوموں
سے ملتی جلتی ہے۔"

سبحان اللہ۔ ایسا لکھتے ہیں جیسے نسل در نسل بلیدہ ہی میں رہتے آئے ہیں۔

صفحہ نمبر 93 پر مزید گوہر افشانی ملاحظہ ہو:

" بلوچستان کی وادی بلیدیہ میں آفتاب پرستی
رائج تھی اور بلیدہ قدیم یونان کی تاریخ اور جغرافیہ میں
آچوسیا کہلاتا تھا اور ہیروڈوٹس وہ جاگرافی دان
مورخ ہے جس نے مصر، یونان، اشور اور بابل کے
ساتھ قوم بلیدیہ کا بھی ذکر کیا ہے۔..... مؤرخین کے
مطابق بلیدئی اور براہوئی دو قدیم بلوچی اقوام ہیں جن
کا سُراغ قدیم تاریخی کتابوں میں مل سکتا ہے"

غالباً مصنف اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ ہیروڈوٹس کی تحریریں صرف اور صرف اُسی نے پڑھی ہیں اور بلوچ اور بلوچستان اور اس خطے پر تحقیق کرنے والے بیسویں محققین کی نظر اُن پر نہیں پڑھی ہے۔ مزید ملاحظہ فرمائیں:

" براہوئی جو عیسوی پہلی صدی میں بلوچستان میں

وارد ہوئے وہ سب کے سب نیم آزاد تھے اور قلات
کے قدیم سیوا ہندو خاندان کی فوج میں ان کو عزت
حاصل تھی اسی طرح جو گیلان یا فارس میں تھے اور
ایران کے کسریٰ کے ماتحت تھے۔"

کتاب کے صفحہ 98 پر ایسے ہیرے جواہرات بکھیرتے ہیں:

" سکندر کے بعد جب بلخ میں یونانی حکومت قائم
ہوتی ہے۔ اس زمانے میں مکران میں بلیدی طوائف
الملوکی اختیار کرتے ہیں۔ ایرئین، پلینی، ودیگر
یونانی سیاحوں اور جغرافیہ دانوں نے وادی بلیدہ کے
شہروں کے یونانی زبان میں نام دکھائے ہیں"۔

نہ مذکورہ مورخین کی کتابوں کا حوالہ، نہ کسی اور کے حوالہ کا تذکرہ نہ کہ کسی ایک شہر کا یونانی نام لکھا۔ بلیدہ کوئی گاؤں نہیں ہوا ایک سلطنت ہوئی۔ آدمی سر دھننے کے علاوہ ان مفروضات پر کیا خامہ فرسائی کرسکتا ہے، مزید صفحہ نمبر 100 پر پڑھیں اور سر دھنیں:

" زمانہ قدیم میں بلوچوں نے دو ہجرتیں کیں۔
ان میں سے بلیدی وادی بلیدہ میں سو برس تک قبل مسیح
علیہ السلام کے نظر آتے ہیں جو مکران یعنی جنوبی

بلوچستان میں ہے۔"

اور مزید :

" ساسانی، کیانی اور اشکانی دوروں کی خبر نہیں کہ
بلوچ کہاں تھے اتنا پتہ ہے کہ اسکانیہ دور میں براہوئی
بلوچستان میں وارد ہوئے تھے۔"

اسی براہوئی کو وہ شروع سے بلوچ بتاتے آرہے ہیں لیکن یہاں اُسے بلوچوں کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں تھے۔ براہوئیوں سے تو وہ ملاقات کرکے آیا تھا۔ مندرجہ بالا بیان کو پھر صفحہ 167 پر دھراتے ہوئے لکھتے ہیں:

" بلوچوں نے ایک ہجرت تاریخ کے زمانے
سے پہلے کی جب وہ مکران کی وادی بلیدہ اور سیستان
تک پھیل گئے۔ پھر براہوئی آئے اور سراوان تک
بلکہ کچھی تک پھیل گئے پھر شاہ پور ثانی کے زمانہ میں
ان کو عرب چھوڑ کر، کرمان اور خلیج فارس میں سکونت
اختیار کرنی پڑی۔ "

یہ متضاد اور خود ساختہ خیالات شاید کوئی افلاطون سمجھ لے۔ تاریخ کا قاری تو سر بہ گریبان ہے۔ کہ کیا پڑھے اور کیا سمجھے۔ آگے پھر صفحہ 197 پر ابن حوقل کا جھوٹا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

" براہوئی قوم کے متعلق ابن حوقل نے لکھا ہے
کہ قلات سے لے کر سندھ کی سرحد پر گنداوہ تک یہ
جنگجو قوم پھیلی ہوئی تھی۔ سندھ کے متعلق اس کا بیان
ہے کہ چاروں طرف اُس پر براہوئی قوم کا محاصرہ
تھا۔ "

صفحہ نمبر 230 پر لکھتے ہیں:

" سلطان عبدالرشید کے زمانہ ۴۴۴ ہجری سومرہ
قوم کے سرداران سومار نے سندھ میں ایک خودمختار
سلطنت قائم کی۔ بلوچستان میں کچھی کا علاقہ جو پہلے
براہویوں کے ماتحت تھا اب قلمرو سومرہ میں شامل
ہوگیا۔ یہ بھی قرمطی تھے۔"

صفحہ نمبر 239 پر پھر سابقہ کچھ ملاحظہ کریں :

" عیسوی ۱۰ ویں صدی میں اس علاقہ (قلات
کے گردونواح) پر براہوئیوں کی حکومت تھی جیسا کہ
ابن حوقل بیان دے چکا ہے اور اُس زمانہ میں گنداوہ
براہویوں کا کچھی میں صدر مقام تھا۔ جس طرح ان کے
بلوچ بھائی جنوبی بلوچستان میں ہندوستان اور ایران
کی تجارتی شاہراہ پر قابض تھے۔ اسی طرح براہوئیوں

کے قبضے میں بولان اور مولا کے سر اوان جانے والے
دو درّے تھے مگر ان کی ریاست برائے نام تھی"۔

لگتا ہے کہ مصنّف اس قول کی پابندی کر رہا ہے کہ جھوٹ کو اتنی مرتبہ دھراؤ کہ وہ سچ ثابت ہوجائے۔ لیکن تاریخ میں ایسا ہونا صرف وقتی ہوتا ہے ہمیشگی نہیں۔ تاریخ کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے کہ وہ اپنے دامن میں ڈالے گئے کچرے جلد یا بدیر پھینک دیتی ہے۔

چونکہ مذکورہ کتاب ایک سطحی اور مکمل مفروضوں اور غیر حقیقی بیانات سے بھری ہوئی کتاب ہے اس لئے اس کے ہر تحریر پر تبصرہ وخیال آرائی بے سود ہے۔ جو قدیم مصنّفین اور جغرافیہ دانوں کے حوالے کتاب میں درج کئے گئے ہیں وہ جھوٹے ہیں اور ان کتابوں میں وہ تحریریں موجود نہیں ہیں۔ بعض بیانات ایسے بھی ہیں کہ ان پر اشاراتی نمبر دیئے گئے ہیں لیکن حاشیے میں کوئی حوالہ درج نہیں کیا گیا ہے جس سے قاری کو یہ تاثر دیا گیا ہے کہ حوالہ درج کرنیکی بھول ہوئی ہے حالانکہ غلط بیانی کو چھپانے کیلئے یہ حربہ استعمال کیا گیا ہے۔ بعض ایسی باتیں یا تحریریں ہم نے قارئین کے سامنے رکھی ہیں جن پر پچھلے صفحات میں بحث کی گئی ہے اور ان کی حقیقت بیان کردی گئی ہے۔ "براہوئی" قبائل کا موضوع جسے مصنف نے بار بار جھوٹے حوالوں سے دھرایا ہے پر بھی پچھلے صفحات میں حقائق کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اُسکی پوری حقیقی تاریخ بیان کردی گئی ہے۔

سُمالانی

سمالانی قبیلہ بنیادی طور پر ذگر (رئیس قبیلہ) کا طائفہ رہا ہے اور سماعیل جو قبیلہ کا جدامجد تھا، سماعیل ذگر کہلاتا تھا۔ میرو براہو کے زمانے میں جدگالوں کے خلاف وقتاً فوقتاً کی لڑائیوں میں میروانیوں کا اتحادی تھا۔ لیکن جب مینگلوں او رمیروانیوں میں ناراضگی ہوگئی تو سماعیل الگ ہوا اور میر بجار کی سرکردگی میں جدگالوں کے خلاف لڑنے سے انکار کیا حالانکہ میروانیوں کا داماد تھا۔

سمالانیوں کا مرکز جہاں اُن کا سردار گھرانہ رہتا ہے گدر کا مقام ٹوبہ ہے۔

جہلاوان گزیٹر سے سماعیل کو میرو براہو کا بھائی لکھا ہے جو غلط ہے (1) جب وہ میروانی تھا ہی نہیں تو میرو کا بھائی کیسے ہوا۔ اس بارے میں تفصیل ملاحظہ کیجئے موضوع ''میروانی، گرگناڑی'' اور ''میر بجار کا رندوں سے لڑائی.....'' کا حاشیہ نمبر 4

1۔ ڈسٹرکٹ گزیٹرز آف بلوچستان، جہلاوان ڈسٹرکٹ، موضوع ''سمالانی'' مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997۔

سُہر قبیلہ

'' سُہر'' قبیلہ ایک قدیم قبیلہ ہے۔ جو موجودہ وقت میں خاران میں آباد ہیں اور ان کے کچھ افراد پنجگور میں آباد ہیں۔ کسی وقت یہ بڑا قبیلہ ہوتا تھا۔ خاران گزیٹر میں ان کے بارے میں ان کی اپنی روایتوں کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ وہ کولواہ مکران کے رند ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ جو دریائے بڈو کے کناروں کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔

مذکورہ روایت گزیٹر مرتب کنندگان کی یا تو اپنی ذہنی اختراع ہے یا پھر کسی عام شخص سے ایک سنی سنائی بات ہے۔ کیونکہ سہر سرکردہ لوگوں کے علاوہ خاران کا ہر قدیمی باشندہ سُہروں کو خاران کے قدیم ترین قبائل میں گنتے ہیں۔ خود خاران کے سابق حکمران خاندان نوشیروانیوں کا کہنا ہے کہ پیرک زئی اور سُہر خاران کے قدیم ترین قبیلوں سے ہیں۔ دریائے بڈو کے ساتھ ساتھ اراضیات کا ایک سلسلہ ہے جو نوشیروانی سرداری اور حکمرانی سے پہلے ''سُہرء وطن'' کے نام سے مشہور رہا ہے۔ خود ''سہرء وطن'' یعنی سُہر قبیلہ کا ملک کا نام ان کے قدامت کی طرف واضح اشارے دیتا ہے۔

'' سُہر'' لفظ حقیقت میں ''سُرخ'' کی بلوچی ادائیگی (1) ہے۔ ''سُرخ'' ایک بہت ہی قدیم تورانی قبیلہ تھا۔ جو بلوچستان کے پٹھان اضلاع، افغانستان، سابقہ

سیستان میں آباد تھا۔ اور ایک خانہ بدوش قبیلہ ہوتا تھا۔ اس قبیلہ کے پرانے آبادکاری کے آثار متذکرہ بالا علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پشین ضلع میں ''سرخ آب'' (سُرخاب) نال میں ''سُہر دمب'' منگچر میں قدیم موضع ''سُہر'' اور سوراب جہلاوان میں گاؤں ''سُرخ'' اسی قبیلہ کے نام پر ہیں۔ بلوچستان میں قدیم تورانی قبائل میں ''سُرخ'' قبیلہ کا مرکزی مقام یہی سوراب تھا۔ خود ''سُوراب'' بھی ایک تورانی تُرک قبیلہ تھا۔ جسے روایتاً گُجر قبیلہ کی ایک شاخ کہا جاتا ہے۔ جو سوراب کے علاوہ نال میں بھی آباد تھا۔ جہاں اُس کے نام کا موضع موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سوراب کا ہی ''سرخ قبیلہ کا کوئی گروہ نقل مکانی کر کے خاران جا بسا تھا جہاں سے اُس کے چند گھرانے پنجگور میں جا کر آباد ہوئے۔ یہی سُرخ وہاں مقامی بولیوں کی وجہ سے ''سُہر'' کہلائے۔

اس قبیلہ کا ایک تاریخی نامور بزرگ حضرت سیّد شاہ جلال سُرخ بُخاریؒ گذرے ہیں جو شہباز قلندر حضرت عثمان مروندی، حضرت غوث بہاالدین ذکریا ملتانی اور حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے ہم عصر تھے اور ان کے ساتھ سندھ اور پنجاب کے علاقوں میں تبلیغ دین کرتے تھے۔ مذکورہ سُرخ بزرگ کے نام کے ساتھ ''سید'' کا سابقہ ہے لیکن بلوچستان کے سُرخ قبیلہ میں سے کسی نے بھی سیّد ہونے کا اشارہ نہیں دیا ہے۔

حواشی :

مملکت مکران اور موجودہ بلوچستان میں تُرکی الاصل تُرک نژاد بلوچوں (رند و لاشار قبائل) کی آبادکاری سے قبل کے نسلی بلوچ قبائل عربی اور فارسی کے تمام آوازوں کے حروف کو ان کی حقیقی صورت میں ادا کر سکتے تھے۔ وہ ث، س، اور ص، ت، ط، ز، ض، ذ، پ اور ف اور خ کو ان کی صحیح آوازوں میں بولتے تھے۔ اب بھی جہاں جہاں اُن قدیم قبائل کی باقیات موجود ہیں وہ اسی طریقے سے ان الفاظ کو ادا کرتے ہیں۔ مثلاً مری، کرد، بگٹی، محمد شہی، محمد حسنی، نارویی، خراسانی اور بعض دیگر قبائل میں موجود قدیم نسلی بلوچ گروہ آج بھی ان حروف کو اپنی اصل صورت میں ادا کرتے ہیں۔ ان طائفوں اور رندوں کی آمد سے قبل کے قبائل نے جو سراوان اور جہلاوان میں موجود تھے، رند قبائل کو بعض آوازیں اپنی اصلی صورت میں ادا کرنے کی تحریک دی۔ اب ان علاقوں میں اکثر حروف ان کی اصل آوازوں میں بولے جاتے ہیں۔ لیکن بعض علاقوں میں جیسے کہ مکران، کولواہ، خاران وغیرہ میں رند، ہوت، رئیس، جدگال، قبائل جو جم گئے اور قدیم نسلی قبیلوں پر حاوی ہو گئے تو انہوں نے اپنے قدیم تُرک لہجے کو حاوی کر دیا۔ تُرک قبائل عربی اور فارسی کے کئی حروف کو ان کی اصل آواز میں ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً ف، خ، ث، ح، ض، ع، غ جیسے حروف کی جگہ وہ ''پ'' ک یا ھ، س، ھ، ز، ر، گ بولتے تھے۔ خود افغانستان کے ترک افغان کو ''اوگان'' اور ''اپگان'' بولتے تھے، اسی طرح ''خر'' کو وہ کہیں ''ہر'' اور کہیں ''کر'' ادا کرتے تھے۔ ''خان'' کو وہ ''ہان'' اور

"خُرود" کو "کرود" بعض کو "باز" کہتے ہیں۔ البتہ منگولیا کے بعض قبائل جنہیں بعضوں نے "ترک" کہا ہے وہ فارسی وعربی کے دو تین حروف چھوڑ کر باقی کو ان کی اصل صورت میں ادا کر سکتے تھے۔ وہ "خ" اور "ف" کو پوری طرح اسی آواز میں ادا کرنے پر قادر تھے۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر مغربی بلوچستان کے بلوچ "ث"، ح، خ، ص، ط، ظ، ع، غ، ف، ق کی اصل آواز نہیں ادا کر سکتے۔ وہ "پٹ"، ماث، براث، خر، خرگوش، خبیث، خوار، طاق، طوق، ظاہر، عبدل، عالی، عزیز، رش، غم، غار، غرق، غالی، فرق، نفر، فرض، قلم، قبض، سُرخ، وغیرہ کو پس، ماس، براس، ہریا گر، کرگوشک، ہبیس، واریا کوار، تاک، توک، زاہر، ابدل، آلی، ازیز، ارش، گم، گار، گرک، گال پرک، نپر، پرز، کلم، کبز اور نہر ادا کرتا ہے۔ نہ صرف ادا کرتا ہے بلکہ لکھتا بھی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک بلوچی دانشور سید ہاشمی نے بلوچی رسم الخط پر ایک کتابچہ لکھا اور انہی حروف پر مبنی رسم الخط اپنانے کی تحریک چلائی جس کی تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت نے اور مشرقی اور وسطی بلوچوں نے سخت مخالفت کی اور اسے مغربی بلوچستان، سندھ اور پنجاب اور وسطی بلوچستان کے بلوچوں کو اہمیت نہ دینے اور تنگ نظری پر مبنی قرار دیا۔

سیوی

سیوی اور سبّی، بلوچستان کے ایک ہی شہر کا نام ہے۔ بلوچ اور اس کے قدیم باشندے اسے صدیوں سے ایک ہی نام سیوی سے بولتے ہیں جبکہ دیگر اسے سبّی تلفظ کرتے ہیں۔ سرکاری دستاویزات میں بھی اسے سبّی لکھا گیا ہے۔ حالانکہ بنیادی نام سیوی رہا ہے۔

سیوی کے بارے میں مصنفین نے لکھا ہے کہ "سیوا"، سیوائی، سیوی، اور سیوہن اور سیو، ایک ہی نام "سیوا" کی مختلف شکلیں ہیں۔ جو یقیناً صحیح نہیں ہے۔ اس بارے میں جناب میر خدا بخش بجارانی مری لکھتے ہیں:

> " اسلام سے قبل قلات اور جھلاوان کی پہاڑیاں
> ہندو یا بدھ حکمرانوں کے ماتحت تھیں جو سیوا کہلاتے
> تھے اور لفظ "سیبی" اسی سے مشتق ہے۔"(1)

جناب بجارانی کا استدلال "سیوی" کی وجہ تسمیہ کے بارے میں صحیح نہیں ہے۔ "سیوا" سے "سیوائی" تو بن سکتا ہے لیکن سیوی نہیں۔ البتہ "سیو" سے "سیوی" بن سکتا ہے۔ لیکن یہ نام مرکب نہیں مفرد ہے اور قدیم تواریخ میں "سیوی" قبیلہ کا ذکر موجود ہے۔ اور اسے ایک قدیم خاندان کہا گیا ہے۔ "پری بدھسٹ انڈیا

"میں مذکور ہے کہ یہ ایک قدیم خاندان گذرا ہے جس کے آٹھ بادشاہ ہوگذرے ہیں۔ جن کے نام سیوی، سنجنا، وسنترا، جالی، کہنا، مادایاماڈہ، پھساتی اور ماڈا (دوئم) تھے۔

(2)

مسٹر راگوزین کا "جتکا" کہانیوں میں بیان کردہ "وسنترا" بادشاہ کے بارے میں کہنا ہے کہ وسنترا بڑا سخی بادشاہ تھا اور اس کی سخاوت، اس کے عوام کو پسند نہیں تھی اور طاقتور اُمرا نے عوام سے مل کر اُسے بادشاہت اور ملک دونوں سے نکال باہر کیا۔ جتکا کہانیوں کے مطابق سیوی خاندان کا پہلا بادشاہ "اُسرانا" تھا، لیکن اس کا ذکر "پری بدھسٹ انڈیا" کے مصنف کے آٹھ بادشاہوں کی لسٹ میں نہیں ہے۔ ان کہانیوں میں "سیوا" نامی ایک بادشاہ کا بھی ذکر ہے جسے "اسرانا" کا بیٹا کہا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اُس نے ایک مقام "سیواپور" کی بنیاد رکھی تھی (3) جو پنجاب کے موجودہ جھنگ اور شور کوٹ کے درمیان کہیں واقع تھا۔

کتاب "تاریخ مغربی پاکستان" کا مصنف، سیوی قبیلہ کے ضمن میں رٹی لال مہتہ اور دیگر مصنفین کی تحقیقات پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :

" پری بدھسٹ انڈیا اور "ویدک انڈیکس"
کے مصنفین نے شواہد سے ثابت کیا ہے کہ بارہ سو
سال قبل مسیح سے لے کر آٹھ سو سال قبل مسیح تک کے
زمانے میں ایک سیوی ریاست موجود تھی۔ اور اسی

طرح "پولیٹیکل ہسٹری آف اینشنٹ انڈیا" کے
مصنف نے لکھا ہے کہ تین سو سال قبل مسیح میں سکندر
اعظم سندھ میں داخل ہوا تھا تو سیوی کی ریاست موجود
تھی البتہ اس کا نام سیوی سے سبی میں بدل چکا تھا۔
اور یہ نسل اس پورے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی جو
شور کوٹ اور جھنگ کا درمیانی علاقہ تھا۔" (4)

مصنفین و محققین کی شواہد نے ثابت کیا ہے کہ نام "سیوی" اور "سبی" کسی "سیو" یا "سیوا" کی نسبت سے نہیں ہے بلکہ یہ قبل مسیح کا ایک بڑا قبیلہ تھا، جس نے کئی بادشاہوں کو جنم دیا تھا۔ اور سندھ میں سکندر اعظم کی آمد کے زمانے میں بھی یہ نسل موجودہ پنجاب سے لے کر سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس قبیلہ کے نام پر ایک مرکزی شہر موجودہ "سیوی" موجود تھی جس کا نام سکندر اعظم کے موجودگی میں سندھ کے وقت "سبی" ہو چکا تھا۔ اور یہ سبی سے لے کر کوہستان سیوہن اور پھر پنجاب کے جھنگ وغیرہ تک کے درمیانی خطے میں پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں ان شواہد سے معروف سندھی محقق ممتاز حسین پٹھان کا یہ کہنا درست ثابت ہوتا ہے کہ

" سیوستان کا نام قدیم زمانے میں سندھ کی وادی
میں بود و باش رکھنے والا "سیوا" یا "سیوی" قبیلے کے
نام پر رکھا گیا ہے۔"

وہاں سبّی وکچھی کے شکار پوری جت قبیلہ کی وہ روایت غلط ثابت ہوتی ہے کہ جس میں کہا گیا تھا کہ سبّی کو آباد کرنے والے ایرانی بلوچستان کے گاؤں ''سبّ'' سے نقل مکانی کر کے سبّی میں آباد ہونے والے جت تھے۔ جو یہاں پر ''سبّ'' کی نسبت سے ''سبی'' یعنی ''سبّ والے'' کہلائے اور چوٹیالی کے اس مقام کو اپنا نام دیا۔(5)

حواشی:

1۔بلوچستان، تاریخ کے آئینے میں '' از جسٹس (ریٹائرڈ) میر خدا بخش بجارانی مری۔

2۔سیوی، جالی، گہنہ اور مادا یا ماڈہ نام کے ہندی قدیم قبائل موجود رہے ہیں۔ جس طرح قبیلہ ''سیوی'' کے نام کا موضع بلوچستان میں اس قبل مسیح قبیلہ کا نشان باقیہ ہے۔ اسی طرح ایک قبیلہ ماڈہ ہندی الاصل کسی زمانے میں بلوچستان کے سرکران (کولواہ) میں آباد تھا جہاں اُس کے نام کا قدیم قلعہ ''مادہ قلات'' موجود تھا۔ جسے بلوچ ''ماوگ ءقلات'' (مادہ کا قلعہ) کہتے ہیں۔ مغربی بلوچستان کے بلوچ ہر اُس لفظ کو جس کے آخر میں ''ہ'' آتا ہو، ''گ'' تلفظ کرتے ہیں جیسے زادہ سے زاوگ، کدہ سے کدگ، گہنہ سے گہنگ زادہ سے زاوگ، مادہ سے ماڈگ، زیرہ سے زیرگ، شیرہ سے شیرگ، زدہ سے زدگ، پیادہ سے پیادگ، سادہ سے سادگ وغیرہ وغیرہ۔

موجودہ وقت میں قبیلہ مادہ کا قدیم قلعہ تو بچا نہیں ہے لیکن وہ مقام ہزاروں سال بعد آج بھی وہی نام لئے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ ضلع کیچ میں ایک ندی کے کنارے قدیم بے نشان موضع بھی ''ماوان'' کے نام سے ہے جو مادا یا مادہ کا جمع ہے۔ مکران کے خطے میں اکثر مواضع فارسی زبان کے اثر کی وجہ سے جمع کے طور پر نام لئے ہوئے ہیں۔ جیسے پیشک قبیلہ سے پیشکان، گھڈ قبیلہ سے گھڈان، زامور سے زامووران، ہیت سے ہیتان، خدا باد سے خدابادان، سریکور (اصل نام سریکول) سے سریکوران، تیجادہ سے تیجادان (موجودہ صورت تجابان)، پارک سے پارکان وغیرہ وغیرہ۔

اغلب خیال یہی ہے کہ ''سیوی'' قبیلہ کا برادر قبیلہ مادا یا مادہ مکران جیسے دور دراز خطے تک پھیل گیا تھا۔

3۔کافی تاریخی شواہد کی دستیابی کے پیش نظر آدھے پنجاب سے لے کر تا حدود جھلاوان و سراوان ''سیوا'' کی حکمرانی کے موقف کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ جس سے ہندی محققین کے علاوہ سندھی اور ایک دو بلوچ مورخین نے بھی اتفاق کیا ہے۔ لیکن قلات اور ملحقہ خطے پر سیوا کی حکمرانی کا وہ تذکرہ جو انگریز رائیٹر ''ہنری پاٹنجر'' نے اپنی تصنیف ''سفرنامہ سندھ و بلوچستان '' (حصہ دوئم صفحہ 78) میں کیا ہے جس میں سیوا اور اُس کے بیٹے ''سنگین'' (سوفیصد بلوچی نام ہے) کو سولہویں صدی کی شروعات میں قلات اروزہری میں برسر اقتدار بتایا گیا ہے۔ جسے سندھی اور بلوچ باغیوں نے اس حد تک تنگ کیا تھا کہ مجبوراً اُس کو پنجگور خطے کے حکمران میر کبیر رئیس کو اپنی مدد کیلئے بلانا پڑا

اور اقتدار اُسے سونپنا پڑا، تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ جس پر اکثر مورخین نے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ عربوں کی فتح کے بعد کوئی ایسی تاریخ اور شہادت نہیں کہ جس کی رُو سے یہی ظاہر ہو سکے کہ کسی بھی ہندو مملکت کا اس علاقے کے کسی حصّے میں کوئی وجود تھا۔ (ریورٹی "نوٹس آن افغانستان... صفحات 575-571) "امپیریل گزیٹر آف انڈیا" کے مرتب کنندگان نے بھی ساتویں صدی عیسوی کے بعد کسی سیوائی حکومت کے امکان کو مسترد کیا ہے۔ اس طرح حقیقت وہی ظاہر ہوتا ہے کہ "سیوا" حکمرانی بارہ سو سال قبل مسیح سے آٹھ سو سال قبل مسیح تک کے درمیانی عرصے میں وجود رکھتا تھا۔ اور تواریخی مطالعہ سے اس چیز کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ اسی حکمران کے پیروؤں نے اس کے بے مثال نظام عدل اور سخاوت کی بنا پر اس کے بُت بنا کر پوجا کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے پجاریوں نے سیوا فرقے کی بنیاد ڈالی اور جہاں جہاں تک اس کے پیروکار اس کے دور حکمرانی میں پھیلے ہوئے تھے وہاں وہاں تک اس کے نام کے مندر بنائے گئے۔ ایسا ہی ایک مندر "سیوا مندر" قلات میں بھی بنایا گیا جو آج بھی "قلات بلوچ" کی میری کے نیچے موجود ہے۔ اسی مندر کی وجہ سے قلعہ کا نام سیوا قلات مشہور رہا ہے۔

4۔ بحوالہ "بلوچ اور بلوچستان۔ چند تاریخی گوشے" مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ 2008ء صفحہ 57-53۔

5۔ ایضاً صفحہ 54۔

شیخ حسینی

شیخ حسینی، بلوچستان میں ایک بڑا اور منتشر قبیلہ ہے۔ اس کے بچھڑے ہوئے گروہ نوشکی سے لے کر مشکئے تک کے درمیان مختلف قبیلوں میں بطور طائفے کے ملتے ہیں۔ 1901ء کی انگریزی حکومت کی مردم شماری میں انہیں رئیسانیوں میں شمار کیا گیا تھا اور سراوان میں ان کی آبادی تیرہ سو اکانوے افراد شمار کئے گئے تھے۔ سراوان گزیٹر کے مرتب کنندگان نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "شیخ حسینی قبیلہ اصل میں جھلاوان کے محمد حسنی قبیلہ کے طائفہ ہارونی کی ایک شاخ ہے۔ لیکن سارا وان میں بس گئے ہیں اور قبائل میں جاری و ساری عمل شکست و ریخت کی ایک مثال ہیں۔ رئیسانیوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہیں لیکن قبائلی زمین میں حصّہ دار نہیں ہیں"۔

سراوان گزیٹر کا ان کی اصل کے بارے میں بیان غلط اور ایک مفروضہ ہے۔ گزیٹر کے مصنّفین نے دونوں قبیلوں کے ناموں میں قدرے مماثلت دیکھ کر یہ مفروضہ قائم کیا ہے۔ خود اپنی کوئی تحقیق اور جستجو نہیں کی ہے۔ حالانکہ "شیخ حسینی" کے نام کا شیخ از خود بتا رہا ہے کہ محمد حسنی سے اس کا تعلق نہیں بنتا۔

شیخ حسینی کا بنیادی تعلق علاقہ نوشکی سے ہے۔ جہاں اس کے جدامجد شیخ حسین کا مزار یا زیارت ہے۔ وہ ایک اللہ والا فقیر اور بزرگ شخص تھا۔ اور علاقے کی مشہور بزرگ ہستی سیدذ بلانوش کا داماد تھا۔ شیخ حسین کی بی بی بھی ایک نیکوکار اور عبادت گزار زنانی تھی۔ اس کی بھی الگ زیارت بنی ہوئی ہے۔ جو مرجع عوام وخواص ہیں۔ قبیلہ شیخ حسینی، اسی شیخ حسین کی نسل ہے۔ اس کا طائفہ دیگر قبیلوں میں ہونے کے ساتھ ساتھ محمد حسنی قبیلہ میں بھی ہیں۔ لیکن نسلاً الگ ہے۔

قبیلہ مری

مری قبیلہ، ایک بڑی عددی اکثریت رکھنے والا بلوچ قبیلہ ہے جو اس وقت تین بڑے ٹکڑوں یا طائفوں میں تقسیم ہے جو بجارانی، گزینی اور لوہارانی ہیں۔ آج جو علاقے "مری علاقہ" کہلاتا ہے، کسی زمانے میں یہ سیوستان کا حصہ ہوتا تھا۔

قبیلہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کئی مفروضے زبان زدعام ہیں۔ جن میں کچھ تحریر میں آ گئے ہیں اور کچھ ابھی تک روایتی سفر میں ہیں۔ یوروپی گزیٹئر مرتب کنندگان نے لکھا ہے کہ بجار خان پھور رند (1) سردار چاکر خان رند سے الگ ہونے کے بعد بہ ہمراہ علی خان رند، مندو خان رند، کلو خان رند، ایک لوہار اور کنگرا نامی باغبان اور شاہیجہ نامی شیدی (2) کے اسی کوہستان کے ایک غیر آباد جگہ آباد ہوئے اور پھر تھدڑی اور مُرائی کچھ میں سکونت اختیار کی۔ گزیٹئر کے مرتبین کا خیال ہے کہ مُرائی کی نسبت سے یہ لوگ "مرائی" اور پھر "مری" کہلائے (3)۔

دوسری طرف رائے ہتورام نے مری کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یوں لکھا ہے:

" جس وقت میر چاکر سردار کل اقوام بلوچی
(4) تخت قلات پر قابض اور متصرف ہو کر طرف
ہندوستان جاتا تھا۔ اس وقت بجار خان سردار تمن

مری کا تھا اور اس زمانہ میں یہ قوم مری کے نام سے
مشہور نہ تھی بلکہ یہ قوم بجارانی کہلاتی تھی۔ مری اس
دن سے مشہور ہوا کہ جب میر چاکر بطرف ہندوستان
(5) جاتا تھا اور سردار بجار خان نے ہمراہ جانے
سے انکار کیا تو میر چاکر نے کہا کہ بجار مری ہے۔
مری کے معنی بلوچی میں جن کے ہیں (6) یعنی وہ
آدمی نہیں ہے جن ہے۔ اسی باعث رفتہ رفتہ یہ نام
قوم پر حاوی ہوتا گیا اور قوم بجارانی سے مری مشہور
ہوگئی (7)

کوئٹہ کے کردوں میں ایک روایت چلی آ رہی ہے کہ مری اور بگٹی دونوں قدیم کُرد قبیلے ہیں۔ اور مری قبیلہ کا قدیم مسکن کوئٹہ ہی کی وادی رہی ہے۔ اور کوئٹہ کا ہزارہ ٹاؤن جو ابھی تک مری آباد کے نام سے مشہور ہے بہت قدیم جگہ ہے۔ مرحوم عبدالکریم شورش معروف بلوچ قوم پرست اور بلوچی اخبار "نوکیں دؤر" کے مالک و مدیر نے ایک دفعہ مرحوم عبدالعزیز کُرد کے حوالہ سے کہا تھا کہ ابوالقاسم فردوسی نے اپنے شاہنامے میں جس "مَرباذ" کا ذکر کیا ہے۔ اُس سے مراد یہی "مری آباد" رہا ہے۔ اور شاعر نے شعری و آہنگی ضرورت کے پیش نظر صرف "مرباذ" کہا ہے کیونکہ اشعار کے اوزان میں سے "مری" کا "ی" خارج ہو رہا ہے۔ ممکن ہے یہ نسبتاً صحیح ہو کیونکہ

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پندرھویں صدی کے آس پاس مری اور بگٹی قبیلے "کردگال" بھی کہلاتے رہے۔ اگرچہ تاریخ میں "کرد" الگ قبیلہ رہا ہے اور "کردگال" الگ رہے ہیں۔ کردگال کے معنی محض کردوں کی بولی بولنے یا اپنانے والے کے ہیں (8) نیز ایک اور قدیم بلوچ قبیلہ "توکلی" کسی زمانے میں کردوں اور مریوں میں مشترک رہا ہے جو اس موضوع پر ایک اہم کڑی کا کام دیتا ہے۔

دوسری روایت ایرانی بلوچستان اور خاران کے دامنی بلوچ قبیلہ سے منسوب ہے۔ جو کہتے ہیں کہ وہ بھی مری قبیلہ سے ہیں اور دامان کوہ میں رہائش رکھنے کی بنا پر دامنی کہلاتے ہیں۔ دراصل یہ لفظ "دامانی" ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ آج (1982ء) سے چالیس پیڑھی (پشت، قرن) قبل سیستان کے مَرو※ (9) سے نقل مکانی کر کے آئے تھے اور پہلے پہل وادی شال یعنی موجودہ کوئٹہ میں آباد ہوئے۔ ان کے مطابق مری قبیلہ "مرو※" علاقہ کی نسبت سے مری کہلائے۔ وہ مری سے اپنی علیحدگی کو خانہ جنگی کی وجہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تیرہ پشتوں سے الگ ہوئے ہیں۔

بہر حال مری وجہ تسمیہ ان میں سے جو بھی ہو لیکن جو روایت گزیٹر نے لکھی ہے وہ دیگر سینکڑوں مفروضوں کی طرح ایک مفروضہ ہے۔ محض میر بجار کو ایک بار اس ضد کی وجہ سے "مری" کا لفظ کہنا اُس کی نہ قومیت بدل سکتا ہے اور نہ اُس کا ہمیشہ کیلئے نام بن سکتا ہے۔ اور قوموں اور قبیلوں کے نام ایسے نہیں پڑتے۔

جہاں تک سیستان سے بلوچ تعلق کی بات ہے یہ بھی ایک پرانا اور مستحکم رشتہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ خود سیستان کا نام یوروپی مورخین کے کہنے کے برعکس کرد بلوچ قبیلہ کے نام پر ہے (10) جسکی سرزمین پر اب بھی قدیم بلوچ مواضعات کے نام اور کئی قبیلے موجود ہیں۔ موجودہ آدھے بلوچستان کے علاقے قدیم سیستان کے حدود میں ہوتے تھے۔ بلوچی شاعری کا یہ مصرعہ سیستان سے بلوچوں کی محبت کا ثبوت ہے۔

"مادی پہ سیستان ءِ جناں شیریں"

(ہم بھی سیستان سے محبت کے گن گاتے ہیں۔)

بلوچوں کے قدیم مستحکم رسوم ورواج کا نام ہی "بلوچی سیستان" ہے۔ اس لئے بعید نہیں ہے سیستان والی روایت مری وجہ تسمیہ کے بارے میں صحیح ہو۔ نیز دیگر چند حقائق کو بھی اس موضوع پر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

1۔ مری قبیلہ، اپنے موجودہ خطے میں سینکڑوں سالوں سے موجود تھا لیکن ایک چھوٹا سا اور نسبتاً کمزور قبیلہ تھا۔ جو بعد کے آنے والے طاقتور قبیلوں سے مزاحمت نہ کرسکا اور انہیں اپنی ہمسائیگی اور دامن میں سمٹ کر انہیں اپنا نام دے دیا۔

2۔ یہ یعنی بنیادی مری مرکزہ بلاشک وشبہ ایک قدیم نسلی بلوچ قبیلہ رہا ہے۔ اور اسی قبیلہ کے ایک حصے نے کوہ مری کے خطے میں بس کر اسے اپنا نام دیا ہے۔

3۔ اس قبیلہ کی شاخیں عرب ممالک کی طرف بھی نقل مکانی کرکے وہاں آباد ہوئے ہیں جہاں پر دیگر کئی قدیم سیستانی قبیلوں کی آبادکاری کے آثار ہیں۔ اس قبیلہ سے مشہور فوجی

جرنیل عرب اسلامی افواج میں شامل رہے ہیں جو ہندوستان کی طرف آتے رہے ہیں۔

لہذا موجودہ قبائل بجارانی وگزینی وغیرہ کو اصل مری قبیلہ سمجھنا تاریخی حقیقت نہیں ہے۔ یہ بعد آنے والے انضمامی قبیلے ہیں جنہوں نے بلاشک ان کے قدیم مرکزہ کو ایک عظیم مری قبیلہ میں بدل دیا ہے۔

حواشی :

1۔ مشرقی بلوچستان میں "بُھو" کا شمار رند قبائل کے مرکزہ میں ہوتا ہے جبکہ مغربی بلوچستان کے مکران کے علاقوں میں "بُھو" قبیلہ رندوں سے الگ قبیلہ شمار ہوتا ہے اور وہ اپنے کو رند نسل نہیں مانتے بلکہ کہتے ہیں وہ اصل نسلی بلوچ قبیلہ ہیں جن کی اکثریت تقریباً معدوم ہوگئی ہے۔ ان کی روایت ہے کہ وہ اس وقت بھی مغربی مکران کے مشرقی سرحد کے علاقوں میں رہتے تھے جب مکران نامی کوئی ملک نہیں ہوتا تھا۔ ان کے قبیلہ کا نام "بُھو" بھی بلوچی لفظ ہے۔ جو گھنے اور باریک بالوں کو کہتے ہیں۔ ان کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کے مردوں کا جسم بالوں سے بھرا ہوتا ہے۔ اس واسطے ان کو بُھو کہا گیا ہے۔ اُن کیلئے دوسرے بلوچ "کوہ بلوچ" یعنی پہاڑی بلوچ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ وہ نوحانی بلوچوں سے قریبی رشتہ رکھنے کے دعویدار ہیں۔ اور نوحانی بھی مکران میں اپنے کو رندوں سے الگ بتاتے ہیں۔

2۔ شاھجہ کا شیدی ہونے کی بات بھی غلط معلوم ہوتی ہے۔ شاھجہ (شاہی جہ) کی ترکیب سندھی اور جھلکی ہے۔ اس نام کی ترکیب بتاتی ہے کہ یہ کوئی سندھی یا جاٹ طائفہ

رہا ہے۔نام ”شاہی“ ،شاہ ہو تو ہو سکتا ہے لیکن شاہیجہ نہیں۔مریوں میں شاہیجہ طائفہ موجود ہے لیکن ان میں ایک شخص بھی شیدی شکل وصورت کا نہیں ہے۔زیادہ وضاحت شاہیجہ مری خود کر سکتے ہیں۔

3۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹئر ، مری بگٹی کنٹری، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 610۔مُرائی ایک قدیم قبیلہ ہے اور اس کے باقیات اب بھی سراوان و جھلاوان کے علاقوں میں ہیں۔اس قبیلہ کا قدیم مرکز کولواہ ضلع آواران رہا ہے۔گزیٹئر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نو آمدہ مریوں یعنی رندوں اور بلیدیئوں کی مری علاقے میں آمد سے قبل مرائی وہاں آباد ہو چکے تھے۔نیز مُرائی نام کا مری وجہ تسمیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

4۔سردار چاکر خان رند، کل اقوام بلوچ کا سردار نہیں تھا۔ بلکہ رند اتحادیہ کا سردار تھا۔ یعنی اس کے جتنے قبائل اور قبائلی طائفے تھے وہ انہی کا سرسرداراں تھا۔حتیٰ کہ لاشاری و دیگر بڑے قبیلوں کے اپنے اپنے سردار ہوتے تھے اور وہ ان سب کا سردار اعظم تھا۔ اور اس زمانے کی قبائلی کلچر میں ”بلوچیت“ کا تصور مفقود تھا۔

5۔ ہندوستان سے مراد پنجاب و دوسرے مشرقی خطے تھے جو اس وقت ہندوستان ہی کے ماتحت علاقے تھے۔

6۔ ”مری“ بلوچی میں جن کو نہیں کہتے بلکہ ”مِرگی“ اور اس قسم کی نفسیاتی امراض کو کہتے ہیں جنہیں بلوچ ”جِنّی امراض“ کہتے ہیں۔اور انہیں دیوں، پریوں اور جنّوں سے منسوب کرتے ہیں۔

7۔ تاریخ بلوچستان از ہتورام ،مطبوعہ سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ 2009ء ، صفحہ 51۔

”بجارانی“ قوم اب بھی اپنے ہی نام بجارانی سے منسوب ہے،اس کا نام ”مری“ میں بدل نہیں گیا۔جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مری مرکزہ ”مری“ ہی کے نام سے پہلے سے موجود تھا۔

8۔یاد رہے کہ وقتی لسانی قبیلہ ”کُردگال“ دو ادوار میں منظر عام پر آیا ہے۔غالباً پہلا دور تیرھویں صدی سے پہلے کا دور ہے کہ مختلف غیر کرد لوگوں نے کردوں کی قدیم زبان اپنا لی اور کردگال کہلائے۔ یہ قدیم زبان وہی ہے جو موجودہ زمانے میں مشرقی بلوچی کہلاتی ہے اور اسے مری، بگٹی، مزاری وغیرہ بولتے ہیں۔اس زبان میں سے اگر گذشتہ تین چار سو سال کے دوران جگہ پانے والے سندھی، جٹکی اور ہندی الاصل الفاظ نکال دیئے جائیں تو باقی زبان خالص اور اصل بلوچی زبان ہوگی جو اس زمانے میں کردوں کی بھی زبان ہوتی تھی اور کُردی کہلاتی تھی۔اور جو اس زبان کو اپناتا وہ کُردگال کہلاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی ترکی سرحد کے قریب ”اورامان“ علاقے میں کردوں کے درمیان ”کردگال“ گھرانے بھی ہیں لیکن اب وہ پرانی کُردی (یعنی بلوچی) نہیں بولتے۔لیکن پھر بھی سینکڑوں الفاظ بلوچی اور کردی میں مشترک ہیں۔اگر چند کرد قریب بات کر رہے ہوں تو بلوچی بولنے والا یہی سمجھے گا کہ وہ بلوچی کے ایک لہجے میں بات کر رہے ہیں۔

بلوچوں میں یہ روایت بہت گہرا ہے کہ مری و بگٹی قبیلے کسی دور میں کردگال کہلاتے تھے اور مزاری قبیلے کو بھی بنیادی طور پر کُرد قبیلہ سمجھا جاتا ہے جس کا شمار قلات سیوا کے مفروضہ سیوا حکمرانوں کے باغیوں میں ہوتا تھا۔

" گُردگال" کا بطور قبیلہ دوسری مرتبہ نام موجودہ بلوچستان کے جھلاوان اور سراوان کے چند علاقوں میں سولھویں صدی کی شروعات میں سنی گئی۔ جب گُردی (موجودہ براہوئی زبان) غیر کردوں نے اپنالی۔ یہ غیر گُرد گھرانے جدگال، جاٹ، گجر، رند، نُھمردی اور بلفت قبائل میں سے ہوتے تھے جو گُردی زبان کی نسبت سے "کردگال" کہلائے۔ اصطلاح "گُردگال" ایک بلوچی ترکیب ہے۔ لفظ گال زبان، بولی اور بات کو کہتے ہیں۔ "گُردگال" کی طرح "جدگال" قبیلہ بھی ہے۔ یعنی جٹوں کی زبان اپنانے والے۔ سندھی کو بلوچ "جٹ" کہتے ہیں اور جو بلوچ سندھی یعنی جٹوں کی زبان اپنالے وہ جدگال کہلاتا ہے۔ بنیادی لفظ "جٹگال" ہے جسے ایرانی بلوچوں نے "ٹ" نہ بول سکنے کی وجہ سے "جدگال" بنادیا ہے۔ کردگال اور جدگال دونوں لسانی اصطلاح ہیں۔ "براہوئی" اتحادیہ کی تشکیل کے بعد جب گُردی یا کردگالی براہوئی اتحادیہ کے گھروں تک پہنچ گئی تو اس کا نام گُردی اور کردگالی سے براہوئی میں بدلتا گیا۔ اور نتیجتاً "گُردگال" ایک وقتی قبیلہ بن کر معدوم ہو گیا۔ یعنی وہی کردگال اب براہوئی کہلانے لگے۔

واضح رہے کہ گُرد ایک ہزاروں سال قدیم نسلی بلوچ قبیلہ ہے۔ ایرانی بلوچی لوک کہانیوں کے مطابق نمرود اول بن کوچ کی ایک بیوی کے نو بیٹوں میں سے چار بیٹے بلوچ (بلوچ)، سوس، گیلی، کروس مشہور تھے۔ بلوص کے تین معلوم بیٹے کوچ، نمرود (دوئم) اور مَرد تھے۔ مَرد کے کئی بیٹوں میں سے ایک بیٹا گُرد تھا۔ کرد قوم اسی کی نسل ہے یعنی مرد بن بلوچ کی نسل ہے۔ اس کے قدیم ترین اور شاید اولین آثار

اس کے چند طائفوں کے ناموں پر مواضع اور مقامات کی شکل میں مغربی اور مشرقی مکران میں ملتے ہیں۔ جیسے تلان گُرد، تُجربہ کرد، زامور کرد، سُوس کرد وغیرہ۔

9۔ بلوچ قومی نظام میں ایک پشت پچیس سے تیس سال کے درمیان کا عرصہ ہوتا ہے اور عربی کا لفظ "قرن" بھی تیس سال کی عرصہ کو کہتے ہیں۔ چالیس پیڑھی آن بارہ سو سال کا عرصہ بنتا ہے۔

10۔ سیستان، کسی وقت ایک وسیع وعریض خطے کا نام تھا اور یہ ملک یا مملکت ہوتا تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں محققین نے تحقیق کم اور خیال آرائی زیادہ کی ہے اور مفروضے بیان کئے ہیں۔ بعض نے اسے شبجان کی بگاڑ کہا ہے بعض نے اس کی اصل سیوستان بتائی ہے اور بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ نام دراصل ساکا قوم کی نسبت سے ساکستان کہلایا جو پھر کثرت استعمال سے سیستان بنا۔ مواضع اور ممالک کے ناموں کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ناکام مؤرخین و محققین کا ہمیشہ سے یہی حربہ رہا ہے۔ جب وہ کسی نام کی تاریخ بیان نہیں کرسکتے تو اسے کسی متشابہ نام کا بگاڑ بتا کر گلو خلاصی کرتے ہیں۔ جہاں تک ساکستان وسکستان نام کا تعلق ہے تو یہ لفظ تاریخ کے کسی کتاب میں وجود نہیں رکھتا جو اس چیز کا ثبوت ہے کہ یہ نام کبھی بھی مستعمل نہیں رہا ہے ساکا، ایک سیتھی قبیلہ تھا جسے آریا قبیلہ بھی لکھا گیا ہے جو کسی وقت سیستان میں ایک مختصر مدت کیلئے آباد رہا اور پھر مشرق وجنوب کو چلا گیا۔ یہ گروہ اتنا کثیر اور مستقل آباد کار نہ تھا جو ایک خطے کے نام کی تبدیلی کا باعث بنتا۔ اس کے علاوہ بھی ساکستان سے سیستان بننا ممکن نہیں اور یہ سراسر دیگر مفروضوں کی طرح ایک مفروضہ ہے۔

کسی بھی علاقے کی وجہ تسمیہ جاننے کیلئے پہلی کوشش اس خطے کے قدیم اور اصل قبائل کے بارے میں تحقیق سے ہوتی ہے۔ اگر مصنفین سیستان کے قدیم اقوام کے بارے میں دیانتداری سے تحقیق کرتے تو ان پر آشکار ہوتا کہ حدود کرمان سے کوہ سلیمان تک بشمول جنوبی اور وسطی بلوچستان کے اس خطے کے اکثریتی قبائل میں سے ایک کُرد بلوچ قبیلہ ہوتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس خطے کے اکثر نام بلوچ قبائل کے نام پر ہیں۔ اور کُرد طائفے اکثریت میں ہوتے تھے۔ یہیں سے کئی کرد قبیلے مشرق و مغرب میں پھیلے حتیٰ کہ ایران، ترکی، عراق و دیگر ممالک میں پھیلے۔ باہر سے یہاں نہیں آئے جیسے کہ بعض یوروپی مصنفین کا خیال ہے۔ ان کرد قبائل میں ایک بڑا طائفہ سُوس ہوتا تھا۔ جسے سیس، شیش، شوش، شونس بھی تلفظ کیا جاتا تھا۔ اس لفظ کا معرب شیث ہوتا تھا۔ یہ قبیلہ ایک وسیع خطے پر مال چرائی بھی کرتا تھا۔ جہاں بھی اس کے طائفوں نے آبادکاری کی وہ علاقہ اس کے طائفہ کے نام پر مشہور ہوا جس کے آثار مشرق و مغرب میں آج بھی نظر آتے ہیں۔ چونکہ سیستان کے خطے کا اکثریتی قبیلہ کرد بلوچوں کا یہی سیس یا سوس قبیلہ ہوتا تھا اس لئے یہ خطہ انہی کے نام پر "سیستان" کہلاتا تھا۔ بلوچی میں آج بھی ایک نام یا لفظ "و" اور "ی" دونوں کے آواز میں بولا جاتا ہے۔

مصنفین کا بیان کردہ نام "ساکستان" سے "سیستان" ایک بے بنیاد اور من گھڑت نام ہے جس کا حقیقی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

قفص/کوپچ/کوچ

نویں دسویں صدی عیسوی کے عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے ایران کے کرمان سے مکران کے ساحل سمندر کے درمیانی خطے میں دیگر بلوچوں کے ساتھ "کوچ و بلوچ" کا کثرت سے تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے ان بلوچ قبائل کے ناموں کو معرب کر کے لکھا ہے۔ "کوچ و بلوچ" (کوچ بلوچ) کو انہوں نے دو قبیلے جان کر انہیں "قفص و بلوص" اور کہیں "کوج و بلوج" اور کہیں "قوفص و بعلوص" کر کے لکھا۔ اور ان تمام سے انہوں نے صرف "کوچ و بلوچ" مراد لیا اور "کوچ" کو الگ قبیلہ بتایا اور "بلوچ" کو الگ قبیلہ بتایا۔ جو ان کی غلط فہمی تھی یا انہیں ایسا ہی بتایا گیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے تاریخی مقامات، تاریخی قبائل اور تاریخی واقعات اور ان سے متعلق جغرافیائی حدود کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی اپنی تحقیق اور چشم دید معلوم نہیں ہوتے۔ اور ان میں بے اندازہ غلطیاں اور قیاسیات نظر آتے ہیں۔ "کوچ و بلوچ" کے اس دور کے استعمال سے انہوں نے محض قیاس کیا کہ یہ نام فارسی میں بولا جا رہا ہے اور فارسی میں "و" "اور" کے معنی دیتا ہے اس لئے یہ ضرور دو قبیلے کوچ اور بلوچ ہوں گے اس لئے انہوں نے کوچ سے متعلق سُنے سنائے واقعات و معلومات کو دو قبیلوں میں تقسیم کر کے بیان کیا۔ کچھ کوچ سے منسوب کئے اور کچھ بلوچ سے منسوب کئے جو حقائق سے بعید معلوم ہوتے ہیں۔ درحقیقت "کوچ و بلوچ" کا استعمال فارسی میں نہیں بلوچی میں ہوا ہے۔ بلوچی میں "و" فارسی کے "زیر" (ِ) کا

بدل ہے جو "اور" کے نہیں "کا، کے، کی" کے معنی دیتا ہے۔ اس طرح "کوچ و بلوچ" کا مطلب "کوچ بلوچ" ہے یا بلوچ کا کوچ قبیلہ۔ مذکورہ خطے میں بیسیوں بلوچ قبائل آباد ہوتے تھے اور اب بھی ہیں۔ لیکن جن سے ایرانی ظالم حکمرانوں کو زیادہ تکلیف پہنچتی رہی تھی اور ان سے مسلسل برسرپیکار رہتے تھے وہ کوچ بلوچ تھے۔ اس بنا پر کوچ کی شہرت زیادہ تھی اور عرب مصنفین کی توجہ کے مرکز بنتے تھے۔ اور انہوں نے ایرانیوں ہی کی سُنی سنائی باتوں اور پروپیگنڈوں کو موضوع بنایا۔ بلوچوں سے یا تو ان کی رسائی نہیں تھی یا انہوں نے خود ہی بلوچوں کے پاس جانے سے احتراز کیا۔ یا لٹیروں کے ڈر کے مارے رابطہ نہ رکھا۔ ورنہ وہ کبھی ایک کوچ قبیلہ کو "کوچ اور بلوچ" کا دو نام نہ دیتے اور بے بنیاد باتیں نہ لکھتے۔ یاد رہے کہ "کوچ" نامی قبیلہ آج بھی بلوچوں میں موجود ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ اسی بلوچ خطے میں جسے کبھی وہ "کوہستان کوچ" لکھتے ہیں اور کہیں اسی حدود میں "ملک بلوچ" کا تذکرہ کرتے ہیں، ایک اور قدیم اور اہم قبیلہ بھی بڑی تعداد میں موجود تھا جو "کوپچ" کہلاتا تھا۔

عرب مصنفین کے "قفص" اور "قوفص" سے یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ "کوچ بلوچ" کی بات کررہے ہیں یا "کوپچ بلوچ" کی۔ کیونکہ خود انہوں نے دونوں اصطلاحوں سے ایک ہی قبیلہ "کوچ بلوچ" مراد لیا ہے۔ قیاس یہی ہے کہ انہیں بتانے والوں نے کوچ اور قوفص (کوپچ) دونوں کا بتایا ہے لیکن اُن کے

موٹے دماغ نے دونوں کو ایک ہی "کوچ" سمجھا اور دوسرے کو اسی میں خلط ملط کیا۔ حالانکہ کوپچ (معرب قوفص) سینکڑوں برس پرانا قبیلہ تھا جو نہ صرف کرمان و مکران کے بیچ میں پھیلا ہوا تھا۔ بلکہ ساحلی علاقے میں بھی بود و باش رکھتا تھا۔ سکندر اعظم کے سفرناموں میں اُس زمانے میں موجودہ "پیشکان" (ضلع گوادر) اِسی قبیلہ کے نام پر ہوتا تھا جسکی ایرئین اور دوسرے سکندر نامہ نویسوں کی نگارشات میں نشاندہی کی گئی ہے اور جسے یورپی محققین ہولڈچ اور میجر۔ ای۔ موکلر نے بھی اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے(1) اس نام سے ثابت ہوتا ہے کہ پیشکان اِسی "کوپچ" قبیلہ کا مسکن تھا۔

ایرینن کا لکھا نام بھی "قوفص" ہے جسے انگریزی میں (KOPHAS) لکھا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے قدیم نام "قوفص" ہو اور بعد کے بلوچ لوگ اُسے "کوپچ" تلفظ کرچکے ہوں۔ بہرحال عربوں نے اِس قبیلہ کی جستجو نہیں کی اور اسے کوچ کے ساتھ گڈمڈ کیا۔ ہزاروں سال بعد بھی مذکورہ قبیلہ بلوچوں میں موجود ہے یہ واحد صورت میں بعض مقامات پر موجود تھے اور توسیعی شکل "کوپچانی" یا "کپچانی" بھی مشرقی بلوچستان کے بلوچ قبائل میں موجود ہے۔ واضح ہو کہ توسیعی شکل میں متعلقہ قبیلہ کا ایک شخص "آنی" کا رُکن کہلاتا ہے۔ "کپچانی" کے معنی "ایک کوپچ شخص" "رئیسانی" کا مطلب "رئیس کا ایک رکن" وغیرہ وغیرہ۔

1۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز: مکران گزیٹرز، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997، صفحہ 681۔

قلندرانی

قلندرانی قبیلہ کا مرکزی مقام ''تو تک''، ضلع خضدار ہے۔ جھلاوان گزیٹر نے قلندرانی قبیلہ کے جد ''قلندر'' کو میروانی قبیلہ کے ''میرو براہو'' کا بھائی لکھا ہے(1) جو غلط ہے۔ وہ میرو کے بیٹے میر عمر براہو کا بھائی تھا جو نغاڑ سوراب میں جدگالوں کے حملے میں ''میر عمر براہو'' کے ساتھ مارا گیا۔ ''براہو جدگال جنگ کی رزمیہ نظم'' میں بھی اُسے میر عمر کا بھائی اور ''ہالہ'' کا باپ کہا گیا ہے۔ ہالہ اور ٹوہو دونوں بھائی تھے۔ جنہیں اختتام جنگ میں خاران، گرگٹ اور تو تک کے جدگال مقبوضات میں سے حصہ دیا گیا۔ ''ہالہ'' کا گھرانہ اور قریبی لوگ ''ہالہ'' زئی کہلاتے ہیں۔ ٹوہو کے نام سے کوئی قبیلہ تشکیل نہیں پایا کیونکہ اُس کا الگ سے کوئی لشکر نہیں تھا۔ گزیٹر نے ''ٹوہو'' کو ''رودینی'' کے جدامجد ''رودین'' کا عرفی نام لکھا ہے جو غلط ہے۔ جو مقبوضات ''ٹوہو'' کو دیئے گئے وہاں کوئی رودینی نہیں۔ ٹوہو کا قبیلائی شمار اُس کے بھائی ہالہ کے نام سے تشکیل شدہ قبیلہ ہالہ زئی میں ہوتا ہے۔ ٹوہو اور ہالہ دونوں کے مقبرے خاران کے شمشان میں ہیں اور ہالہ زئی بھی خاران اور پنجگور میں رہتے ہیں۔

1۔ ایضاً۔ موضوع ''قلندرانی''۔

کتاب ''بلوچستان'' نامی کے اخبار نویس مصنّف کے مفروضے

مذکورہ کتاب ایک پشتو ہفت روزہ ''میواد'' کے مالک و مدیر جناب سلطان محمد صابر کی ایک سطحی اور غیر تحقیقی کتاب ہے جس کے تقریباً تمام مواد مختلف مصنفین کی کتابوں کے چربے ہیں۔ اس کتاب کی تمہید میں مؤلف نے شوقِ پشتونیت میں کئی بلوچ قبائل کو ''افغان نژاد'' لکھ کر غالباً ذہنی سکون حاصل کیا ہے۔ تمہید کے شروع میں وہ اِس بات پر زور دیتے ہیں کہ پشتون، پٹھان اور افغان ایک ہی قبیلہ کے نام ہیں(1) پھر وہ لکھتے ہیں:۔

> '' پشتونوں اور بلوچوں میں تاریخی اور لسانی ہم آہنگی اور یگانگت کے علاوہ نسلی اور ثقافتی قرابت بھی ہے مثلاً مینگل، زرک زئی، ساسکزئی، باروزئی، رئیسانی، سرپرہ اور بنگلزئی نسلاً افغان ہیں اور خان

آف قلات میر احمد یار خان کا تعلق بھی افغانوں کے
احمدزئی قبیلے سے تھا جو کہ افغانوں کے مشہور قبیلے غلجی
(غلزئی غلط ہے) سے تھا۔"(2)

مؤلف کتاب اِن چار سطور کو "بلوچوں اور پشتونوں کی ملّی وحدت کے بارے میں چند تاریخی حقائق کا نام دیتے ہیں (3) جبکہ مذکورہ سطور میں صرف "باروزئی" کا پشتون یا افغان ہونا واحد تاریخی حقیقت ہے باقی سب بلوچ تاریخ کو مسخ کرنے کی "بھونڈی کوشش" ہے۔ انہیں ان ناموں کی ترکیب میں موجود گل، سرپرہ، ہنگل، زرّک اور سہک کے خالص بلوچی الفاظ بھی نظر نہیں آتے جو ان کے مفروضے یا "بھونڈی کوشش" کے رد کرنے کیلئے کافی ہیں۔

مذکورہ قبائل کے بارے میں ملکی اور غیر ملکی محققین و مصنفین نے بہت کچھ لکھا ہے جو بیسوں کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ سب کچھ موصوف کی نظروں سے بھی گذر چکا ہے جنہیں وہ یکسر قلمبند کر کے اپنے شوق پشتونیت کے نیچے دبا دیتے ہیں۔ ویسے بھی ایسے جاہلانہ تحریروں سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ تاریخی عمل اور خانہ بدوشانہ زندگی اور قبائلی چپقلشوں کے نتیجے میں کئی قبائلی گروہ اپنی مرکزیت سے کٹ کر غیر قبیلہ کے حصّے بن کر اپنی زبان اور کلچر کھو دیتے ہیں اور پھر ان کا مستقبل، ان کی خوشیاں اور غم اجنبی قوم سے بندھ جاتے ہیں۔ جو ہزار یاددہانیوں اور قلمی جتنوں سے اپنی کھوئی ہوئی مرکزیت کی طرف مراجعت نہیں کرسکتے۔ کئی بلوچ قبیلے اور قبیلاتی گروہ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر

پٹھان، سندھی، پنجابی، کشمیری بن چکے ہیں۔ جواب اپنے اختیار کردہ کلچر اور زبان سے واپس نہیں لوٹ سکتے یہ عمل صدیوں سے جاری ہے۔ کوئی قوم یا قبیلہ روئے زمین پر واحد خالص یک نسلی نہیں ملیگی۔ موجودہ پٹھانوں میں موجود چار سو سال قبل کا کرد بلوچ قبیلہ "کاسئی" بلوچوں سے رشتہ ناطہ کرنے کے باوجود آج سو فیصد پٹھان ہے۔ اسی طرح سپین ترین اور ریسانی کے چند گھرانے جو ضلع زیارت میں رہتے ہیں آج پٹھانوں ہی کے اٹوٹ حصّے بن چکے ہیں انہیں بلوچ مفادات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ انہیں تاریخی طور پر بلوچ ہونے کی یاددہانی کرانا اس لئے بھی بے فائدہ ہے کہ وہ اپنی اصل و نسل کو خود بھی سمجھتے اور جانتے ہیں۔ صابر صاحب کو بھی یہ نقطہ سمجھنا چاہیے۔ مذکورہ بلوچ قبیلوں کو پشتون یا افغان لکھنا ہماری نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا لیکن تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کو روکنا اور تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنے کیلئے ہم مذکورہ قبیلوں کی اصلیت اور تاریخی تشکیل کو واضح کریں گے:

الف۔ مینگل

اس موضوع پر تفصیلی روشنی پچھلے صفحات میں ڈالی جاچکی ہے۔ وہاں سے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ب۔ زرّک زئی

زرّکزئی پر پچھلے صفحات میں بحث ہوچکی ہے۔ "زرکزئی" موضوع کی ذیل میں ملاحظہ کیجئے۔

ج۔ سہنک زئی

کتاب کے مصنّف نے اس نام کو ''ساتک'' لکھا ہے جو غلط ہے۔ یہ لفظ سہنک ہے۔ ''سہنک'' اوّل بولان کے کرد قبیلے کا ایک سردار تھا۔ جس کا اپنے چچازاد بھائی مزاری کُرد کے ساتھ سرداری پر تنازعہ تھا۔ اور ایک لڑائی کے بعد سہنک کے خاندان کو طاقتور مزاری نے علاقہ بدر کر دیا جو ہندو باغ کے موضع کشرہ میں اپنے ایک دوست کے پاس چلے گئے۔ اور وہیں رہ بس گئے۔ دو پشتوں کے بعد قبائلی معتبرین نے فریقین میں مصالحت کرادی تھی۔ اسی مصالحت کے نتیجے میں سہنک کا گھرانہ واپس آیا اور اپنے پرانے دوست کے خانوادے کے گھرانے کو بھی ساتھ لے آیا اور اُس گھرانے کو اپنا ہمسایہ بنایا اور اس کے ساتھ رشتہ داری کی۔ اس گھرانے کے دو سربراہ سلطان اور رحمت نامی تھے۔ جبکہ سہنک کرد کا گھرانہ ادریس کُرد کی سربراہی میں تھا۔ جو پھر اپنے قبیلہ کرد کے ساتھ خوشی خوشی مل جل کر رہنے لگا۔ مندرجہ بالا کہانی سہنک زئی سردار گھر کی ہے۔ موجودہ وقت میں سہنک زئی ایک الگ قبیلے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے لیکن اُس کی اصل اور نسل پٹھان نہیں بلوچ کرد ہے۔

د۔ رئیسانی

رئیسانی پر بھی پچھلے صفحات میں بحث گذر چکی ہے۔ موضوع ''بلوچ تاریخ پر مفروضہ ترکی اور افغانی چھاپ'' کی ذیل میں ملاحظہ کیجئے۔

ر۔ سَرپَڑہ

مصنّف کتاب کے سطحی دعوے کی تردید کیلئے قبیلہ کا بلوچی نام از خود کافی ہے تاہم اِس کی تاریخی وضاحت بھی کی جاتی ہے جس طرح ہر شخص اپنے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں دوسروں سے زیادہ جانتا ہے اسی طرح ہر قبیلہ اپنے بارے میں غیروں سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ سرپرہ قبیلہ کی روایتوں کے مطابق ان کا قبیلہ سراوان کا قدیم ترین قبیلہ ہے اور وہ ڈیڑھ ہزار سالوں سے زیادہ اِس وادی میں رہ رہے ہیں۔

قدیم تواریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم حکمرانوں کے طاقتور لشکروں میں اِس کا شمار ہوتا تھا۔ اور یہ ایک بلوچ فوجی گروہ تھا۔ اس کا شمار مستونگ اور شال (کوئٹہ) کے تاریخی حکمران لونگ خان بلوچ کے خصوصی سکواڈ میں بھی ہوتا تھا۔ اور یہ سرحدی محافظ بھی ہوتے تھے۔ اس گروہ یا فوجی لشکر کی ایک فوجی شناخت ہوتی تھی۔ یہ مشترکہ شناخت مُرغے کا ایک پَر (بلوچی میں پڑہ) ہوتا تھا جو ہر سپاہی کے دستار کے اوپر لگا ہوتا تھا۔ چونکہ یہ پڑہ سر پر ٹوپی یا پگڑی پر لگایا جاتا تھا اس لئے ان کو سرپڑہ کہا جاتا تھا۔

نام سرپڑہ ایک قدیم تاریخی نام ہے جسے بعض مورخین نے سراپرویے لکھا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ غلط سُننے کی وجہ سے یا کسی دوسری زبان میں صحیح ادا نہ کرنیکی وجہ سے قدرے تبدیل شدہ ہے۔ شاہنامہ فردوسی میں بیان کردہ ایک تُورانی پہلوان کمک کوہزاد اور سیستانی پہلوان رُستم کے درمیان لڑائی کے واقعات کے سلسلے میں دشت

خرگہ (وادی مستونگ) سے تشکیل شدہ بلوچ فوج کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جو اس حد تک مسلح تھے کہ ان کی ایک انگلی بھی ننگی نظر نہیں آتی تھی اور وہ اس حد تک بہادر تھے کہ ان کا ایک جوان ایک لشکر کا مدِ مقابل ہوتا تھا۔ اس بلوچ لشکر کا ہر سپاہی آزمودہ کار جنگجو ہوتا تھا۔ سرپرّہ قبیلہ کی تاریخی روایات اور علاقے میں ان کی قدامت کے پیش نظر یہ بلا شک وشبہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ انہی بلوچ جنگجوؤں کی نسل سے ہے جو شاہنامہ فردوسی کے مطابق ایرانی پیشدادی حکمران منوچہر بن ایرج بن افریدون (7-556ق م) کے زمانے میں موجودہ لکّ پاس کے دونوں طرف آباد تھے۔

موجودہ وقت میں قبیلہ شمسدَ زئی، مُرازئی، آدم زئی، سومارزئی، جارزئی، رودین زئی، نوتک زئی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ انگریزی گزیٹئر میں رودین زئی اور جاڑزئی کو افغان کہا گیا ہے۔ جبکہ مذکورہ دونوں نام افغان نام ہونے کی تکذیب کرتے ہیں۔ سرپرّہ خود جاڑزئی کو جدگال طائفہ اور رودین زئی کو افغانستان سے آنے والا ہمسایہ طائفہ بتاتا ہے۔ واضح ہو کہ افغانستان سے ہر آنے والا پختون یا پٹھان نہیں ہوتا وہ پٹھان، ازبک، تاجک، ہزارہ، تُرک اور بلوچ بھی ہوسکتا ہے۔ افغان لفظ "افغانستان کے شہری" کے لئے مستعمل ہوتا ہے کسی خاص قومیت کیلئے نہیں۔

ز۔ احمدزئی

احمدزئی خوانینِ قلات کا افغانوں کے غلجی قبیلہ سے نسلی تعلق تو دُور کی بات ہے کسی قسم کا علاقائی، معاشی، سیاسی یا کاروباری تعلق بھی نہیں رہا ہے۔ اس خطے میں بشمول افغانستان کے بیسویں احمدزئی طائفے ہوں گے تو کیا سارے احمدزئی غلجی نسل سے ہو گئے۔ قبائلی نظام میں کسی بھی گھرانے کا سربراہ جدّ احمد خان نامی ہو گیا تو اس کے اعزا احمدزئی بن جاتے ہیں۔ ایسے جاہلانہ دلیلوں سے تاریخ سازی نہیں کی جاسکتی۔ تاریخ کوئی اخباری خبر نہیں ہے کہ جسے سطحی لیا جائے اس کیلئے تو تحقیق کی بھول بھلیوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ مصنّف مذکور کو تو غلجی کی اصلیت کا بھی علم نہیں ہے جسے وہ جذباتی طور پر افغان لکھتا ہے جبکہ حقیقتاً یہ ایک تُرک قبیلہ ہے جس نے افغانوں کے خلاف جنگیں بھی لڑی ہے یہ قبیلہ غلجی سے زیادہ اپنے کو غلزئی کہتا ہے۔ جن کا نسلی تعلق غور کے ترکوں سے تھا۔ جبکہ احمدزئی خوانینِ قلات پنجگور کا رئیس النسل طائفہ ہے جو حاکم پنجگور میر کمبر رئیس کے خانوادے سے ہے۔ احمدزئی طائفہ کا جدِّ امجد میر احمد خان تھا جس کا طائفہ ایلطازئی تھا جس نے اپنے خاندانی لشکر کے ساتھ جدگالوں کے خلاف لڑائی میں میروانی قبیلے کا ساتھ دیا۔ اسی لڑائی کے نتیجے میں اُس کے نام سے نیا طائفہ احمدزئی تشکیل پایا۔ وہ خود 1666ء میں خوانین قلات کے دوسرے دور کے پہلے خان کے طور پر برسرِ اقتدار آئے۔ اس احمدزئی کی نہ تاریخ قدیم ہے اور نہ گم ہے اور نہ اُس کی نسل اور نسب اور علاقہ کا افغان اور افغانستان سے کوئی تعلق ہے۔ ایسی بے سروپا اور لاحاصل سطحی تحریریں تنگ نظر اور پسماندہ چھوٹے ذہنوں کی بڑی گستاخیاں ہوتی ہیں جو تاریخ کو پراگندہ نہیں کرسکتیں۔

حواشی:

1۔ پشتون یا پختون اور افغان کے بارے میں کتاب کے مصنّف کا بیان ایک غیر تاریخی بات ہے جسے ہم ایک نقطہ نظر تو کہہ سکتے ہیں تاریخی حقیقت نہیں کہہ سکتے۔ تاریخی لحاظ سے افغان ایک الگ قوم ہے جسکی زبان ہزاروں سالوں سے فارسی رہی ہے۔ محققین نے اسے بنی اسرائیل کہا ہے جن کی قومی عادات اور خصلتیں یہودیوں کے مماثل ہیں۔ ابوالقاسم فردوسی کے شاہنامے میں انہیں ''اپگان'' اور ''اوگان'' لکھا گیا ہے۔ ترک اور بلوچ صدیوں سے انہیں اوگان اور اپگان کہتے آرہے ہیں۔ یہ لوگ کوئٹہ کے دشت میں بلوچوں کے ساتھ ساتھ آباد تھے جبکہ اس دور میں وہاں کسی پختون یا پشتون کا نام سنا نہیں گیا تھا اور نہ کسی تاریخی کتاب میں پشتون کا لفظ ملتا ہے۔ افغانوں نے پکتیا سے آنے والے پختونوں سے پشتو زبان اختیار کیا لیکن اِس کے باوجود وہ پشتون یا پختون نہیں کہلاتے تھے۔ پشتونستان کی افغانستان مہم جوئی میں انہیں سیاسی پشتون بنایا گیا لیکن آج بھی افغانستان میں افغان، افغان ہیں اور پشتون پشتون یا پختون ہیں۔

جہاں تک پختونوں کا تعلق ہے تاریخی لحاظ سے یہ لوگ ''پکت'' کے خطے کے قدیم آریائی باشندے تھے۔ پکت سے باہر کے لوگ اور افغان لوگ انہیں ''پکت'' کی نسبت سے پکتو کہتے تھے جسے فارسی زبان نے ''پختو'' میں بدل دیا ہے۔ جس کے معنی ''پکت یا پخت'' کے رہنے والے۔ پختو زبان کے بھی یہی معنی ہیں یعنی پخت کے لوگوں کی زبان۔ پختو بطور واحد بولا جاتا ہے جبکہ اس کی جمع ''پختون'' ہے۔

قندھار اور آس پاس کے لوگ ''خ'' کی جگہ ''ش'' سے اسکی ادائیگی کرتے ہیں۔

نیز دیکھئے اشاریہ نمبر3۔

2۔ کتاب ''بلوچستان'' مطبوعہ میواد پبلی کیشنز، اسلام آباد، سال2005ء، صفحہ نمبر11۔

3۔ مصنّف کتاب نے اِسی عنوان کے تحت روزنامہ آساپ کوئٹہ (جسے تنگ نظر سرکار نے بلوچ دشمنی میں بند کروایا) کے شمارہ 7فروری2006ء میں ایک مضمون چھپوایا جس میں کئی سطحی اور غیر تاریخی باتیں کی گئی تھیں۔ جن کی وضاحت تاریخی صداقتوں کی روشنی میں علمی حوالہ سے کرتے ہوئے ایک تفصیلی مضمون اِسی اخبار میں شائع کرایا گیا جو ہماری کتاب ''بلوچ اور بلوچستان... چند تاریخی گوشے'' مطبوعہ بلوچی اکیڈمی سال2008ء میں شامل ہے۔ وہاں سے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

کمبرانی

کمبرانی بلوچوں کا ایک منتشر اور پھیلا ہوا قبیلہ ہے جس کے افراد قلات، کوئٹہ، خاران، خضدار، زہری، مشکئے اور پنجگور میں آباد ہیں۔ قبیلہ میں دیگر قبائل کی طرح مختلف علاقوں اور قبیلوں سے آئے ہوئے گروہ شامل ہیں جو اس کے طائفے بن چکے ہیں۔ کمبرانی قبیلہ کی تشکیل کے ابتدائی دور میں اس کا مرکزہ دو طائفوں سوبازئی اور ایلتازئی پر مشتمل ہوتا تھا۔ ابتداء میں اس کی سرداری ایلتازئیوں کے ہاتھ میں تھی جو بعد میں سوبازئیوں کو منتقل ہوئی۔

کمبرانی بنیادی طور پر کون تھے اور ان کی اصلیت کیا اور کہاں کی تھی۔ اس پر مصنفین نے مفروضے گڑھے اور اس کی مختلف وضاحتیں کیں۔ گزیٹئر کے مرتب کنندگان نے لکھا :

" کمبرانی کی اصل کا پتہ نہیں۔ ایک روایت کے مطابق وہ امام زُمبر جس کا نام کمبر تھا، ان کی اولاد سے ہیں۔ میسن انہیں میروانیوں میں شامل بتاتا ہے

جب کہ میٹلینڈ کے مطابق اُن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک دوسری روایت کے مطابق وہ حضرت علی کے ایک غلام کمبر کی اولاد ہیں اور حبشی نسل سے ہیں"۔(1)

گزیٹئر کے مصنفین کی "امام زُمبر" والی روایت کا کہیں وجود نہیں ہے۔ یہ ان کی اپنی گھڑی ہوئی بات ہے۔ بلوچستان میں بمشکل کوئی شخص امام زُمبر کے نام سے واقف ہو۔ دوسری بات یہ کہ جب وہ امام زُمبر تھا تو پھر اس کا نام کمبر کیسے ہوا۔ ایک اور بات یہ ہے کہ بلوچ قبائلی نظام میں لاحقہ "آنی" کے ساتھ قبیلہ اولاد اور واحد نسلی وحدت کو ظاہر نہیں کرتا۔ "آنی" اِس بات کا اظہار ہے کہ قبیلہ ایک وسیع کنفیڈریشن ہے جس میں مختلف ذاتیں اور نسلیں شامل ہیں۔ لیکن یہ بلوچ قبیلائی اصول انگریزوں اور دیگر یورپیوں کی سمجھ میں نہیں آسکا ہے۔

مسٹر میسن کا خیال بھی غلط ہے۔ میروانی اور کمبرانی قبیلائی لحاظ سے الگ ہیں اگرچہ نسلاً اور بنیادی طور پر ایک ماخذ سے ہیں(2) مذکورہ بالا مصنفین نے دوسری روایت بیان کرکے کمبرانیوں کے حبشی نسل کا خیال پیش کیا لیکن یہ مشاہدہ کرنے میں ناکام رہے کہ بلوچستان میں ہزاروں سالوں سے حبشی نسل موجود ہے اور آج تک اپنے ہم عصر دیگر خانوادوں سے خلط ملط نہ ہوئے کہ ان کی پہچان نہ ہوسکے یا کم از کم ان کی جھلک کسی قبیلے میں نظر آسکے۔ کمبرانیوں کی شکل وصورت اور جسمانی

ساخت اور دیگر خصائل کو دیکھ کر کوئی بیوقوف سے بیوقوف شخص بھی انھیں حبشی سمجھنے کی غلطی نہیں کرے گا۔

ایک اور جگہ یہی مصنفین کمبرانیوں کو کم اصل اور لوڑیوں کا ہمسر بتاتا ہے لیکن سردار گھرانے کو جو درحقیقت قبیلہ کا مرکزہ ہوتا ہے، اس کم اصلیت سے مبّرا بتاتا ہے اور دیگر شاخوں کو خان کی رعیت لکھتا ہے(3)۔

ایک اور انگریز محقق ہنری پانٹجر اپنی کتاب ''سفرنامہ سندھ و بلوچستان'' میں کمبر کے معنی ''حبشی'' بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ کمبرانی اسی سے ہیں(4) حالانکہ بلوچی میں کمبر کے معنی ''سانولا رنگ، سانولا دھاریدار یعنی چتکبرا اور ناقابل شکست کے ہیں، حبشی تو تلک ''حبش''(افریقہ) کی نسبت سے ہے۔

دوسرے انگریز محقق ہیوز بلر نے خان خداداد کے حوالے سے کمبرانی کو حلب سے آنے والا بتا کر اس کے جدامجد کمبر کا تعلق حلب سے جوڑ لیا(5) یہ بھی ایک بنی بنائی بات معلوم ہوتی ہے کیوں کہ یہ ناقابل یقین ہے کہ خان خداداد کو کمبر اور کمبرانی کے بارے میں علم نہ ہو جن کا وہ اور اُس کا خاندان حصّہ ہو۔

بلوچ قومی نظام اور قلات اور خوانین قلات کی تواریخ کے بارے میں تھوڑی سی معلومات رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ کمبر کون تھا اور کمبرانی قبیلہ کی تشکیل کیسے اور کن حالات میں ہوئی ہے۔بلوچ نظام قومداری کے بارے میں گذشتہ صفحات میں بحث گزر چکی ہے۔جس میں قبیلہ یا کسی شخصیت کے نام کے ساتھ ''آنی'' کے لاحقے

کے اپنانے پر بھی بات کی گئی ہے۔

جہاں تک مذکورہ قبیلہ کمبرانی کے جدّامجد ''کمبر'' کا تعلق ہے وہ نہ کوئی امام زُمبر تھا نہ وہ نسلاً حبشی تھا اور نہ کہ اُس کا تعلق کسی شام اور اُس کے حلب سے تھا۔وہ کولواہ(ضلع آواران) کا باشندہ تھا اور کُہدائی(KAHUDAEE) قبیلہ سے تھا، بڑا جنگجو اور دلیر شخص تھا۔اس کے باپ کا نام سلیمان تھا(6)۔ایک بلوچی نظم کے ایک حصّے میں اس کے متعلق کہا گیا ہے:۔

''زانیں ترا زیں کمبرئے
بل و بدرنگ آنی نرئے
چو ڈاچیء بہاد پاچ چرئے
ہفتاد ء ٹُہہ درچ ء برئے
ہشاڑی ء شیرنگ ئے
کُہدائی ء نام ات برنت
میروانی آں پایئے گھترنت''(7)

ترجمہ

جانتا ہوں کہ تم مرد جری کمبر ہو جو بل و بدرنگ (کولواہ) کا جیالا ہے اور جو ایک آزاد اونٹنی کی مانند ہر پابندی سے بے نیاز ہے۔تم نواسی درختوں کے ثمروں سے کشیدہ عرق شیریں ہو، قبیلہ کا کُہدائی ہو جو میروانیوں سے مرتبہ میں اعلیٰ ہے۔''

واضح ہو کہ کہدائی قبیلہ کی اصل پنجگور کا قدیم قبیلہ "رئیس بورسوار" ہے جو خوانین قلات کا بھی جدّی قبیلہ ہے۔ میر کمبر کہدائی، ایلتا زئی خوانین قلات سے رشتے ناطوں میں بھی منسلک تھا۔ جب سوراب کے براہو میروانیوں پر کچھی، کیرتھر اور بیلہ سے جدگالوں کے متحدہ لشکر نے شکر جام زئی (8) کی سرکردگی میں حملہ کیا اور براہو میروانیوں کا قتل عام کر کے میروانی قلعہ پر قابض ہو گئے اور میروانی سردار گھرانہ براہو، کا سردار میر عمر مارا گیا اور اس کا گھرانہ اپنے خواجہ سسرالیوں کے پاس پشین چلا گیا۔ جب میر عمر مقتول کا کمسن بیٹا میر بجار بھرپور جوانی کو پہنچ گیا تو اپنی ماں کے کہنے پر سوراب چلا آیا اور اپنی قوم اور برادری کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور باپ اور قبیلہ کا انتقام لینے کیلئے دیگر قبائل سے مسلح لشکروں کی مدد چاہی تو دیگر قبائل کے ساتھ ساتھ قلات کے ایلتا زئیوں نے بھی مسلح لشکروں سے مدد کی۔ ان لشکروں کے سرکردہ میر احمد ایلتا زئی (9)، میر شاہ بیگ ایلتا زئی اور میر کمبر کہدائی تھے۔ جو اپنے مشترکہ کمانڈر میر کمبر کہدائی کی کمان میں براہو میروانی کے جنگی اتحادی بنے جن کا سرکردہ مقتول میروانی سردار میر عمر براہو کا بیٹا میر بجار تھا۔ اختتام لڑائی میں اتحادی لشکروں کے سرکردگان کے نام سے نئے قبیلے تشکیل پا گئے۔ انہی نوتشکیل شدہ قبائل میں "کمبرانی" قبیلہ بھی تھا۔ میر کمبر کہدائی کی کمان کے تینوں لشکر اپنے کماندار کمبر کی نسبت سے "کمبرانی" کہلائے۔ چونکہ میر احمد ایلتا زئی اور میر شاہ بیگ ایلتا زئی بھی اسی کمبر کے ماتحت لڑے اسی لئے احمد زئی اور شاہ بیگ زئی بھی کمبرانی کہلاتے ہیں۔ یہ کمبرانی کا مرکزہ تھے جن کے گرد بعد میں دیگر طائفے آ مل کر اس قبیلہ کے حصے اور راج بنے۔

حواشی :

1۔ بلوچستان ڈسٹرکٹس گزیٹر جھلاوان ڈسٹرکٹ موضوع "کمبرانی"۔

2۔ یہ بنیاد اور ماخذ میں پنجگور کا تاریخی قبیلہ "رئیس" ہے۔ اور رئیس کے طائفہ "بور سوار" سے خوانین قلات کا گھرانہ ہے۔ جن کا جدّ امجد فاتح قلات میر کمبر رئیس تھا۔ مذکورہ موضوع پر "اخبار الابرار" (فارسی) کے مصنّف آخوند محمد صدیق نے ایک روایت نقل کیا ہے :

> " زرّک، دُرّک اور ذکریا تین بھائی تھے، زرّک سے احمد زئی اور کمبرانی، دُرّک سے نوحانی اور ذکریا سے ذگر مینگل وجود میں آئے" (اخبار الابرار کا اُردو ترجمہ بنام "تاریخ خوانین قلات" صفحہ 22)

مذکورہ روایت میں مبینہ شخصیتیں پنجگور کے قبیلہ رئیس کی شخصیتیں رہی ہیں ماسوا نام ذکریا کے۔ پنجگوری روایت میں نام صرف "ذگر" ہے ذکریا نہیں۔ یہی ذگر، ذگر قبیلہ کا جد امجد تھا۔ ذگر قبیلہ پنجگور کے گچک میں آباد تھا۔ وہاں ان کی قدیم آبادی کے آثار "ذگرانی کھور" کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ جب گچک سے اکثر ذگر سولہویں صدی میں نقل مکانی کر کے قلات کے دشت گوران میں آباد ہوئے تو وہاں پر مینگل رند پہلے سے آباد تھے۔ چونکہ یہ تھوڑے لوگ تھے اس لئے مینگل کے ہمسایے اور راج بنے اور آہستہ آہستہ مینگل کا نام ان پر بھی چسپان رہا۔ کمبرانی کا مرکزہ بھی رئیس

قبیلہ ہے۔

3۔ بلوچستان، تھرودی ایجز، حصہ دوئم صفحات 385، 415، 425 اور 914 ملاحظہ کریں۔

4۔ صفحہ 78۔

5۔ "فرنٹیئر اینڈ اوورسیز ایکسپیڈیشنز فرام انڈیا" صفحہ 20۔

6۔ موجودہ خان، میر سلیمان داؤد خان کا نام اسی سلیمان کے نام پر رکھا گیا ہے۔

7۔ کتاب "کمبران" صفحہ 98۔

8۔ جام زئی، کیرتھر سلسلہ کوہستان کا پندرھویں صدی عیسوی کا قبیلہ ہے جس کا ماخذ ایرانی بلوچستان کا قبیلہ "جام" ہے۔ جو کیچی دشت میں بھی بود وباش رکھتے ہیں۔ خضدار کے تحصیل مولہ کوہستان میں یہ مکران کے پسنی سے آکر آباد ہوئے تھے۔ اس سے منسلک لوگ "جام زئی" کہلائے

9۔ میر احمد ایلتازئی کا خانوادہ، جو براہو جدگال جنگ میں میر بجار براہو کا اتحادی تھا، کے نام سے قبیلہ احمدزئی تشکیل پاگیا۔ میر احمد ایلتازئی (خوانین قلات کے دوسرے دور کا پہلا خان بلوچ) احمدزئی قبیلہ کا جد بنا۔

کولواہ

کولواہ، قدیم ملک مکران کا ایک ضلع یا علاقہ ہوتا تھا۔ جو گندم، جو، جوار اور دالوں کی پیداوار کیلئے پورے مکران اور جہلاوان میں مشہور ہوتا تھا۔ اور غریب لوگ دور دور سے گندم کی کٹائی کی مزدوری کے لئے یہیں پر آتے تھے اور واپسی پر کم از کم اپنے آدھے سال کا راشن کما کر جاتے تھے۔ یہ رند بلوچوں کا ایک مرکزی علاقہ ہوتا تھا جہاں میر شہہک رند ولد سردار میر چاکر رند کا قلعہ اس کے موضع "آشال" میں واقع ہوتا تھا۔ رند قبائل کی شاعری اور روایتوں میں جہاں جہاں کیچ مکران کا نام آتا ہے وہ دراصل اسی کولواہ سے مراد ہوتا تھا۔ کیوں کہ یہ کیچ کی عملداری میں آتا تھا۔ ورنہ شہہک رند اور سردار چاکر خان کا خاص کیچ سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہے۔ یہ کولواہ ایک بڑا اور پھیلا ہوا علاقہ ہوتا تھا۔ ہتورام نے اپنے وقت میں اس کے حدود اس طرح لکھے ہیں:

"شمالاً علاقہ مشکے، غرباً علاقہ پنجگور، جنوباً
علاقہ کیچ، شرقاً ملک جھاؤ۔"(1)

موجودہ وقت میں اسے ضلع آواران بنادیا گیا ہے اور کولواہ کے قدیم تاریخی نام کو پس منظر میں گمنام کردیا گیا ہے۔ جو حاکموں کی تاریخ کی اہمیت سے ناواقفیت اور تاریخی ناموں سے بے رغبتی کا مظہر ہے۔

کولواہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں رائے ہتورام نے اپنی تاریخ میں یہ مفروضہ روایت کیا ہے:۔

" وجہ تسمیہ اس کی یہ ہے کہ جغدالی زبان میں
باد کو وا کہتے ہیں۔ اس میدان میں ہوا بہت چلتی
ہے۔اس واسطے کولواہ مشہور ہو گیا ہے۔"(2)

اس افلاطون نے باد کو "وا" تو بنا دیا لیکن "وا" سے پہلے "کول" کو بھول گیا۔ اور صرف "وا" سے کولواہ بنا دیا۔ اس سے پہلے ہم اظہار کر چکے ہیں کہ علاقائی یا مواضعات کے نام ایسے کھیل کھیل میں نہیں پڑتے۔ کولواہ کا نام ایک نہایت قدیم قبیلہ "کورواہ" کے نام پر ہے۔ اصل نام "کورواہ" ہے جسے بلوچ کولواہ ادا کرتے ہیں۔ یہ قبیلہ سندھ اور انڈیا میں آج بھی کثیر تعداد میں موجود ہے۔ انڈیا کی بعض تاریخی کتابوں میں اسے قدیم دراوڑوں سے کہا گیا ہے۔ یہ قبیلہ زیادہ تر زراعت سے وابستہ ہے اور بطور زرعی مزدور کے کھیتوں پر کام کرتے ہیں۔ موجودہ وقت میں سندھ میں یہ قبیلہ موجود ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں اس کے کئی گھرانے گوادر میں بھی ہوتے تھے۔ جن کا ذکر انگریزوں کی تحریروں میں موجود ہے۔ موجودہ وقت میں بھی اس کے چند لوگ گوادر ضلع اور لسبیلہ کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں اور دوسرے قبیلوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ اور اپنے اصل قبیلائی نام کا اظہار نہیں کرتے۔

کولواہ قبیلہ کے افراد زمینداروں، سرداروں اور حاکموں کے گھروں میں

گھریلو خدمات بھی سرانجام دیتے تھے اور بڑے بااعتبار ہوتے تھے۔ خاص خاندانوں کے خادم ہونے کی وجہ سے انہیں "خاص خیلی" کہا جاتا تھا۔ سندھ کے تالپور بلوچ اسی کولواہ اور لسبیلہ سے اپنے لئے کورواہ خدمت گار لیجاتے تھے جو پشت در پشت انہی خاندانوں میں خدمات سرانجام دیتے تھے۔ یہ خاص خیلی کورواہ بلوچستان و سندھ میں بود و باش کرتے ہیں۔

" کولواہ" اس قبیلہ نے کب اور کس زمانے میں بسائی کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہ موضع کئی زمانوں سے اس قدیم قبیلہ کا مسکن رہا ہے۔ کورواہ نام کے مواضع ضلع خضدار اور لسبیلہ میں بھی موجود ہیں۔ جو اس قبیلہ کی رہائشی یادگاریں ہیں جو ہندوستان سے ہی آیا ہوا قبیلہ ہے۔ ہتورام نے جغدالی زبان کا حوالہ جو وجہ تسمیہ کی سلسلے میں دیا ہے وہ ایک مفروضہ اور غیر حقیقی بات ہے مذکورہ زبان اس علاقے سے کبھی بھی مستقلاً متعلق نہیں رہا ہے۔(3)

حواشی:

1۔ تاریخ بلوچستان از رائے ہتورام، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 2009ء صفحہ 320۔

2۔ ایضاً

3۔ یاد رہے کہ "کولواہ" یا "کورواہ" کا تمام علاقہ ماضی میں "سرمکران" کہلاتا تھا۔ یعنی جہاں سے مکران شروع ہوتا تھا۔

کوہِ نور ہیرا

کوہِ نور نامی ہیرا یقیناً گذشتہ پانچ صدیوں کا مشہور ترین ہیرا رہا ہے جو بیسویں بادشاہوں اور حکمرانوں کے دلوں پر راج کرتا رہا ہے۔ اور انہوں نے اس کے حصول کیلئے کئی خونیں معرکے کئے ہیں۔ اس ہیرے کو ابتداء میں ایک مسلمہ خزانہ سمجھنے کے علاوہ کامرانی و بلند بختی کی علامت سمجھا اور مانا گیا ہے۔ متعدد شاہی اور دیگر قیمتی سروں کو کھانے کے بعد جب یہ انمول ہیرا انگلستان کے ملکہ معظمہ کے محل پہنچا تو یہ ایک ''منحوس ہیرا'' مشہور ہو چکا تھا۔ پہلے ملکہ نے اس ہیرے کو ترشوا کر بہت خوبصورت بنوایا تا کہ اسے اپنے بیٹے اور تخت کے وارث شاہ ایڈورڈ ہفتم کو سوغات کرے لیکن پھر اس کی نحوست کا خیال کر کے اُسے نہ دیا بلکہ مرتے وقت اپنی بہو یعنی ایڈورڈ کی ملکہ کو دیا (ساس بہو کا بغض)۔ بعد میں ہیرے کی مالکہ یعنی بہو، چارج پنجم کی ملکہ ہوئی۔

ہیرا کامرانی کی علامت تھا یا منحوس، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ ہمیں محض اس کے نام یعنی ''کوہِ نور'' سے اخذ کئے ہوئے معنی اور اس کے بنیادی اور تاریخی مالک کے بارے میں تحریرات سے اختلاف ہے۔ جن کی وضاحت تاریخ کا

ریکارڈ درست رکھنے کیلئے ضروری ہے۔

اکثر تحریروں میں کہا گیا ہے کہ اس ہیرے کو اس کے بڑے سائز کی بنا پر ''کوہِ نور'' کہا گیا ہے یعنی ''روشنی کا پہاڑ'' اس مفہوم میں یہ ''شک'' اور ''ابہام'' صاف نظر آتا ہے کہ کسی بھی قیمتی پتھر کے ایک ریزے کے کیلئے ''پہاڑ'' کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔ تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ اس ٹکڑے کیلئے کیوں لفظ ''کوہ'' استعمال کیا گیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اگر اس ہیرے کی تاریخ کا کھوج لگایا جاتا تو نہ صرف یہ کہ اس ''کوہ'' کے معنی مل جاتے بلکہ اس کے اصل مقام اور حقیقی مالکوں کا بھی پتہ چل جاتا۔ جن جن جواہراتی کاریگروں نے مختلف اوقات میں اس کی تراش خراش اور اسے جاذب نظر بنانے میں کام کیا ان کا کہنا ہے کہ اس ہیرے کی شہرت کی وجہ اس کا بڑا ہونا نہیں بلکہ یہ شہرت اسے بادشاہوں کی ملکیت میں آنا اور اس پر ہونے والی معرکہ آرائیاں ہیں۔ وگرنہ اس سے کئی گنا بڑے اور اس سے زیادہ قیمتی ہیرے دنیا میں موجود رہے ہیں۔

" کوہِ نور'' ہیرے کے نام اور اس کے حقیقی وطن کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا نام ''بلوچی زبان'' میں ہے جس پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس پر لکھنے والوں نے اس کی وجہ تسمیہ پر تحقیق نہیں کی ہے اور خلاف عقل اس کو روشنی کا پہاڑ سمجھا ہے۔ لیکن سچائی یہی ہے جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ بلوچی زبان میں ''کوہ'' پتھر کو کہتے ہیں اور ''نور'' کا لفظ وہی ہے جو عربی، فارسی، ہندی، بلوچی، اُردو وغیرہ زبانوں میں ایک

ہی معنوں میں مستعمل ہے۔اس طرح ''کوہ نور'' کے معنی روشنی والا پتھر یا روشن پتھر۔
اب یہ ''کوہ نور'' اپنے اصل مالک کا اپنی زبان سے آپ کہہ رہا ہے۔کہ اس کے
بنیادی وارث اُس کے نام رکھنے والے ہیں۔اس سلسلے میں اگر ہم یہ بھی بتائیں کہ اس
کے بنیادی مالک اور وارث خاران کے نوشیروانی بلوچ ہیں تو آپ کو حیرت کا اظہار
نہیں کرنا چاہیے۔اور اس روایت کو پڑھ کر اپنے طور پر اسکی تحقیق کریں تا کہ آپ بھی
ہماری سچائی کے گواہ بن سکیں :

" خاران کے ایک سابق ایم پی اے اور سابقہ
نیپ کے لیڈر میر شیر علی خان نوشیروانی اور پنجگور کے
ایک سابق بیوروکریٹ میر قادر بخش نوشیروانی کا کہنا
ہے کہ یہ ہیرا کئی زمانوں سے نوشیروانی خاندان کی
ملکیت میں رہی ہے جو خاران کے ایک سابق حکمران
امیر عباس اوّل کے گنبد کی چھت کے نیچے سنٹر میں
کئی زمانوں سے فکس کیا ہوا تھا جس سے گنبد کا
اندرون روشنی کی جھلملاتی شعاعوں سے سارا دن منوّر
ہوتا تھا۔ علاقے کے لوگ کئی زمانوں سے اسے
دیکھتے آرہے تھے لیکن یہ روایت رہی ہے کہ بلوچ
کبھی بھی کسی علاقے میں مسجدوں، گنبدوں اور
قبرستانوں میں موجود کسی بھی نادر شئے کو ہاتھ نہیں

لگاتے تھے اگرچہ انہیں اس کی قیمتی اور نایاب چیز
ہونے کا علم بھی ہوتا تھا۔ ایسی چیزوں کی چوری
چکاری جہاں بھی بعد کے زمانوں میں شروع ہوئی وہ
افغانوں نے کی۔ جو مزدوری یا تجارت کرنے بلوچ
علاقوں میں آنے لگے تھے۔(1) ایک روز امیر
عباس کے نوخیز نواسے ملک دوستین باہر سے ہانپتے
کانپتے گھر آیا اور اپنی ماں کو خبر دی کہ دو نیزہ دار
اشخاص دادا کے گنبد سے نکل کر ایک گھوڑے پر سوار
ہو کر گنبد سے جنوب کی طرف چلے گئے۔ میں نے گنبد
میں جا کر دیکھا تو چھت والا کوہ نور اپنی جگہ پر موجود
نہیں تھا۔
کوئی سال بعد نوشیروانیوں کو معلوم ہوا کہ ہیرے کو
ہندوستان کے جام نگر میں بیچا گیا ہے۔''(2)

مذکورہ ہیرے کا پہلی بار انکشاف ہندوستان کے گوالیار کے راجہ وکرماجیت
کی ملکیت میں ہوا تھا۔''تاریخ آگرہ'' میں ہے کہ جب بادشاہ بابر نے دہلی اور آگرہ پر
قبضہ کیا تو راجہ گوالیار کا خاندان گرفتار اور قید کر لیا گیا۔ ہمایوں نے جب تخت سنبھالا تو
انہوں نے اس خاندان پر کوئی تکلیف آنے نہیں دیا اور سابق حکمران ہونے کے ناطے
ان کی عزت افزائی کرتا رہا اور انہیں آسودہ حال رکھا۔ اس مہربانی کے بدلے راجہ کی

بیوی نے ہمایوں کو کئی نادر قیمتی اشیا تحفے میں پیش کئے جن میں یہ بلوچ ملکیت کوہ نور بھی شامل تھا۔ اس کے بعد کوہ نور مختلف بادشاہوں سے ہوتے ہوئے ملکہ برطانیہ کے محل تک جا پہنچا۔ درمیانی عرصے میں کوہ نور ایک مرتبہ پھر اپنے قدیم وارث نوشیروانی بلوچوں کے ہاتھ لگا۔ اس ضمن میں عبدالقادر بلوچ خارانی اپنی کتاب ''مجموعہ بلوچ تاریخ خاران'' میں لکھتے ہیں :

" کوہ نور ہیرا شاہان افغانستان قوم غلزئی طائفہ ہوتک خاندان کے قبضہ میں تھا۔ حاجی میر محمد خان بلقب میرویس غلزئی طائفہ ہوتک حکمران قندھار تھا۔ اس کا ایک بھائی شاہ عبدالعزیز تھا۔ میرویس حاکم قندھار ایران پر حملہ آور ہو کر شاہ اسماعیل صفوی سے کچھ علاقہ حاصل کیا تھا۔ تقریباً آٹھ سال حکمرانی کرنے کے بعد شاہ محمود حکمران ہوا جس نے اپنے چچا شاہ عبدالعزیز کو قتل کیا اور وہ کوہ نور ہیرا حاصل کیا اور حکومت ایران کی طرف سے شاہ محمود کی خدمت کے صلہ میں خطاب حسن قلی خان حکومت افغانستان ملا تھا۔ مگر شاہ محمود اندرون ایران پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے سیستان کے راستے اصفہان پر حملہ کر کے شاہ ایران صفوی کے خاندان کا صفایا کیا اور خود بادشاہ بن گیا۔ تھوڑے عرصے بعد شاہ اشرف بن

شاہ عبدالعزیز نے اپنے باپ کا انتقام لینے کے بہانے حملہ کر کے شاہ محمود کو قتل کیا اور خود خراسان، اصفہان تا شیراز حکمرانی کرتا رہا۔ کافی مدت کے بعد جب نادر شاہ افشار عروج میں آیا تو اس نے شاہ اشرف بن عبدالعزیز پر اصفہان میں حملہ کیا۔ شاہ اشرف فرار ہو کر شیراز آیا۔ نادر شاہ افشار نے یہاں بھی اس کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا اور حملہ آور ہوا شاہ اشرف ہوتک جنگ کی تاب نہ لا کر یہاں سے فرار ہوا۔ چونکہ یہ زمانہ حکمرانی خاندان نوشیروانی کے امیر پُردل خان (1730ء) کا تھا اور ایرانی بلوچستان کے اکثر علاقے نوشیروانی خاندان کے زیر حکومت تھے۔ شاہ اشرف افغان کے حدود خاران میں داخل ہوتے ہی امیر پُردل خان کو معلوم ہوا کہ ایک مشکوک گروہ گزر رہا ہے جس پر میر عباس خان دوئم برادر خورد امیر پُردل خان نوشیروانی ایک دستہ جانباز سوار لے کر اس کا تعاقب کیا۔ خاران کے موجودہ ایرانی بلوچستان کے اندر اس کا مقابلہ ہوا۔ دوران جنگ اشرف ہوتک قتل ہوا اور اس طرح کوہ نور ہیرا نوشیروانی خاندان کے قبضہ میں آیا۔

میر پُر دل خان کی وفات کے بعد خاندان کے امیر
جہانگیر خان دوئم، حکمران خاران سے یہ ہیرا اس کے
پسر خورد میر ابراہیم خان نوشیروانی پنجم برادر امیر عباس
خان چہارم کے پاس آیا۔ اِس کے تعلقات امیر
عباس خان سے ٹھیک نہیں تھے۔ اپنے برادر کلاں
حکمران خاران سے ناراض ہو کر پنجاب رنجیت سنگھ
کے پاس گیا اور پناہ گزین ہو کر خاران کی حکومت کا
طلبگار ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان کی بہت خاطر
مدارات کی اور ہر قسم کا لالچ دے کر فریب سے کوہ نور
ہیرا بطور امانت رکھ دیا۔ جب ابراہیم خان چند دن
بعد واپس خاران آیا تو امیر عباس خان چند دن بعد
فوت ہو گئے۔ پسر کلاں امیر آزاد خان نے اپنے
والد کی وصیت کے مطابق اسی رات نیابت جہلاوان
میں جا کر اپنے چچا میر ابراہیم خان کو قتل کیا۔ میر
ابراہیم کے قتل کے بعد کوہ نور ہیرا مہاراجہ کے پاس
امانت پڑا تھا کہ انگریزوں نے سکھوں کو شکست
دے کر کوہ نور ہیرا پر بھی قبضہ کر لیا۔ جان لارنس گورنر
جنرل کے زمانے میں یہ ہیرا انگلستان بھیجا گیا۔
(3)"

حواشی:

1۔1932ء میں ایک پٹھان نے مکہ شریف جا کر "حجر اسود" چُرا لیا کہ پکڑا گیا۔
کتاب "تواریخ اقوام کشمیر" میں اس کے مصنف محمد الدین فوق نے صفحہ 725 پر
اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

" اِسی سال (1932ء) ایک پٹھان حجر اسود کی
چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ سلطان عبدالعزیز کے
روبرو اس نے اقبال جرم کیا اور بیان دیا کہ میں حجر
اسود کو توڑ پھوڑ کر انگوٹھیوں میں بطور نگینہ جڑوا کر
فروخت کرنا چاہتا تھا۔ سلطان کے حکم سے حبشی جلاد
نے تلوار اس کی گردن پر ماری لیکن اس کی سخت جانی
آڑے آ گئی اور گردن کٹ نہ سکی۔ آخر چاقو سے اس
کی گردن جُدا کی گئی۔"

2۔کتاب "تاریخی نبشتا نک (بلوچی)"، مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، 2009،
صفحہ 96-195۔

3۔"مجموعہ بلوچ تاریخ خاران" از میر عبدالقادر بلوچ خارانی صفحہ 103۔

کہیری (قبیلہ)

قبیلہ کہیری، بلوچستان کے ضلع کچھی کا فقیر (میاں) قبیلہ ہے جو پندرھویں صدی عیسوی میں رند بلوچوں کے ہمراہ مغربی بلوچستان (ایرانی) سے نقل مکانی کر کے آیا تھا۔ اس کے بزرگ رند قبائل اور مکران کے بلوچوں کے مرشد ہوا کرتے تھے۔ معروف بزرگ ہستی پیر عمرؒ، جن کی زیارتیں اور آستانے ایرانی بلوچستان، خاران، پنجگور اور خضدار میں واقع ہیں۔ پورے بلوچستان کے بلوچوں کے پیر و مرشد رہے ہیں۔ کہیری اپنے کو سید کہتے ہیں۔ خضدار کے گاؤں ساسول میں معزز قبیلہ شیخ رہتا ہے جو اپنے کو حضرت پیر عمرؒ کی نسل سے کہتا ہے۔ وہ معروف بلوچی رومان حانی شیے مرید کے ہیرو شیے مرید کو بھی اپنے اجداد سے بتاتے ہیں۔ وہ سید نہیں کہلاتے شیخ بلوچی میں شیے تلفظ کیا جاتا ہے جس سے فقیر، میاں اور شیخ معنی لئے جاتے ہیں۔ معروف بلوچی رومان حانی و شیے مرید کے ہیرو شیے مرید کو بھی قبیلہ کہیری سے روایت کیا جاتا ہے لیکن اس کا شمار سیدوں میں نہیں کیا جاتا خود کہیری قبیلہ میں اکثر میاں کہے جاتے ہیں اور کچھ شخصیتوں نے اپنے نام کے ساتھ سید اور شاہ کا بھی استعمال کیا ہے۔ لسبیلہ کے رونجھا قبیلہ میں بھی "کہیری" طائفہ ہے۔ جو اپنے کو "عرب" نسل روایت کرتے ہیں۔(1.A)

پہلے یہ قبیلہ بلوچی بولتا تھا، اس کے باقیات مغربی مکران میں اور خاران میں اب بھی بلوچی بولتے ہیں۔ کچھی کے موضع چھتر میں آباد ہونے کے بعد ان کی زبان بدل کر جتکی ہوگئی۔ یورپی دور میں 1901ء کی مردم شماری میں انہیں بلوچ شمار کیا گیا ہے اور ان کی آبادی 789 نفوس پر مشتمل تھی (1) سندھ کی تاریخ "تاریخ معصومی" نے جو 1600ء کی کتاب ہے۔ کہیری قبیلہ کو سید بتایا ہے۔ اس میں نام "کہیری" کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا بزرگ جڈا مجد کہیر درخت پر ایسے چڑھ گیا گویا گھوڑے پر۔ یعنی اس بزرگ نے اپنی کرامت سے کہیر درخت پر سوار ہو کر اسے دوڑایا تھا۔(2) ڈسٹرکٹ گزیٹر سبی میں کہا گیا ہے کہ:

> " وہ خود اپنا شجرہ شاہ عمر قتال سے اخذ کرتے ہیں جو آنحضور صلعم کا ہم عصر تھا اور دعوے کرتے ہیں کہ وہ اپنے قائد نیامت شاہ کے تحت مکران سے بلوچوں کے ساتھ آئے۔ نیامت شاہ نے ایک اونٹ بھر (چھتر) روپے سے علاقہ کرچانیوں (3) سے خریدا۔ لہٰذا ان کے موجودہ صدر مقام کا نام چھتر ہے (4)"

ڈسٹرکٹ گزیٹر کچھی کہیریوں کے بارے میں تحریر کرتا ہے کہ

> " کہیری قبیلہ کا مرکزہ ہفت اولیاء کی اولاد

ہونے کا دعویدار ہے جن کا مزار بھٹاری میں
ہے۔۔۔۔۔اور وہ سید تھے جو بلوچوں (5) کے ساتھ
آئے تھے۔وہ ہفت ولی زیارت کے محافظ ہونے
کی حیثیت سے بہت عزت سے دیکھے جاتے ہیں۔
"(6)

تاریخ معصومی میں کہیری کی جو وجہ تسمیہ بتائی گئی ہے وہ غیر حقیقی ہے اور سینکڑوں مفروضوں کی طرح ایک مفروضہ ہے اور شاید کسی عقیدتمند کی اڑائی ہوئی بے پر کی ہے۔اسی لئے کہتے ہیں کہ پیر اڑتا نہیں بلکہ اُسے مُرید اُڑاتا ہے۔ "کہیر" مغربی مکران یعنی موجودہ ایرانی بلوچستان میں ایک قدیم موضع ہے جو ابھی تک اسی نام سے موجود ہے۔مذکورہ شئے لوگ اسی موضع سے ہجرت کر کے رندوں کے ساتھ مغربی بلوچستان آئے تھے اسی لئے اپنے پرانے موضع "کہیر" کی نسبت سے کہیری کہلائے نہ کہ مفروضہ روایت کے مطابق ان کے جدّ نے "کہیر" کے درخت پر سوار ہو کر اُسے دوڑایا تھا۔

کہیریوں کا گزیٹر کے حوالہ سے یہ کہنا کہ وہ پندرھویں صدی میں رندوں کے ساتھ اپنے ایک جدّ نیامت شاہ کی سرکردگی میں بلوچستان آئے تھے غلط ٹھہرتا ہے۔ یقیناً وہ رندوں کے ساتھ آئے تھے لیکن نیامت شاہ کی سرکردگی میں آنا غلط روایت ہے۔کیونکہ کچھی گزیٹر میں "ہفت ولی" کی ذیل میں نیامت شاہ کو شاہ عمر قتال کا بیٹا

دکھایا گیا ہے اور شاہ عمر قتال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بنی صلعم کا معصر تھا۔جبکہ نیامت شاہ پندرھویں صدی عیسوی میں کہیریوں کو لیکر رندوں کے ساتھ بلوچستان آتا ہے۔باپ اور بیٹے کے مابین ایک ہزار سال کا فاصلہ کیسے ممکن ہے۔اس رشتے اور اس کے فاصلے نے کہیریوں کی روایت کو غلط ثابت کیا ہے۔

حواشی:

1۔بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز ڈسٹرکٹ سبی، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 998۔

1.A۔ایضاً۔ڈسٹرکٹ لسبیلہ۔۔۔۔۔ایضاً صفحہ 458۔

2۔بحوالہ ایضاً

3۔دراصل یہ قبیلہ کچھانی بلوچ ہے جو رندوں کی آمد سے بہت قبل مذکورہ علاقے اور سیوستان کے کہستان میں آباد تھا۔یہ وہی قبیلہ ہے جو دسویں صدی عیسوی کے لگ بھگ کرمان کے پہاڑوں میں آباد تھا۔جسے عربوں نے کہیں قفص اور کہیں کوفج لکھا ہے اور اسے بعض کتابوں میں کوچ بلوچوں سے غلط ملط کیا ہے۔کچھانی کا مرکزہ "کوہچ" تھا جس کا معرب "قفص" اور "کوفج" ہے۔یہ قبیلہ غالباً قدیم ملک بلوچ کے نسلی بلوچ قبائل میں سے رہا ہے کیونکہ 325 ق م میں جب سکندر اعظم گوادر کے علاقہ پیشکان سے گذرا تو اس کا نام کوفص یا قفص تھا (دیکھیں اینشینٹ انڈیا: اِٹس انویشن بائی الیگزینڈر دی گریٹ از میک کرنڈل)

4۔بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر : ڈسٹرکٹ سبی، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 998۔گزیٹر کے مصنفین نے ''چھتر'' سے جو ''اونٹ بھر'' یعنی ''ایک شتر کا بار'' معنے لئے ہیں وہ غلط ہے۔اور کئی خود ساختہ کہانیوں اور مفروضوں میں سے ایک مفروضہ ہے۔یہ ایک قدیم قبیلہ کا نام تھا جو نہ صرف اس مقام پر آباد تھا بلکہ چاغی اور مری بگٹی کوہستان میں بھی آباد تھا اور وہاں ان کے اسی نام کے مواضع موجود ہیں۔کشمیر میں بھی ایک گاؤں اس قبیلے کے نام پر موجود ہے۔

5۔یعنی رندوں کے ساتھ۔

6۔بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر : ڈسٹرکٹ کچھی، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 290۔

کیچ

کیچ، مملکت مکران کا ایک قدیم اور مردم خیز علاقہ رہا ہے۔کسی وقت یہ مکران کا دارالحکومت بھی رہا تھا۔چونکہ زمانہ قدیم سے مکران کا اٹوٹ حصہ رہتا آیا ہے اس لئے تواریخ میں ہمیشہ یہ ''کیچ مکران'' کہلاتا رہا ہے دسویں صدی عیسوی میں ابن حوقل نے اسے عیسیٰ بن معدان نامی ایک عرب حکمران کا دارالحکومت لکھا ہے۔اور اس کی وسعت کو ملتان کے نصف کے برابر لکھا ہے۔مارکو پولو نے تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسے ''کیس مکران'' لکھا ہے اور اسے ''ملک قبیلہ'' کی ایک آزاد حکومت کا مرکز بتایا ہے۔رائے بہادر ہتورام نے اپنی ''تاریخ بلوچستان'' میں اس کی عجیب وجہ تسمیہ بیان کی ہے :

> '' وجہ تسمیہ اس کا یہ ہے کہ اوّل اِس ملک کا نام گنج آباد تھا۔یہاں کی حکومت ملک شہریار خان کے ہاتھ میں تھی۔کسریٰ شاہ ایران کی تابعداری منظور نہ کی تب بادشاہ مذکور نے فوج بھیج کر گنج آباد کو ویران کر دیا۔ اُس وقت ایرانی فوج نے اظہار فخر میں یہ کلمہ نکالا کہ گنج آباد کو ہیچ کر دیا گیا ہے۔تب سے غلط عام ہیچ سے کیچ مشہور ہو گیا۔''(1)

قوموں کی تواریخ میں مفروضوں کی بھرمار نظر آتی ہے اور خصوصی طور پر بلوچ قوم کی تاریخ میں بے حساب بے سروپا مفروضے پڑھنے کو ملتے ہیں۔لیکن کئی قسم کے مفروضے تو گھٹیا قسم کے اور نہایت ہی احمقانہ ہوتے ہیں۔ جیسے کہ مذکورہ روایت ہے یا پھر قلات کی تاریخ میں ڈوڈ کی کی روایت کا تذکرہ۔

مواضعات اور قبائل کے نام ایسے نہیں پڑتے۔ وہ تاریخی اور حقیقی آثار قدیمہ ہوتے ہیں جن کے پس پُشت تاریخی خزائن ہوتے ہیں۔ ''کیچ'' کا نام تاریخی نامدار بلوچ قبیلہ ''کوچ'' کے نام پر ہے جس کے وسیع وعریض وطن کا مرکزی مقام یہی جگہ تھا جہاں اُس عظیم قوم کا عظیم الشان قلعہ واقع تھا جس کے آثار آج بھی اُس قدیم مقام پر موجود ہیں۔ جسے بعد کے قبیلہ ہوت کے حکمران میر عالی ہوت کے شہزادہ پنوں ہوت سے منسوب کیا گیا اور اُس کی نسبت سے ''پنوں قلات'' مشہور ہوا۔ بلوچ قدیم زمانے سے سینکڑوں الفاظ کو کہیں ''ی'' سے اور کہیں ''و'' سے ادا کرتے ہیں۔ کوچ کا نام بھی مقامی لوگ ''ی'' سے ادا کر کے ''کیچ'' بولتے تھے۔ اسی لئے یہ کیچ ہی مشہور ہوا۔ قبیلہ کوچ بلوچ پر گذشتہ صفحات میں بحث ہو چکی ہے (2)۔

ہتورام نے ''کیچ'' علاقے کا قدیم نام ''گنج آباد'' روایت کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اُسے اپنے وقت کے بوڑھوں سے یہی روایت ملی ہے۔ لیکن کسی قدیم تاریخ میں اس نام کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ اور اسے ہم غلط کہہ اور رَد بھی نہیں کر سکتے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ بلوچستان اور بلوچ قوم کے بارے میں تاحال بیس فیصد تاریخی حقیقی واقعات بھی ضبط تحریر میں نہیں آئے ہیں۔ کیوں کہ اس شعبہ میں کام کرنے میں کسی

نے دلچسپی نہیں لی ہے اور نہ سنجیدگی دکھائی ہے۔ جو کچھ ہمیں ایرانیوں اور عرب سیاحوں سے پڑھنے کو ملا ہے وہ ان کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ چلتے چلتے انہیں جو نظر آیا یا کسی سے انہوں نے سُنا وہی انہوں نے اپنے چند جملوں کی صحیح یا غلط ملاوٹ سے لکھا جو ہم تک پہنچ گئے۔ ان کی نگارشات میں کئی چیزیں ایسی ہیں جو حقائق سے بعید ہیں۔ کئی نام غلط اور کئی مشکوک ہیں۔ کئی چیزیں ان سے بھول چوک میں رہ بھی گئی ہیں۔ اس لئے اگر ہتورام نے کیچ کا قدیم نام گنج آباد روایت کیا ہے تو بے جا نہیں ہے۔ بلوچوں میں ایک قدیم نسلی بلوچ قبیلہ ''گنج'' موجود رہا ہے۔ جس کی روایتیں پنجگور، مستونگ اور کوئٹہ کے گرد ونواح میں ابھی تک سننے میں آتی ہیں۔ اس قبیلہ کے چند گھرانے اب بھی کوئٹہ، قلات، منگچر اور مستونگ کے درمیانی خراسان میں ہیں جو اب دوسرے بڑے قبیلوں میں مدغم ہو گئے ہیں۔ مستونگ کے کھڈ کوچہ میں اس قدیم قبیلہ کا قدیم قلعہ ''گنج ماڑی'' ہوتا تھا۔ جو ہمایوں بادشاہ کے عہد تک آباد تھا۔ اسی طرح موجودہ ''گنداوہ'' کا اصل نام ''گنج آبہ'' ہوتا تھا جو اِس قبیلہ کے نام پر آباد تھا۔ کوئٹہ میں موجود سور جگنج (3) بازار کا قدیم مقام ایک میدان روایت کیا جاتا ہے جہاں پر کھیتوں سے کاٹا گیا گندم کو صاف کرنے کیلئے ڈھیر کیا جاتا تھا۔ جو بلوچی میں ''جوہان ڈن'' کہلاتا ہے۔ اس میدان کو ''گنج جوہان ڈنّ'' اور ''گنج کوت'' کہا جاتا تھا۔ ''کوت'' بھی جوہان یا ڈھیر کو کہتے ہیں۔ مذکورہ تذکروں کی روشنی میں ہتورام کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو وجہ تسمیہ اُس نے کیچ کا لکھا ہے وہ ایک بے معنی مفروضہ ہے۔

حواشی:

1۔تاریخ بلوچستان: رائے ہتورام، مطبوعہ گوشہ ادب، کوئٹہ 2009ء۔صفحہ 320۔

2۔دیکھئے صفحات گذشتہ میں موضوع ''بُرزکوہی''۔

3۔سورجگنج بازار کا نام ایک کاروباری ہندو شخص ''سورج مل کول'' کے نام پر رکھا گیا ہے۔ کہتے ہیں اُس نے اپنے زمانے میں ایک میموریل سوسائٹی کو دو ہزار روپے کا چندہ دیا تھا۔ مذکورہ روڈ کا نام انگریزی دور میں رکھا گیا تھا۔ اور یہ نام ''سورج مل گنج'' تھا جو کہ اب مختصر ہو کر صرف ''سورجگنج'' رہ گیا ہے۔ مذکورہ سورج مل کول ایک کاروباری شخص تھا یا نہیں تھا لیکن ایک معروف سرکاری شخصیت ضرور تھا۔ جس کا تذکرہ محمد الدین فوق نے اپنی ''تاریخ کشمیر'' میں بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ راجہ پنڈت سورج کول نے پنجاب اور بلوچستان میں مختلف جلیل القدر عہدے حاصل کئے اور 1888ء سے 1896ء تک کشمیر کے مشیر مال رہے۔ 1901ء میں انتقال کر گئے۔ وہ پنڈت لال کول کے فرزند تھے جو اس فوج میں شامل تھے جسے رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملے کیلئے بھیجا تھا۔ کشمیر میں ان کی جاگیر تھی جسے مہاراجہ گلاب سنگھ نے پنڈت لال کول کی وفات پر ضبط کر لی تھی۔

گاجان

گاجان، بلوچستان کے ضلع کچھی کا ایک قدیم گاؤں ہے جو مولہ ندی کے ایک کنارے پر آباد ہے۔ گاجان کے رہنے والے لاشاری ہوتے تھے۔ جنہیں گاجانی لاشاری کہتے تھے۔ قدیم لاشاری، گاجان کی نسبت سے گاجانی کہلاتے ہیں۔ اور بعد کے صرف لاشاری کہے جاتے ہیں۔

رائے بہادر ہتورام نے گاجان کی وجہ تسمیہ لکھی ہے کہ اسے شروع میں گاجان نامی ایک زراعت کار نے آباد کیا تھا۔ چنانچہ اس کی اولاد میں سے مردم گاجانی اب اس ضلع میں موجود ہیں۔ اس وجہ سے علاقہ ہذا کا نام گاجان مشہور ہوا۔ اور شہر گاجان بھی اسی نام سے موسوم ہوا۔

رائے بہادر ہتورام کا مذکورہ بیان بھی ایک غلط بیان اور مفروضہ ہے۔ گاجان دراصل ''گاج'' کی جمع ہے اور گاج ایک قدیم قبیلہ معلوم ہوتا ہے جس کے لوگوں نے مذکورہ مقام آباد کیا اور یہ جگہ گاجان کہلایا۔ ''گاج'' نامی دو موضع خضدار اور سراوان کی پہاڑی علاقوں میں موجود ہیں۔ خضدار ضلع کے زیدی گاؤں کے مشرق کی طرف ''گاج'' کا پرانا گاؤں ہے۔ جہاں سے گاج ندی نکل کر آگے کولاچی موضع سے

گذر کر جاتی ہے جہاں سے یہ نام بدل کر کولاچی ندی بن جاتا ہے۔ایک نام کی کئی جگہ موجودگی ثابت کرتی ہے کہ یہ کوئی قبیلہ تھا جو ایک سے زیادہ مقامات پر آباد تھا۔یا ایک موضع سے ہجرت کر کے کہیں اور دوسرا موضع بسایا تھا۔لہذا اسے کسی ایک شخص سے منسوب کرنا تاریخی عمل سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

گدروشیا و بلوچ بدروچ و گدور

گدروشیا ایک قدیم خطے اور وسیع مملکت کا نام تھا جس میں موجودہ جنوبی بلوچستان اور اس کا مغربی حصہ یعنی ایرانی بلوچستان شامل تھا۔جس کا دارلحکومت ایرانی بلوچستان کا ''پہرہ'' ہوتا تھا جسے سکندر اعظم کے زمانے کے نقشوں میں (1) ''پُھرا'' نام سے دکھایا گیا ہے۔

ایرئین نے گدروشیا کے اندرونی حدود کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ اورتیائی ملک یعنی لسبیلہ سے لے کر کرمانیہ (کرمان) تک وسیع ہے۔ساحلی علاقے کو اس نے یونانی زبان میں ''اچھیتیسو پگوئی'' لکھا ہے جس کے معنی ''ماہی خوران'' کے بتائے گئے ہیں (2) اس کے لشکر کے ایک حصے نے گدروشیا کی سرحد کے کنارے کنارے سفر کیا جہاں دو طاقتور قبیلے رہتے تھے ایک اورتیائی اور دوسرا گدروشی۔ گدروشی قبائل کے علاقوں میں گندم کی فراوانی تھی اگرچہ علاقہ زیادہ تر صحرا تھا۔اور اورتیائی نسبتاً ساحل سے قریب رہتے تھے (3) گدروشی یا گدروشیائی کون کونسے قبیلے تھے، ایرئین نے اس بارے میں نشاندہی نہیں کی ہے۔لیکن بلوچ قوم گدروشیا کی اہم نسلی قوم تھی اور اُس کے قبائل اس خطے کے سینکڑوں سالوں سے وارث تھے۔عالمی شہرت یافتہ تاریخ دان و تاریخ نویس ہیروڈوٹس نے شاہ ایران زرکس کی فوج کے

چھپن دستوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک دستہ ''چیتے کی کھالوں میں ملبوس گندمی رنگ کے گدروشیائی بلوچ'' کا دستہ تھا۔ یہ زمانہ 485-465ق م کا زمانہ تھا۔ ایرئین نے ساحلی خطے کے جن بعض مقامات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں اکثر نام بلوچ قبیلوں کے ہیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان دنوں ان قبائل کا وجود تھا یا نہیں۔ البتہ ایک قبیلہ کے نام کے مقام کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے اُس وقت وہ قبیلہ اس مقام پر موجود تھا۔ یہ نام ''کوفص'' ہے جو نقشے کے مطابق آج کا پیشکان تھا۔ ''کوفص'' وہی قدیم نسلی بلوچ قبیلہ ہے جس کا ذکر عرب جغرافیہ نویسوں نے نویں اور دسویں صدی عیسوی میں کرمان اور مکران کے درمیانی پہاڑیوں میں بود و باش رکھنے والے کوچ بلوچوں کے ساتھ کیا ہے اور بعض جگہ اس نام کو کوچ کے ساتھ غلط ملط کیا ہے یہ قبیلہ ''کوپچ'' قبیلہ تھا۔ جسے عرب مصنّفین نے کہیں ''کوفج'' اور کہیں ''قفص'' کر کے لکھا ہے۔ سکندر اعظم کے زمانے کا مذکورہ ''کوفص'' قبیلہ جو پیشکان میں رہائش پذیر تھا، آج بھی بلوچستان کے مشرقی اضلاع اور سندھ و پنجاب کے بعض اضلاع میں ''کوپچ'' ہی کے نام سے موجود ہے اور اس کا توسیعی شکل ''کوپچانی'' یا کپچانی'' کے نام سے موجود ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ خود نام گدروشیا کیا ہے۔ اس ضمن میں یوروپی مصنّفین کا کہنا ہے کہ بلوچ ہمیشہ اپنے کو ''بلوچ بدروش'' کہتے ہیں اسی بدروش کو انہوں نے بلوچ کا مترادف سمجھ کر گدروش سے اس کی مطابقت اور مماثلت پر بحث کی ہے۔ مکران گزیٹر نے 1895ء میں جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں میجر موکلر

کے مضمون ''اوریجن آف دی بلوچ'' کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ

" جب بھی میں نے کسی بلوچ سے اس کے نام کے معنی پوچھے ہیں تو انہوں نے لازماً یہی جواب دیا ہے (گویا یہ ایک ضرب المثل تھا) بلوچ بدروچ (بدروش، علاقہ کے بعض حصّوں میں)۔ بد کا معنی ہے بُرا اور روچ یا روش کا معنی ہے دن۔ گد، پہلوی یا زند (قدیم فارسی) میں بلوچی یا جدید تر فارسی بد کے ہم معنی ہے۔ لہذا بدروچ یا بدروش یا بادروس مترادف ہے قدیم تر پہلوی یا زند کے گدروچ یا گدروش یا گدروس کے اور یونانیوں کے گدروسی یا گیدروشئی کے ''ز'' اور ''ل'' کی باہمی تغیر پذیری کی وجہ سے بدروچ، بدلوچ کے مساوی ہوجاتا ہے جس میں سے ''د'' قدرتاً حذف ہوجائے تو بلوچ جیدروشی کا مساوی ہوجاتا ہے۔ اگر اس انداز میں گدروچ سے بلوچ کا اشتقاق لسانیاتی لحاظ سے ناقابل قبول گردانا جائے تو پھر ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ یونانیوں کے وقت بلوچ بدروش کی ضرب المثل زبان زد خاص و عام تھی لیکن یہ

ان دنوں میں بلوچ گدروش کہلاتی تھی۔ اور یونانیوں
نے اسے نام کے بدلے لکھا جو یقیناً بیلوص (یا بلوچ)
سے ماخوذ تھا۔"(4)

میجر موکلر کا مذکورہ بیان یا بلوچ گدروش کی وضاحت، کسی فیثا غورسی مسئلہ کا پیچیدہ حل معلوم ہوتا ہے جو شاید کسی آرٹس کے طالب علم کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر لسبیلہ میں رائے ظاہر کی گئی ہے کہ قبیلہ گدور، ہی دراصل قدیم جدروشی قبائل کی نمائندہ ہے اور جدروشی کی موجودہ زندہ صورت ہے۔(5) حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اور یہ ان کا ایک مفروضہ ہے۔ نیز "گدور" نام جدروشی سے قریبی مشابہت بھی نہیں رکھتا۔ نام جدروشی دراصل "گڈروشی" کا معرب ہے۔ اصل نام گڈروشی ہے۔ اگر کسی موجودہ قبیلہ کو گڈروشی کا ممکنہ باقیاتی نمائندہ کہا جا سکے تو وہ قدیم حبشی شکل و شباہت کا ساحلی قبیلہ "گڈرا" ہوگا۔ جس کے مکران کے ساحلی لوگوں نے اپنا مخصوص قبیلائی نام چھوڑ کر "مکرانی" کا علاقائی نام اختیار کیا۔ جن کی موجودہ وقت میں زیادہ تر تعداد کراچی واندرون سندھ میں آباد ہے اور بعض انڈیا اور سری لنکا تک اِسی مکرانی نام کے تحت جا بسے ہیں۔ لسبیلہ میں یہ قبیلہ اپنے سینکڑوں سال قبل کے نام "گڈرا" سے موجود ہے۔ جن کے بارے میں مذکورہ گزیٹیئر لکھتا ہے کہ

" لسبیلہ کی غلام آبادی کی اولاد ہیں۔ ان کے
افریقی خدوخال اظہر من الشمس ہیں اور اس میں کسی
شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ غلاموں کی اولاد ہیں جنہیں

سونمیانی کے میمن یا خوجے ماضی میں درآمد کرتے
تھے۔ گڈرا اپنے وطن کی زبان سراسر بھول چکے ہیں
اور اب جدگالی یا جگدالی بولتے ہیں۔ خادم گولو اور
خادمہ گولی کہلاتے ہیں۔"

(6) 1901ء میں گڈرا قبیلہ کی آبادی 7898 نفوس پر مشتمل تھی۔ صدیوں بعد ان کی مذکورہ بڑی تعداد اِس خیال کو تقویت دیتی ہے کہ نام "گڈروشیا" اسی قبیلہ ہی کی نسبت سے پڑ گیا ہوگا۔

حواشی:

1۔ سکندر اعظم مکران سے 325 ق م میں گذرا تھا۔ "پُھرا" موجودہ وقت میں بمپور کہلاتا ہے۔
2۔ "اینشیئنٹ انڈیا: از انویشن بائی الیگزینڈر دی گریٹ" صفحہ 169۔
3۔ "اورتیائی" کے لئے ملاحظہ کیجئے موضوع "رند قبیلہ"... علاقی عرب؟" کا حاشیہ نمبر 2۔
4۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر مکران ڈسٹرکٹ مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 702-703۔
5۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر لسبیلہ ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1999ء صفحہ 448۔
6۔ ایضاً صفحہ 465۔

گزینی مری

مری قبیلہ کا ایک حصّہ گزینی مریوں پر مشتمل ہے۔ اور مری قبیلے کی سرداری بھی اِسی طائفے کے پاس ہے اور یہ طائفہ دیگر طائفوں سے زیادہ باوقار اور سنگین سمجھا تا ہے۔ یوروپی مصنّفین کا کہنا ہے کہ جب کاہان پر بجارانیوں کا پورا قبضہ ہوا تو انہوں نے بلیدیئوں سے لڑ کر انہیں وہاں سے نکال دیا۔ کاہان سے نکلنے کے دوران بلیدیئوں کا ایک بچہ اپنے والدین سے بچھڑ گیا جو ایک بجارانی سردار سالار خان کو دوران شکار ایک گز (TAMARISK) درخت کے نیچے پریشانی میں بیٹھے ہوئے ملا۔ جسے پھر ایک بجارانی علی خان رند نے اپنایا۔ گز درخت کی نسبت سے اُس کا نام ''گزین'' رکھا۔ جو پھر اپنے خاندان ''گزینی'' کا جدّ بنا۔ مریوں کے اُس وقت کے بجارانی سردار جلال خان رند ولد عالی خان نے وصیت کی تھی کہ اُس کے بعد گزین خان بلیدیٔ کے بیٹے میر ساہتک بلیدیٔ کو سردار بنایا جائے جواب اُس کا نواسہ تھا۔(1)

مذکورہ بالا روایت سے سوائے گزین کے اُس کے والدین وغیرہ کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور کہاں گئے۔ اور گزین نام کی وجہ تسمیہ اُس گز کے درخت کی نسبت سے بتائی گئی ہے۔ جبکہ گزین ایک قدیم بلوچی نام ہے جو گزین بلیدیٔ سے قبل بھی بیسویں قبائل میں اپنائی گئی ہے۔ گزینیوں کا تذکرہ تاریخ بلوچستان

میں رائے بہادر ہتورام نے بھی کیا ہے۔ جو اس طرح ہے :

" پہلے بجار خان کاہان آ کر متوقف ہوا اس وقت تخمیناً ایک سو نفر ہمراہ بجار خان ہوگا، اسی زمانہ میں مسمّی نوت بگٹی سیاہ آف (2) میں آ کر ٹھہرا ہوا تھا۔ بعد فوتیگی بجار خان کے آزاد خان بیٹا اس کا تمندار بنا مگر لاولد فوت ہوا۔ دستار تمنداری درویش خان بھائی بجار خان پر منتقل ہوگئی لیکن درویش سست تھا اس سے سرداری وزیر عالیانی نے چھین لی اسی عرصہ میں گزین خان تمن مری میں آیا۔ مشہور ہے کہ یہ چار بھائی تھے گزین خان، حاجی خان، زین الدین اور عمر ایک مادر پدر سے۔ ان کے باپ بلیدیٔ تمن میں مقدم تھا۔ کہتے ہیں کہ بہ دعائے خیر ایک فقیر کے یہ چاروں بیٹے عقلمند و صاحب بخت پیدا ہوئے.....

گزین خان بہ سبب رنجش باپ خود مسکن مالوف اپنے سے نکل کر طرف کاہان کے آیا محض اکیلا تھا۔ بہ سبب عقلمندی اور ظاہر ہونے آثار طلوع بختی کے وزیر خان تمندار مری نے ناطہ نسبت لڑکی اپنی کا گزین خان

کو دیا گزین خان کا لڑکا پہیزک خان پیدا ہوا جب
کہ وزیر خان قریب المرگ تھا اس کے دو بیٹے کم سن
اور نالائق تھے اس نے واسطے سرداری کے بحق
پہیزک خان ٹھہرہ خود وصیت کی چنانچہ بعد فوتیگی
وزیر خان کے دستار پہیزک خان نے باندھی۔ گزین
کی اولاد ہونے سے گزینی مشہور ہوئے'' (3)۔

مندرجہ بالا روایتوں میں فرق یہ ہے کہ یوروپی مصنفین نے گزین کو ایک گمشدہ اور لاوارث بچے کی حیثیت سے پایا جسے بجارانی سردار گھرانے کے علی خان رند نے اپنا کر پالا پوسا اور بڑا کیا اور داماد بنایا۔ تب کچھ عرصہ بعد اس کے بیٹے ساہتک کو اپنے گھرانے کی سرداری دیدی جس سے گزینی نے مری تمن میں شہرت پائی۔ جب کہ ہتورام اپنی روایت میں اسے ایک جوانمرد کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جو اپنے دیگر تین بھائیوں کی ہمراہی میں مری تمن میں آیا اور کسی بات پر ناراض ہو کر دوسرے بھائیوں کو چھوڑ کر اکیلا کاہان آیا اور وزیر خان عالیانی بجارانی نے اس میں مردانگی کے جوہر دیکھ کر اُسے داماد بنایا اور اُس کے بیٹے پہیزک خان کے حق میں سرداری کی وصیت کی۔

دونوں روایتوں میں موجود بعض تضادات کو چھوڑ کر مجموعی طور پر ہتورام کی روایت کسی حد تک مکران میں مشہور تاریخی روایت سے قریب تر ہے۔ اس روایت کے بیان سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ علاقہ زامُران جس میں گاؤں بلیدہ واقع

ہے زمانہ قدیم سے مکران کے قدیم قبیلہ رئیس کا اکثریتی علاقہ رہا ہے۔ جہاں پر رند زیادہ تعداد میں نہیں بسے بلکہ یہیں سے گزر گزر کر آگے بڑھتے رہے۔ اور یہاں کے پہاڑی قبائل میں ابتدا میں داخل ہونے والے رند گروپوں سے ان کی مزاحمت کی کہانیاں بھی ملتی ہیں۔ بلیدہ سے لے کر رودبُن کے شمالی پہاڑی سلسلے کے دامان تک صدیوں سے رئیس قبیلے کے گاؤں اور مواضعات آباد رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں موضع مچر بُک کے شمالی کوہستان میں ایک قدیم موضع ''گزین'' کے نام سے موجود رہا ہے۔ جو بلیدئی رئیسوں کا قدیم موضع تھا۔ جب پورے مکران اور آس پاس کے علاقوں سے رند گروہ در گروہ وقفے وقفے سے مشرق کی طرف جا رہے تھے تو مذکورہ خشک اور بے آب و گیاہ کوہستان سے بھی کئی قبائلی گروہ اپنے مال مویشیوں کے ساتھ خیمے اکھاڑ کر رندوں کے پیچھے چل دیئے تھے۔ مذکورہ موضع گزین سے بھی رئیس قبیلہ کے باسی نقل مکانی کر گئے۔ جو کاہان میں بجارانیوں کی ہمسائیگی میں آباد ہوئے جہاں دیگر بلیدئی رئیس پہلے ہی سے موجود تھے۔ موضع گزین سے جانیوالا گروہ وہاں ''گزینی'' کہلائے۔ ممکن ہے کہ اس گروہ میں گزین نامی سرکردہ شخص بھی ہو جس کا ذکر ہتورام نے کیا ہے لیکن مکران میں بلیدئی رئیسوں کی روایت میں گزین شخص کا نام نہیں آتا۔ لیکن سہک، حاجی خان اور عمر کا نام آتا ہے۔

مذکورہ روایتوں کی روشنی میں یوروپی مصنفین کا بیان ایک مفروضہ معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے گزین اور گز میں مشابہت جوڑ کر بیان کیا ہے۔

حواشی:

1۔بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹئر مری بگٹی کنٹری، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 12-611۔

2۔"سیاہ آف" ڈیرہ بگٹی کا قدیم نام ہے۔ جہاں بگٹی مرکزہ کی آمد سے قبل بلیدئی، مزاری اور نوتھانی قبیلے آباد تھے۔نوتھانی قبیلہ کو بنیادی طور پر لسبیلہ سے آنے والا بلوچ قبیلہ کہا جاتا ہے۔اور لسبیلہ میں اسے جام عالی ہوت کی نسل سے روایت کیا جاتا ہے۔واضح ہو کہ جام عالی ہوت کا گھرانہ ہوت کے طائفہ "نوت" سے تھا۔اس طائفہ کے جدِّ امجد "نوحہ" کو "نوتک" بھی کہا گیا ہے۔

3۔تاریخ بلوچستان از رائے بہادر ہتورام مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 2009ء صفحہ 51۔

لمری/نومڑی/ٹھمردی

مردم شماری رپورٹ 1901ء لسبیلہ میں کہا گیا ہے کہ لسبیلہ کی اکثریتی آبادی قبیلہ لمری پر مشتمل ہے۔اس رپورٹ میں لمریوں کے چودہ طائفوں کا ذکر ہے۔جس پر لسبیلہ گزیٹئر کے یوروپی مرتب کنندگان نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اے ڈبلیو۔ ہیوگز نے اپنی کتاب "ملک بلوچستان" میں ریاست کے بڑے بڑے قبائل کو لمڑی کہا ہے لیکن گنتی کے کاغذات میں "لمڑیوں یا نمڑیوں" کا ذکر نہ پا کر ہمیں تعجب ہوا جبکہ پوٹنگر نے انیسویں صدی میں قلات کو دیکھا اور میسن نے ذرا بعد میں لکھا اور یہ دونوں افراد لمڑیوں کا ذکر کرتے ہیں اور پوٹنگر نے تو ان میں ہندوؤں کی بہت بڑی مشابہت دیکھی۔مزید لکھتا ہے کہ

" لمڑی لفظ کا ماخذ "ٹھہ مردی" بتایا جاتا ہے اور عجیب بات ہے کہ ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں کوہ کیرتھر (جو سندھ اور بلوچستان کے درمیان واقع ہے) کو ٹھہ مردی بلوچوں کا صدر مقام بتلایا ہے"(1)۔

آگے اپنی رپورٹ میں اس کا مرتب کنندہ "ہیوز بلر لکھتا ہے :

" سابقہ ایام میں اس کی کچھ بھی اہمیت ہو اب تو یہ
کلمہ تحقیر معلوم ہوتا ہے جہاں تک میں تصدیق کر سکا

یہ لسبیلہ کی آبادی کے لئے ایک عمومی اصطلاح نہیں
بلکہ حکمران طبقہ اسے اپنی رعایا کیلئے استعمال کرتا ہے
جو کاشت کار ہیں بمقابلہ ڈراریا اجری جو میدانی
چرواہے اور چپری یعنی مشرقی پہاڑی چرواہے ہیں
"۔(2)

یہاں پر ہم بھی مزید حیرت کا اظہار کریں گے کہ گزیٹر نے خود ہیوز بٹلر کے رپورٹ کا حوالہ دے کر کہا ہے کہ اس میں لمڑی قبیلہ کے چودہ طائفوں کی فہرست دی گئی تھی۔لیکن لسبیلہ گزیٹر میں کسی بھی قبیلہ کا ذکر "لمڑی" کے نام سے موجود نہیں ہے۔بنیادی قبائل میں سے بھی کسی کو لمڑی نہیں کہا گیا ہے اور جن پانچ راجوں یا قبائلی وفاقوں کے قبائل اور ان کے ذیلی طائفوں کی جو لمبی چوڑی فہرست دی گئی ہے یعنی رونجھا راج کے ارکان، شیخ راج کے ارکان، جاموٹ راج کے ارکان انکاریہ راج کے ارکان اور بڑہ (3) راج کے ارکان۔ان کے رُکن طائفے بالترتیب چھ (کل تعداد نفری 5381) (4)، سات (نفری 4904)، چھ (نفری 7879)، پانچ (نفری 3972ء) نو (نفری 4961) ارکان گنائے گئے ہیں۔ان راجوں کے علاوہ دیگر متفرق قبیلے انتالیس درج ہیں اور راجوں اور متفرق قبائل کی کل تعداد 56109 علاوہ ہندو (2069) بتائی گئی ہے۔مندرج راجوں اور متفرق قبائل میں کسی ایک شخص کو بھی "لمڑی" کے نام سے دکھایا گیا نہیں ہے۔ان مصنفین نے

بعض جگہ "لمڑی" کو "نمڑی" بھی کہا اور لکھا ہے۔لیکن دونوں ناموں میں سے کسی ایک کی بھی لسبیلہ کی آبادی میں نشاندہی نہیں کی ہے۔جو یہ ثبوت مہیا کرتا ہے کہ "لمڑی" نام کا کوئی قبیلہ نہیں ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔مردم شماری رپورٹ 1901 اور اے ڈبلیو ہیوز کا "لمڑی" قبیلہ کا تذکرہ شاید ایک غلط فہمی ہے۔کیونکہ قبائل کی تحقیق اور اندراج کے دوران کسی بھی شخص نے اس نام کو اپنانے کا دعویٰ نہیں کیا ہے یا شاید اس نام کا انکار کیا ہے۔جہاں اصطلاح "نمڑی یا نومڑی" کی بات ہے وہ ایک حقیقت ہے۔اور "نومڑی" کے نام سے ایک مخلوط گروہ موجود رہا ہے۔اور اس قبیلہ میں شیخ، انکاریہ، صابرہ، جاموٹ وغیرہ طائفے شامل رہے ہیں۔جب جام میر خان اور اُس کے بیٹے جام عالی خان لشکر جمع کرنے کیلئے ڈنڈو کے مقام پر چلا گیا اور گاؤں "نومڑ" سے لوگ جمع کئے (5) جبکہ اُس کے والد جام میر خان کے پاس "لاسیوں" کا لشکر تھا۔جام عالی نے اپنے باپ کے مخالف لاسیوں کو ساتھ لیا اور "نومڑیا قبیلہ کے اُن لوگوں مثلاً شیخ، انکاریا اور صابرہ جو جام میر خان کے طرفدار تھے، کے مال و مویشیوں کو لوٹ لیا۔"(6)

" اخبار الابرار" کے مصنف آخوند محمد صدیق کا مذکورہ بالا بیان سے یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ "نومڑ" علاقہ ڈنڈو میں ایک گاؤں تھا جہاں کے رہنے والے وہی قبیلے تھے جو لسبیلہ کے شہری مقامات کے مشہور قبیلے تھے یعنی شیخ، انکاریہ، صابرہ، جاموٹ وغیرہ۔اور محض گاؤں "نومڑ" کی نسبت سے "نومڑی" کہلاتے تھے۔اور

یہی قبیلے جو خاص لسبیلہ کے شہروں میں رہتے تھے۔ ''لس'' (7) کی نسبت سے لاسی کہلاتے تھے۔ چونکہ مذکورہ ''نومڑی'' اور ''لاسی'' مشترک قبائل کے اندراجات قبیلوں ہی کے نام سے ہو گئے تو نہ ''نومڑی'' کوئی قبیلہ رہا اور نہ ''لاسی''۔

اور ہیوز بلر کا یہ لکھنا کہ حکمران طبقہ اب اس نام کو اپنی پہاڑی اور چرواہے رعیت کے لئے تحقیراً استعمال کرتے ہیں تو یہ غلط نہیں ہوگا اس لئے کہ طبقاتی فرق تو معاشرے کو رنگ دکھاتا ہے۔ لسبیلہ کا شہری آسودہ اور خوشحال شیخ، جاموٹ، انگاریا وغیرہ حاکموں کے ہمنشین ہوتے ہیں اور اُن کے آپس کے کئی مفادات مشترک ہوتے ہیں اس واسطے وہ طبقہ معزز بن جاتا ہے جبکہ اسی شیخ، جاموٹ، انگاریہ وغیرہ کا پہاڑی چپرنشین چرواہا اپنی غربت اور محنت کی بنا پر پست خیال کیا جاتا ہے لہذا جنگلی گاؤں ''نومڑ'' کا باسی کیسے حقیر نہیں بنتا۔ اس طرح اُسی بالا طبقہ کے وہی لوگ ایک غربت کے مارے اور مفلوک الحال گاؤں ''نومڑ'' سے ہونے کے ناطے حقیر نومڑی بن جاتے ہیں۔

اب ہم آتے ہیں پوٹنگر کے نام ''لمڑی'' کے بتائے ہوئے ماخذ کی طرف جو کہ بقول اس کے ''نُمڑدی'' قبیلہ ہے۔ جس کا ذکر ابوالفضل نے اپنی تاریخ ''آئین اکبری'' میں کیا ہے۔ چونکہ بالا سطور میں ہم نے دونوں قبیلائی اصطلاحوں ''لمڑی'' اور ''نومڑی'' پر بحث کی تھی اور اس میں یہ ثابت کیا گیا کہ ''لمڑی'' ایک بے بنیاد اصطلاح اور ایک غلط فہمی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ ''نومڑی'' ہی کو

''لمڑی'' تلفظ کر چکے ہوں جس کا تقریباً سو فیصد امکان ہے۔ اور میں حقیقت بھی اسی کو سمجھتا ہوں۔ رہا ''نومڑی'' تو وہ بھی ثابت ہوا کہ بعض قبائل ''نومڑ'' گاؤں کے باسی ہونے کی نسبت سے نومڑی کہلاتے رہے ہیں۔ جو موجودہ زمانے میں متروک ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ ہنری پوٹنگر کا خیال غلط اور ایک مفروضہ ہے۔ ابوالفضل کا نُمڑدی قبیلہ کا مرکزی قبیلہ یا مرکزہ بلفت بلوچ قبیلہ رہا ہے۔ جس کی متعدد شاخیں یعنی طائفے جہلاوان، سراوان اور سندھ کی مغربی سرحد پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان قبائل میں بلفت (سندھی میں بُرفت) مرکزہ کے علاوہ گنگہ، پُھنڈ، ساسولیوں کے کئی طائفے، جھوکیہ، بجرہ، بیزنجو اور اس کے کئی طائفے، سیاہ پاد، مردوئی وغیرہ شامل ہیں۔ (8)

حواشی:

1۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹئر، لسبیلہ ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 452۔

2۔ ایضاً۔

3۔ ''بجرہ'' قبیلہ بُلفت (سندھی میں بُرفت) قبیلہ لسبیلہ کا سردار گھرانہ رہا ہے۔ جو رونجھا دور اقتدار میں کوٹڑی کے مقام سے پب کی پہاڑیوں میں آبسے تھے جو رفتہ رفتہ اتھل آکر بس گئے۔ لسبیلہ گزیٹئر میں انہیں سندھ کے قبیلہ سمّہ کی اولاد کہا گیا ہے۔ جو بالکل غلط ہے وہ اپنے کو بلفت قبیلہ ہی سے کہتے ہیں اور ان کے شجرہائے نسب بھی بلفت شخصیتوں تک پہنچتے ہیں۔ بلفت قبیلہ ان نُمڑدیوں سے ہے جن کا ذکر ابوالفضل

نے آئین اکبری میں ''مہر دی بلوچ'' کے نام سے کیا ہے جو خضدار کے مشرق میں سلسلہ کیرتھر کی مُولہ پہاڑی وادیوں میں مقیم تھے۔ تاریخ بلوچستان میں رائے ہتورام نے بھی بلفت قبیلہ کو ''بلفت بلوچ'' لکھا ہے۔ (مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 2009ء صفحہ 347) اسی طرح سندھی مورخ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور ''جنت السندھ'' کے مصنف مولائی شیدائی نے اس قبیلہ کو بلوچ قبیلہ لکھا ہے۔ اس قبیلہ کے جدامجد کا نام ''ہوت ابوالفتح بلوچ'' تھا۔ جیسے کہ نوابان جام نگر کے دستاویزات میں درج کیا جاتا ہے۔ پچھلے صفحات میں اس قبیلہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

4۔ مذکورہ اعداد وشمار مردم شماری رپورٹ 1901ء، ری پرنٹ 2001ء از حکومت سندھ، کراچی سے لی گئی ہیں۔

5۔ آخوند محمد صدیق کی ''اخبارالابرار'' کا اردو ترجمہ ''بنام تاریخ خوانین قلات'' از میر گل خان نصیر مطبوعہ نساء ٹریڈرز، کوئٹہ 1984ء صفحہ 226,224۔

6۔ ایضاً۔

7۔ ''لس'' کی نسبت سے ساکنان کو ''لسی'' ہونا چاہیے تھا نہ کہ ''لاسی''۔ لیکن حقیقت میں اصل لفظ ''لاسی'' ہی ہے اور مقام کا نام ''لس بیلہ'' غلط تلفظ میں ادا کیا جارہا ہے اصل نام ''راس بیلا'' ہے جس کا ذکر قدیم فارسی اور عربی تواریخ میں بھی ہے۔ ''راس'' عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ''سر'' یا چوٹی کے ہیں مراد اونچی جگہ جو سطح زمین سے بلند ہو۔ اور خشکی کا وہ ٹکڑا یا قطعہ جو پانی میں دور تک چلا گیا ہو۔ بلوچی زبان میں اس کا

مترادف لفظ ''پینٹ'' ہے جیسے راس شمال بندر، راس جُڈی، راس مواری، راس کچاری، راس ملان وغیرہ۔ قدیم زمانے میں ''بیلا'' ساحل کے قریب ہوتا تھا اور اس کا نام ''راس کاہیرہ'' بیلا ہوتا تھا۔ جسے بعد کے ادوار میں کانہیارو کوٹ اور کہیر و کوٹ بھی تلفظ کیا جاتا رہا ہے۔ پھر اس کا نام ''کاہیرہ بیلا'' کتابوں میں ملتا ہے۔ پھر ''کاہیرہ بیلا'' کا نام وقت کے ساتھ ساتھ پس منظر میں چلا گیا۔ اور فقط ''راس بیلا'' لوگوں کی زبان پر رہ گیا۔ اِسی ''راس بیلا'' کو بعد میں ''لسبیلہ'' تلفظ کیا گیا۔ عوامی نام ''لاسی'' ظاہر کرتا ہے کہ یہ اس وقت سے مشہور کرآرہا ہے جب لفظ ''راس'' مستعمل رہا ہے۔ ''لس'' کی تبدیلی بعد میں ہوئی ہے۔ لفظ ''بیلا'' کو موجودہ زمانے میں ''بیلہ'' لکھا جاتا ہے جس کے معنی لس بیلہ گزیٹر میں ''میدان'' کے بتائے گئے ہیں۔ جو کہ بالکل غلط ہے۔ جبکہ ہتورام نے اپنی تاریخ میں اسے سندھی کا لفظ بتا کر اس کے معنی جنگل کے بتائے ہیں۔ (لس بیلہ گزیٹر: مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 1997ء صفحہ 402 اور ''تاریخ بلوچستان از ہتورام مطبوعہ نساء ٹریڈرز کوئٹہ 2009ء صفحہ 346)۔ لیکن جنگلوں کے بھی نام ہوتے ہیں اور کوئی جنگل بے نام نہیں ہوتا۔ لس بیلہ کی وجہ تسمیہ کی ذیل میں لکھتے ہیں کہ :

> '' ابتدا میں اِسے اقوام لاسی یا لومڑی از اقوام جدگال نے آباد کیا تھا۔ اس واسطے اِس کا نام لس بیلہ مشہور ہوگیا۔'' (صفحہ 346)

ہتورام کا استدلال غلط اور مضحکہ خیز ہے۔ ''لاسی'' سے لس بیلہ نہیں بنتا بلکہ جیسے کہ ہم نے لکھا ہے ''راس'' کو ''لاس'' تلفظ کر کے اسی نسبت سے ''لاسی'' اصطلاح بن گئی ہے۔ اور جو معنی لفظ ''بیلا'' کو یوروپی مصنفین اور ہتورام نے دیئے ہیں وہ سراسر غلط ہیں۔ واضح ہو کہ یہ نام ''بیلہ'' نہیں ''بیلا'' ہے جو ایک قدیم ''گجر'' قبیلہ تھا۔ اور یہ گجر طائفہ یا قبیلہ آج بھی کشمیر اور بحرہ کیسپائن کے سرحدی علاقوں میں موجود ہے۔ سندھی تاریخ چچ نامہ میں بھی بتایا گیا ہے کہ بیلہ کی قدیم آبادی گجروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ''کاہیرہ'' قبیلہ آج بھی پنجاب کے جاٹ قبائل میں موجود ہے شاید یہ بھی گجروں سے آ کر جاٹ قبائل میں بس گیا ہو۔ بہرحال حقیقت یہی ہے کہ یہ شہر بیلا گجروں نے آباد کیا اور انہیں کے نام سے معروف ہوا۔ چونکہ ساحل کے قریب سطح سمندر سے بلند مقام پر واقع تھا اس لئے عربوں نے جن کی پورے علاقے پر بالادستی تھی اسے ''راس بیلا'' کہا۔ شاید بیلا گجروں کا اکثریتی اور بالادست قبیلہ کاہیرہ تھا اس لئے یہ شہر ''راس کاہیرہ بیلا'' کہلایا اور آخرکار راس بیلا کے نام سے معروف ہو گیا۔ یہاں یہ تذکرہ ضروری ہے کہ موجودہ ''بیلہ'' شہر کا قدیم نام ''ارمن بیلا'' ہوتا تھا۔ جسے بعض تاریخی کتابوں میں ''ارمابیل'' لکھا گیا ہے۔ محققین نے یہ تحقیق نہیں کی ہے کہ کیا واقعی دونوں نام اسی ایک گاؤں کیلئے استعمال ہوئے ہیں یا یہ دو مختلف مقامات رہے ہیں۔ کیوں کہ علاقہ جہلاوان اور لورلائی اور بعض دیگر کوہستانوں میں ''بیل'' کے لاحصہ کے ساتھ کئی مواضع کے نام ملتے ہیں جو اب ندیوں کے ناموں پر ہیں۔ جیسے پشی بیل،

مشک بیل، پٹھام بیل، منج بیل، ولبیل، تمبیل وغیرہ۔ مذکورہ نام ''ندیوں'' کے نام ہیں لیکن ان ناموں کا جو سابقہ ہے وہ سوائے ''پشی'' (کنر، جھڑبیری درخت) کے سب قبیلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ قیاس یہی ہے کہ لفظ بیل کے معنی ندی کے ہوں گے۔ لیکن موجودہ بولی جانے والی زبانوں میں یہ لفظ کسی زبان کا نہیں ہے۔

8۔ دیکھئے اشاریہ نمبر 4 اور موضوع ''بیزنجو'' کا اشاریہ نمبر اور موضوع ''بُزکوہی'' کا اشاریہ نمبر 3۔

مکران

مکران، جس کا کسی زمانے میں ایک بڑا حصہ "ملک بلوچ" کہلاتا تھا، موجودہ وقت میں ایران و پاکستان کے زیر انتظام بلوچستان کے ایک بڑے خطے پر مشتمل ہے۔ کسی وقت یہ ایک خودمختار مملکت ہوتا تھا۔ اور بلوچ تہذیب وتمدن کا خالص ترین علاقہ ہوتا تھا۔ 48-1947ء تک بیالیس ہزار پانچ سو ساٹھ کلومیٹر رقبہ کے ساتھ اس کے حدود درج ذیل تھے:

" مشرق میں جہلاوان اور لس بیلہ، شمال میں کوہ
سیاہان کا سلسلہ اور اس کے علاقے، مغرب میں ملک
فارس اور جنوب میں بحر بلوچ۔ مشرق میں جہلاوان
کے ضلع خضدار میں واقع فیروز آباد کا کوہ سمند اس کی
مشرقی سرحد ہوتی تھی، لس بیلہ کی طرف میانی حور کا
بُریدہ لک اس کی سرحد ہوتی تھی (1) راگئے اور
رخشان کی طرف "شیرینزہ" اور شمال مغرب کی سمت
کوہک قلات، جنوب مغرب میں سیرآف اور تیز اس
کے حدود میں ہوتے تھے جبکہ مغرب کی سمت یہ
حد کرمان تک پھیلا ہوتا تھا۔

عرب مصنف یاقوت حموی بغدادی نے اپنی تصنیف "معجم البلدان" میں مکران کا حدود اربعہ اس طرح درج کیا ہے۔

" اس ملک کے شمال میں
سیستان، جنوب میں بحرہ عرب، مشرق میں
ہندوستان (2) اور مغرب میں کرمان واقع
ہیں۔"

مندرجہ بالا حدود ساتویں صدی عیسوی کے ہیں۔ ایک اور مورخ مولانا نور احمد خان فریدی مختلف تاریخی حوالوں سے لکھتے ہیں:

ماضی بعید میں سندھ کے دریا سے
لے کر خلیج عرب تک اور کندھار (3) سے
بحرہ عرب تک مکران ہوتا تھا۔ (4)

تواریخ میں ملک مکران کے مختلف ادوار میں مختلف دارالحکومت رہے ہیں۔ کبھی اس کا مرکز تیس ہوتا تھا جسے عربوں نے "تیز" بھی لکھا ہے، کبھی یہ دارالخلافہ "بمپور" منتقل ہوا ہے جو سکندر اعظم کے زمانے کا "پُھرا" ہوتا تھا۔ جسے ایرئین اور دیگر مصنفین نے اس وقت کے گڈروشیا کا دارالحکومت لکھا ہے (5) کسی دور میں "کیچ" اس ملک کا دارالخلافہ دکھائی دیتا ہے اور کبھی کتابوں میں "پنجگور" اس کا حکومتی مرکز نظر آتا ہے جسے عرب وقائع نگاروں نے "قنزبور" لکھا ہے جو کہ پنجگور ہی کا

معرب ہے۔ ایک دو جغرافیہ نویسوں نے اس نام کو ''کنزبون'' لکھا ہے جو کہ یقیناً کتابت ہی کی غلطی ہے یا پھر مصنّف نے اِس نام کو غلط سُنا اور غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی تحقیق نہیں کی۔ اور یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے اپنی تصانیف میں تحقیق کی عرق ریزی سے پہلوتہی کی ہے اور سُنی سنائی سرسری واقعات پیش کئے ہیں۔ ایک تصنیف ''کتابچہ ایران'' میں مغربی مکران کے بارے میں تحریر ہے:

''مکران ایک وسیع و عریض اور بڑا ملک ہے جس
کا دارالخلافہ بمپور ہے۔ اس ملک کے لوگوں کی
زبان بلوچی ہے اور رستم جو شاہنامہ میں مذکور
و معروف ہے اِسی ملک کا باشندہ تھا۔''

اس پھیلے ہوئے وسیع ملک کے بلوچ دو مکرانوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو ابتدائی دور میں دو موضع ہوتے تھے اور ایک دوسرے سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ہوتے تھے۔ مغربی مکران والے ''تیز یا تیس'' کو قدیم مکران کہتے ہیں جس کے قدیم ڈھیریوں پر تیس نام کا موضع آباد ہوا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ہزاروں سالوں سے جو بھی بلوچ تیس جاتا ہے یا وہاں سے آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مکران گیا ہوں یا مکران سے آیا ہوں، وہ تیس نام کا استعمال کبھی نہیں کرتے۔ اس سے اُن مصنّفین کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے جنہوں نے تیس کو ایک زمانے میں مکران کا دارالحکومت لکھا ہے۔

دوسرے مکران کا تذکرہ زیادہ تر کیچ کے نام کے ساتھ آتا تھا یعنی کیچ مکران۔ قدیم بلوچی شاعری اور بعض سیاحوں کے تذکروں میں بھی یہی نام اکھٹے استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن مورخین نے ان مکرانوں کی الگ الگ حیثیت کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

کیچ کے نام کے ساتھ جس مکران کا نام لیا گیا ہے وہ کیچی دشت کے گاؤں گنزی سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر رہا ہے جو موجودہ وقت (2005-6) میں ایک پھیلے ہوئے کھٹے پھٹے میدان کی صورت میں ہے جس کا مرکزی مقام ایک قدیم ویران اور ایک حصّے سے جلا ہوا ٹیلہ ہے جو ''دیول'' (6) کہلاتا ہے۔ مذکورہ میدان جسکی سطح کے نیچے قدیم انسانی آبادی کے دور دور تک پھیلے ہوئے آثار ہیں آج بھی ''مکران'' کا نام لئے ہوئے ہے۔ اس کے موجودہ حدود اس طرح ہیں:

جنوب کی طرف دشت ندی، مشرق کی طرف
گنٹ دار (7) گاؤں، قدرے فاصلے پر، مغرب کو
''کچر ء ہوکین'' اور شمال کی طرف صبیر نامی ٹیلہ
ہے (8) جو ''مکران'' نامی میدان کے اندر ہے۔

قیاس یہی ہے کہ اپنے آباد اور زندہ دوَر میں اِس مکران کے حدود بھی وسیع تھے اور شاید ''کیچ'' کا علاقہ اسی کے انتظامی یا علاقائی حدود میں واقع تھا اور اسی کا حصّہ ہونے کی وجہ سے ''کیچ مکران'' کہلاتا تھا۔ اور ممکن ہے کہ وہ دارالخلافہ بھی اسی مکران کا ہو جیسے کہ بعض تواریخ میں مذکور ہے کہ مکران کا دارالحکومت ''کیز'' (کیچ کا معرّب) ہے۔

اور بھی کچھ زمانے بعد یہ دارالحکومت "حمز بور" (پنجگور کا معرب) بن جاتا ہے۔ کیوں کہ مغربی مکران کا تیس، کیچ اور پنجگور سے سینکڑوں میل دور رہا ہے۔لیکن تواریخ میں "مکران کا ملک" ایک ہی وسیع وعریض ملک دکھایا گیا ہے اور حدود میں کہیں تقسیم نظر نہیں آتا۔آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے شاید دشت کا مکران ویران ہوا کیوں کہ ایک تو یہاں بارش نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور سارا سال دھول اڑتی رہتی ہے، اِسی مسلسل ریت باری نے بیسویں قدیم آثار زمین کی سطح سے روپوش کر دیئے ہیں۔اور اگر کبھی برسات ہو اور سیلاب آئے تو دشت ایک سمندر بن جاتا ہے اور دشت ندی اپنے کناروں پر بسے گاؤں کے گاؤں بہالے جاتا ہے۔دشت کے قدیم قبائل کی اکثریت کیچ کے علاقے میں جا بسے ہیں۔اور بعض گوادر اور جیونی بلکہ سندھ اور کراچی تک نقل مکانی کر چکے ہیں۔اور وہ جہاں بھی آباد ہیں ان کے جدّی پشتی اراضیات اِسی دشت میں واقع ہیں۔یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ماضی بعید میں دشت کی زرخیز مٹی کی سرزمین ایک بہت بڑی انسانی آبادی کا مرکز رہا ہے۔جہاں بیسویں مقامات پہ غیر ملکی اور خصوصاً عرب شہداء کے لمبے لمبے پتھروں کے سادہ اور منقش کتبے لگے خستہ حال قبریں نظر آتی ہیں۔اور پہاڑیوں کے اوپر اور دامان میں چھوٹے بڑے ویران قلعوں کے تباہ شدہ آثار ہیں جن میں سے اکثر کے نام بھی ہیں۔ان قدیم آثار کے علاوہ پہاڑیوں کی چوٹیوں اور ان کے درمیانی ڈھلانوں پر زرتشتی دین کے پیروکاروں کے خاندانوں کی پتھریلی قبریں سینکڑوں کے حساب سے پھیلی ہوئی ہیں۔جنہیں مقامی لوگ "ڈمب کوہ" کہتے ہیں(9)

" مکران" نام کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مورخین نے طرح طرح کی خیال آرائیاں کی ہیں اور مختلف مفروضے گھڑے ہیں۔یوروپی مصنّفین نے مکران گزیٹیر میں لکھا ہے:

> " شمس العلماء جے۔جے۔مودی نے اپنے ایک مضمون میں جو "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں مئی 1904ء میں چھپا ہے، کہا ہے کہ اسے یہ نام حمزہ (10) نے دیا ہے جو "ماہ کران" ہے۔ماہ کے معنی "گاؤں" (11) ہیں جو سمندر کے ساحلوں (کران) پر واقع ہے۔اُس نے عرب مصنّفین کی تحریروں کا بھی حوالہ دیا ہے جن کے مطابق یہ موکران بن فارک بن سام بن نوح کے نام پر ہے۔"(12)

مسٹر تھامس ہولڈچ، ڈاکٹر بلیو اور اولیور سینٹ جان اس نام کو فارسی لفظ "ماہی خوران" کی بگاڑ بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ سکندر کے زمانے کے یونانی بھی اسے "اِچتیو پگوئی" کہتے تھے جس کے معنی بھی "ماہی خوران" کے بنتے ہیں(13) جبکہ لارڈ کرزن اِس نام کو ایک دراوڑی لفظ کہتا ہے جو "وراہ مہیر" کے "برہ ہیت سنہتا" میں "موکارا" کے نام سے درج ہے۔ایک اور یوروپی مصنّف میجر سائیکس "پرشیا" میں لکھتے ہیں کہ یہ نام سنسکرت زبان کا لفظ ہے جو "مکاارینا"

ہے جو بقول اُس کے ''ویران اور غیر آباد'' کے معنی دیتا ہے۔ ان کے مطابق یہی ''مکا اِرینا'' بگڑ کر مکران (MAKKARAN) بنا ہے یعنی ماکاؤں کی غیر آباد یا خشکاوہ زمین۔ پھر وہ اپنی سچائی کی سند سندھ میں ''مکران'' نام کو تلفظ کرنے کی دیتا ہے کہتا ہے کہ سندھ میں اسے مک※ران (MAKRAAN) بولا جاتا ہے جو درحقیقت مکا اِرینا (MAKA IRINA) کا اظہار ہے۔(14)

مذکورہ بالا تمام بیانات تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ خیال آرائیاں اور مفروضے ہیں اور مواضع کے اسماء فرض نہیں کئے جاسکتے کیوں کہ ان کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی تاریخ ہوتی ہے جس تک پہنچنے کیلئے تحقیق کرنے کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ ہر نام کو کسی ملتے جلتے لفظ کا بگاڑ کہہ کر اس کی تاریخ تک پہنچا جاسکتا ہے۔ ممالک و مواضع کے اسماء دراصل کسی نہ کسی دور کے کسی نہ کسی قبیلہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہ قدیم قبائل کے باقیماندہ آثار ہوتے ہیں۔ جو قوم یا قبیلہ تاریخ کے کسی بھی دور میں جس مقام پر آباد تھا اور اُس پر تصرف رکھتا تھا وہ موضع یا مقام اُس کے نام سے مشہور ہوتا تھا۔

''مکران'' کا اصل اور قدیم ترین تلفظ ''مُکر ان'' (MUKKURAAN) ہوتا تھا۔ قدیم تحریروں میں بھی یہی ملفظ ملتا ہے۔ معروف عربی تصنیف ''معجم البلدان'' میں بھی مُکر ان کا تلفظ ملتا ہے۔ اور بلوچ صدیوں سے پیش (ُ) کی جگہ زَبر (َ) کے معمولی اختلاف سے مُکر ان بولتے ہیں جو سینکڑوں سالوں کے استعمال سے ایک ذرّہ

برابر بھی نہ بگڑا ہے۔ یہ نام ''جمع'' کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یعنی مُکر ان نام یا اصطلاح ''مُنکر'' کی جمع ہے۔ جس سے ''مُنکر لوگ'' یا ''مُنکر قوم'' کا مفہوم نکلتا ہے۔ ''مُنکر'' ایک قدیم ''تُرک'' قبیلہ ہوتا تھا جو نہ صرف مشرقی مکران کے دشت میں آباد تھا بلکہ مغربی مکران کے تیز بندر پر بھی آباد تھا۔ جو مذکورہ قوم یا قبیلہ کے نام پر مشہور ہوئے۔ جوں جوں مذکورہ قدیم مواضع میں آبادی بڑھتی گئی توں توں ان کے حدود پھیلتے گئے۔ مُنکر قبیلہ، افغانستان میں بھی آباد تھا۔ جہاں اُس کے نام پر ایک موضع مُنکر ہے۔

بعض علاقوں میں قبیلوں کے نام واحد صورت میں نظر آتے ہیں اور بعض جگہ بصورت جمع ملتے ہیں۔ ایسا بھی ملتا ہے کہ ایک ہی قبیلہ کا نام ایک علاقے میں واحد کی صورت میں ہے اور قدرے فاصلے پر جمع کی صورت میں نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک گوجر قبیلہ ''کُھڈ'' ہے جو لس بیلہ اور مکران میں کسی زمانے میں بود و باش رکھتا تھا۔ لس بیلہ میں قدیم غاروں کے شہر، شہر روغان کے قریب یہ قبیلہ کسی زمانے میں آباد تھا اور اس کا مسکن اُس کے نام سے کھڈ کہلاتا تھا۔ وہ موضع تو زمانے کے حوادث کی نظر ہو گیا ہے لیکن اُس کا نام اس موضع کی نڈی پر آج تک برقرار ہے۔ اور ''کُھڈ'' ندی کہلاتا ہے۔ اسی بلوچستان کے کچی دشت میں اِس قبیلہ کا قدیم مسکن جمع کی صورت میں ''کُھڈ ان'' کہلاتا ہے۔ اسی قبیلہ کا دوسرا مسکن ایرانی بلوچستان کے ''سرباز'' کے بالمقابل تھا جو آج تک ''کُھڈ ان'' کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک

فارسی زبان کا اثر نہیں پہنچ سکا وہاں قبائل کا نام واحد صورت میں ملتا ہے اور جہاں تک فارسی زبان کا اثر پہنچ گیا وہاں قبیلہ کے نام نے جمع کی صورت اختیار کر لی۔ اور فارسی ایسے علاقوں میں حکمرانوں کی سرکاری زبان ہوا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے مکران کا نام بھی ہمیں جمع کی صورت میں ملتا ہے۔ یہی نام ہمیں کشمیر اور افغانستان میں واحد صورت میں ملتا ہے جو یقیناً فارسی زبان کی بالادستی سے قبل کی آبادکاری معلوم ہوتی ہے۔

مذکورہ "مُنکر" قبیلہ موجودہ وقت میں بلوچستان میں کہیں نظر نہیں آتا جو یقیناً مقامی بڑے قبائل میں مدغم ہو کر بے نشان ہو گیا مگر صدیوں پرانا یہ قبیلہ پنجاب، انڈیا اور کشمیر میں موجود ہے۔ پنجاب میں اس کے گھرانے گوجر قبیلہ میں پائے جاتے ہیں۔ یہ قبیلہ کس زمانے میں بلوچستان میں نقل مکانی کر آیا تھا؟ کوئی نہیں جانتا۔ قیاس یہی ہے کہ جس زمانے میں کشمیر اور ہندوستان اور پنجاب سے بے حساب جاٹ قبائل بلوچستان میں پھیل چکے تھے اور عراق میں تک اپنے مواضع قائم کر چکے تھے، منکر قبیلہ بھی شاید اسی نقل مکانی کا حصہ رہا ہو۔

وسطی ایشیا اور خراسان کے خطوں سے ترک قبائل کے خروج کے بارے میں گینکوفسکی نے اپنی تصنیف "پاکستان کی قومیتیں" (اردو ترجمہ) میں چینی سیاح سیوآں تسانگ جس نے 629-645ء کے دوران ہندوستان کا سفر کیا تھا، کے حوالہ سے برصغیر کی شمال مغربی سرحدات پر تُرکوں کی آمد کا ذکر کیا ہے جو پانچویں صدی عیسوی کے بعد آتے گئے اور کئی ملکوں پر اپنا اقتدار قائم کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ بعد میں

جنوبی تُرکستان اور شمالی افغانستان سے تُرک مسلسل وادی سندھ میں بھی داخل ہوئے تھے ان کا تعلق اُوغز اور خلج قبائل سے تھا۔ واضح ہو کہ یورپی محققین نے مکران کے اکثریتی قبیلہ "رئیس" کو بھی اوغز ترکوں سے بتایا ہے۔ اگرچہ رئیس معتبرین کو اپنے ماخذ "اوغز" کے بارے میں آگاہی نہیں ہے لیکن وہ اپنے کو تُرک ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا حوالہ جات اور ان کے تجزیہ سے یہ قیاس کرنا مشکل نہیں ہے کہ اسی زمانے کے آس پاس مُنکر ترکوں نے بھی مکران میں اپنے گاؤں بسائے ہوں گے اور "مکران" نام کی صورت میں اپنی ایک مستقل یادگار قائم کر دی۔ ان ترکوں نے علاقے کی قدیم بلوچی زبان کو اپنی ترکی زبان کے سینکڑوں الفاظ اور نام دیئے اور رفتہ رفتہ اسی زبان کو اپنایا۔ جو پھر "مکرانی" زبان کے نام سے مشہور ہوا۔ منکر قبیلہ نے قدیم بلوچی دستکاری خصوصاً قالین بافی میں بہت نام پیدا کیا۔ ان کے بنائے ہوئے خوبصورت نقش و نگار سے مزین قالین ان کی نسبت سے "منکری" کہلاتے تھے جن کی بادشاہوں اور حکمرانوں کے ہاں بہت مانگ ہوتی تھی۔

مذکورہ بالا جائزے سے ثابت ہوتی ہے کہ مکران کا نام نہ ما کا ایریا تھا، نہ ماہ کران اور نہ ماہی خوران۔ بلکہ قبیلہ "منگر ترک" کے نام پر مکران رہا ہے۔ "مکران" کے علاوہ باقی تمام اسماء مفروضہ اور بے بنیاد قیاس آرائیاں ہیں۔

حواشی:

1۔سندھ کے معروف بلوچ محقق مولائی شیدائی نے اپنی تصنیف ''سرزمین بلوچ'' کے صفحہ 153 کے حاشیے میں لکھا ہے کہ علاقہ طبری نے مکران کی آخری سرحد ''دیبل'' دکھایا ہے۔اس طرح کراچی کا علاقہ بھی مملکت مکران کا حصّہ ہوتا تھا۔

2۔''مشرق میں ہندوستان'' سے مراد ''سندھ'' رہا ہے۔

3۔یادرہے کہ جس زمانے کی بات مولانا فریدی صاحب نے کی ہے اس زمانے میں مستونگ سے کندھار اور آگے بُست خطے تک ایک بلوچ ملک بنام ''بیلوس'' ہوا کرتا تھا جسے بعض ترک ''بلیوس'' بھی کہتے اور لکھتے رہے ہیں۔نیز نام ''کندھار'' ایک بلوچ قبیلہ کا نام تھا جس کے مواضع بولان اور پنجگور کی وادی گچک میں بھی رہے ہیں۔ جن کے نام ابھی تک قائم ہیں۔

4۔بحوالہ ''بلوچ قوم اور اس کی تاریخ'' از مولانا نور احمد خان فریدی۔مطبوعہ ادارہ بلوچی دنیا'' ملتان، پنجاب۔

5۔دسٹرکٹ گزیٹرز آف بلوچستان، مکران ڈسٹرکٹ ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 1997ء واضح ہو کہ سکندر اعظم، مکران سے 325 قبل مسیح میں گذرا تھا جب کہ یہ خطہ ''گڈروشیا'' کہلاتا تھا۔

6۔''دیول'' ایک قدیم قبیلہ تھا جس نے سندھ میں ''دیبل'' بسایا تھا۔دونوں ایک ہی نام کے دو تلفظ ہیں۔روایتوں میں بعض اس قبیلہ کو تُرک بتاتے ہیں اور بعض اسے

ہندی قبیلہ بتاتے ہیں۔مکران میں اسے ترک قبیلہ بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مکران نامی گاؤں جو دشت کیچ میں واقع تھا اور اس کا مرکزی مقام یہی دیول کا موضع تھا، جب طوفان باد و باراں، قحط مسلسل اور بیرونی حملہ آوروں کی جارحیتوں سے برباد ہوا تو دیول قبیلہ کے لوگ یہاں سے نقل مکانی کر گئے اور سندھ میں اپنے نام کا دوسرا گاؤں بسایا جو وہاں ''دیبل'' کے نام سے مشہور ہوا۔جبکہ دوسرا خیال یہ ہے کہ محمد بن قاسم کے دیبل پر حملہ کے نتیجے میں دیبل قبیلہ کے لوگ وہاں سے نقل مکانی کر کے مکران کے کیچی دشت میں آ کر آباد ہوئے اُن دنوں وہاں پر ''مکران'' نامی ایک مرکزی شہر موجود تھا۔

کیچی دشت میں دیول نام کے دو مقامات ہیں۔ایک میدانی علاقہ ہے جو ''دیول'' کہلاتا ہے۔دوسرا ایک بلند و بالا پہاڑی ٹیلہ ہے جس کے اوپر اور دامان میں وسیع رہائشی آثار پھیلے ہوئے ہیں۔یہ قبیلہ انڈیا میں آج بھی موجود ہے جس میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔وہاں یہ ''دیول'' ہی کہلاتے ہیں۔

7۔''کُنٹ دار'' کیچی دشت کا ایک گاؤں ہے۔جسے ایک قدیم ہندی قبیلہ کُنٹ نے بسایا تھا۔ ''دار'' یا ''دارک'' بلوچی میں ڈیرہ کو بولتے ہیں۔کنٹ قبیلہ موجودہ وقت میں مکران میں معدوم ہے لیکن کشمیر میں بڑی تعداد میں اب بھی وجود رکھتا ہے۔کشمیری اس قبیلہ کے جدامجد کا نام میر محمد حسین کابلی کو بتاتے ہیں۔اور اسے کشمیر کا ایک قدیم قبیلہ بتاتے ہیں۔اس قبیلہ کے معتبرین اپنے نام میں ''خواجہ'' اور ''میر'' بطور سابقہ

لگاتے ہیں۔ خواجہ نامی تُرک قبیلہ بھی ہے جسے مغل کہا جاتا ہے لیکن قبیلہ کی نشاندہی کی صورت میں دونوں اصطلاح بطور لاحقہ استعمال ہوتے ہیں، بطور سابقہ نہیں۔ کتاب ''تواریخ اقوام کشمیر'' میں اس کے مصنّف محمد دین فوق لکھتے ہیں۔

" پنجاب میں جو خاندان اپنے نام سے پہلے میر لکھتے ہیں وہ سید اور مراثی ہیں۔ اور کشمیر کے ''میر'' جو اپنے نام کے آخیر میں میر لکھتے ہیں وہ قبیلہ ''میر'' سے ہیں جو مغل قوم ہے اور کشمیر میں ''مغل میروں'' کے علاوہ کوئی دوسرا میر نہیں ہے۔'' صفحہ 378)

کشمیر میں احمد شاہ ولد محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے میں میر محمد مقیم کنٹ اور میر فقیر اللہ کنٹ نامی گرامی درباری شخصیتیں گذری ہیں۔ اس قبیلہ کے دو اور نامور بزرگ میر محمد جعفر کنٹ اور نور ابابا کنٹ کشمیر کی برگزیدہ ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

8۔ ''صبیر'' نامی ٹیلہ کوئی بڑا ٹیلہ نہیں ہے اور اس کے آس پاس کے بکھرے آثار بھی زیادہ پھیلے نظر نہیں آتے۔ اس علاقے میں ریت باری کے تسلسل نے زمین کی سطح کے اکثر آثار مٹی میں دبا دیئے ہیں۔ اور آثار قدیمہ کے مجاہدین نے اس علاقے کا کبھی رخ نہیں کیا۔ اس لئے ساری طویل قدامت دبتی جا رہی ہے۔ نام ''صبیر'' یا ''صبیر'' سے قیاس یہی تھا کہ شاید یہاں کوئی عرب قبیلہ آباد ہوا ہوگا۔ لیکن کافی مطالعہ سے بھی ہمیں عربوں میں یہ نام نہیں ملا۔ یہ نام صرف ایک تاریخی فاتح تیمور لنگ برلاس تاتاری

کے نام کے ساتھ استعمال ہوتا ہوا دیکھا۔ جیسے ''آقائے صبیر'' اور ''صاحبقران'' کہا گیا ہے۔ اُسے ''آقائے صبیر'' کیوں کہا گیا ہے اس کی وضاحت کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔

9۔ لفظ ''دمبہ کوہ'' کے معنی پہاڑی خرابے ''یا پہاڑی ویرانے یعنی پہاڑیوں پر اور ان کے ڈھلانوں پر باقی رہنے والے قدیم آثار۔ یہ آثار یعنی دمبہ کوہ پورے بلوچستان میں سب سے زیادہ مکران کے ضلع کیچ کے پہاڑوں پر نظر آتے ہیں۔ ان کے بارے میں مکران گزیٹیر نے تھامس ہولڈچ کے ایک مضمون کے حوالے سے جو ''جرنل آف دی رائل جیا گرافیکل سوسائٹی'' کے جلد ہفتم میں ''نوٹس آن اینشینٹ اینڈ میڈیول مکران'' کے عنوان سے اپریل 1896ء میں چھپا تھا، لکھا ہے کہ جب میسولو پٹیمیا سے ماقبل سامی دراویڈی نسلیں، سامیوں کے دباؤ کی وجہ سے ہندوستان کی طرف بتدریج نقل مکانی کر گئے تو انہوں نے (مکران سے) گذرتے ہوئے اپنے خاندان کے نمائندے مکرانی پہاڑوں میں چھوڑے۔ انہوں نے مکران کے دامان کوہ میں چھوٹے چھوٹے عجیب و غریب پتھر کے بنے ہوئے گھروندے چھوڑے ہیں جو گروہوں یا قصبوں کی صورت میں ہیں اور ان پہاڑیوں کو دمبہ کوہ کا نام دیتے ہیں۔ یہ ان کے خاموش دستاویزات ہیں'' (ڈسٹرکٹ گزیٹیرز آف بلوچستان مکران ڈسٹرکٹ مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء)

ہولڈچ کے کہنے کے برعکس یہ گھروندے دامان میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ زیادہ تر پہاڑیوں کی چوٹیوں سے آٹھ دس فٹ نیچے کی ڈھلانوں پر پتھر کے ڈھیریوں کی شکل میں ہیں۔ ان پہاڑیوں کے دامان میں رہائشی آثار پھیلے ہوئے ہیں۔ ہولڈچ کا انہیں مفروضہ دراوڑوں سے منسوب کرنا بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ جہاں جہاں دراوڑوں کی قدیم آبادیوں کے آثار ہیں وہاں اس نمونے کے بقول ہولڈچ گھروندے یا ڈھیریاں نہیں پائے گئے ہیں۔

علاقے کے مقامی لوگ ایک قدیم روایت کو دھراتے رہتے ہیں کہ یہ چھوٹے چھوٹے گھر ہوتے تھے جن میں دو تین آدمی ہی رہ سکتے تھے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں تیسرے آدمی کی جگہ نہیں ہوتی تھی اور ان کی اونچائی بمشکل سات فٹ ہوتی ہوگی۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ان کے رہائشی حملہ آوروں کو دیکھ کر اپنے کو اندر بند کر دیتے تھے اور مکان اپنے اوپر گرا دیتے تھے تاکہ ان کی عورتیں بے عزت اور اغوا ہونے سے بچ جائیں اور مرد حملہ آوروں کے ظلم سے نجات پائیں۔ وہ ساتھ ساتھ یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ زمانہ قحط میں بھی وہ یہی عمل کر کے اپنے کو زندہ درگور کرتے تھے۔ مکران گزیٹر نے بھی اس روایت کو درج کیا ہے لیکن تمام روایتیں گھڑلی گئی ہیں۔

درحقیقت یہ گھروندے یا ڈھیریاں گھر نہیں بلکہ قبریں ہیں جن میں مرنے والے کی ہڈیاں پڑی ہوئی ہیں بعض میں پتھروں، ہڈیوں اور چاندی وغیرہ کے چھوٹے موٹے زیورات اور منکے بھی مٹی کے چھوٹے برتنوں میں سربند مدفون ملے ہیں۔ بعض

مُردوں کے سرہانے پتھر کے تیز دھار آلے بھی دیکھے گئے ہیں۔ جو قدیم رواج کے مطابق وہ مردوں کے ساتھ چھوڑ جاتے تھے۔ مذکورہ قبریں دراصل زرتشتی دین کے پیروؤں کے مُردوں کے مقبرے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہوتا تھا کہ مردہ شخص کا جسم اگر کسی چرند پرند کے خوراک کا کام دیتا ہے تو اُسے دفنا کر سڑنے دینے سے بہتر ہے کہ اُسے چرند پرندوں کو کھلایا جائے اِس طرح اُس کا گوشت مُردے کیلئے ثواب کما کر مردے ہی کے نجات کا باعث بنتا ہے۔ اس عقیدے کے تحت زرتشتی پیروکار عام حالات میں پہاڑیوں پر مختلف سائز کے چوکور گھروندے پتھروں سے تعمیر کرتے تھے اور فرش کو بھی ڈیڑھ دو فٹ گہرا کھود کر کھڈہ چھوڑتے تھے۔ جب کوئی مرتا تو چوکور مکان نما فصیل کے اوپر فاصلے سے لکڑیاں رکھتے اور مُردے کو صاف ستھرا کر کے چربی وغیرہ مل کر ان لکڑیوں یا چھت کہیے، اُس پر بے لباس رکھ دیتے تھے۔ جنگلی گوشت خور چرند پرند اُس کا گوشت نوچ کر کھاتے تھے اور باقی ماندہ ہڈیا خود بخود گل کر چھوڑے گئے بڑے سوراخوں سے اندر کھڈے میں گرتے جاتے تھے۔ چالیسویں روز وارث بمع اپنے دین کے کسی مُلّا کے ساتھ کوٹھی کے پاس آتے باقی ماندہ ہڈیوں کو اندر کے کھڈے میں گراتے اور جو کچھ مردے کے لئے رکھنا چاہتے ایک دیوار توڑ کر مردے کے سرہانے یا پہلو میں رکھ دیتے اور مُلّا متعلقہ مذہب کے مطابق رسم ادا کرتا، دعائیں مانگی جاتیں اور پھر باقی کھڑی دیوار کو کھڈے کے اوپر گرا دیتے اور ملبہ کے اوپر مزید پتھر رکھ کر مردہ کو دفن کرنے کا رسم پورا کرتے تھے۔

یادرہے کہ اسلام کے ظہور تک زرتشتی دین کے پیروکار بلوچ بھی ہوتے تھے اور بحرہ عرب سے تاحد کرمان یہ سارا خطہ بلوچوں کا قدیم ترین وطن تھا۔اس لئے مذکورہ ڈھیریوں کو جو دمبہ کوہ کے بلوچی نام سے منسوب ہیں کسی غیر ملکی قبیلہ یا مسافر قبائل سے منسوب کرنا غلط ہے۔

ان گھروندوں کا ایک سائیڈ سے قدرے لمبا اس لئے تعمیر کرتے تھے کہ ان کی چھت پر مردہ کو پورا لمبائی میں رکھا جاسکے۔اور پہاڑیوں کے اوپر قبریں بنانے کا مقصد یہ ہوتا تھا اڑنے والے گوشت خور چرند پرند وغیرہ ہی کو مردہ نظر آئے اور نیچے کے درندوں سے مردے کو بچایا جائے۔

مذکورہ طریقہ تین چار سو قبل مسیح میں بھی اس خطے میں رائج تھا۔جس کا ذکر قدیم تواریخ پر مبنی کتاب ''بدھسٹ انڈیا'' میں رہس ڈیوڈس نے سکندر اعظم کے مکران سے سفر کے زمانے میں کیا ہے۔ان کے حوالہ سے ''قدیم تاریخ ہند'' کے مصنف وی۔اے سمتھ لکھتے ہیں :

" وہ لوگ اپنے مردوں کو ننگا کر کے جنگلوں میں چھوڑ آتے تھے کہ وحشی جانور ان کو کھائیں۔" (اُردو ترجمہ پروفیسر محمد جمیل الرحمان صفحہ 142) مذکورہ بیان ہنگول سے آگے ہورتیائی کے علاقے کی بابت لکھا گیا ہے۔یہ سارا علاقہ ایرانی علاقہ بمپور تک گدروشیا کہلاتا تھا اور پھر ایرانی بمپور اس کا دارالخلافہ تھا۔

یہ رسم قدیم زمانے میں ہندوستان سے لے کر پارس تک موجود تھا۔جس کا

تذکرہ وی۔اے سمتھ نے مشہور مورخوں سسٹر بیو اور ہیروڈوٹس کے حوالے سے کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ ''گِدھوں کے کھانے کیلئے مردوں کو کھلے میدانوں میں رکھ دینے کا دستور قدیم زمانے میں اور اب بھی ایرانیوں (پارسیوں) میں پایا جاتا ہے۔ (ہیروڈوٹس، باب 1 فصل 140) اب تک تبت میں اس پر عمل ہوتا ہے اور قدیم زمانے میں ویشالی کی لچھوی قوم میں بھی یہی رواج تھا جو تبتی یا ان کی ہم نسل تھی "(صفحہ 213)۔انہوں نے سٹریبو، باب 15 فصل 28 اور 62 کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ رسم ٹیکسلا کے رسوم میں ایک رسم تھا (صفحہ 191)۔ٹیکسلا کا یہ زمانہ اشوک کی حکمرانی کا زمانہ تھا۔اشوک نے 272 ق م میں تخت نشینی کی اور چالیس سال حکمران رہے۔انڈیا کی نسبت بلوچستان میں یہ فرق تھا کہ وہ اپنے مردوں کو میدان میں رکھتے تھے جبکہ بلوچ انہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور بیچ میں چوکور دیواروں کے اوپر رکھتے تھے تاکہ درندوں کی چیر پھاڑ سے مردے کو بچایا جاسکے۔اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بلوچ اپنے مردوں کے بارے میں زیادہ حساس اور ہندیوں سے زیادہ مہذب ہوتے تھے۔

10۔یہ حمزہ اصفہانی ہے جس کا حوالہ ہیوز بٹلر نے مکران کے موضوع کے ضمن میں دیا ہے۔

11۔مکران کے سارے خطّے میں ایک بھی ایسی زبان نہیں ہے جس میں ''ماہ'' کے معنی ''گاؤں'' کے ہوں۔ہزاروں سالوں سے اس خطے کی ایک ہی زبان بلوچی ہے۔جسے

کبھی ''کوچی'' یا کچی کہا جاتا تھا اور کبھی مکرانی اور بعد کے زمانوں میں بلوچی اس زبان میں ''ماہ'' چاند کو کہتے ہیں۔ اور ہمسایہ زبان فارسی اور قدیم پہلوی وغیرہ میں بھی ماہ اسی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

12۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز مکران ڈسٹرکٹ مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1992ء صفحہ 643-644۔

13۔ یہ غلط ہے کہ یونانی ''ماہی خوران'' کا لفظ ''مکران'' کیلئے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے ساحلی آبادی کے لئے ''ماہی خوران'' کا لفظ استعمال کیا ہے نہ کہ علاقے کیلئے علاقہ یا خطہ گڈروشیا کہلاتا تھا اور یونانیوں نے بھی ملک کے لئے گڈروشیا ہی کا نام استعمال کیا ہے۔ اُس زمانے میں مکران کا نام یا تو وجود نہیں رکھتا تھا یا پھر کوئی چھوٹا موٹا موضع ہوگا جس کی شہرت نہیں ہوگی۔

14۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز، مکران ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 644-643۔

مند

مند، موجودہ مکران کے ضلع کیچ کا ایک تحصیلی موضع ہے جو مغربی بلوچستان (ایرانی) کی سرحد پر واقع ہے۔ اور زیادہ تر مکران کے رند قبائل کا مسکن ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ہتورام لکھتے ہیں کہ

> وجہ تسمیہ جغدالی میں ''مند''
> خراب کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ علاقہ اکثر غیر
> آباد اور پہاڑی ہے اور اس میں جو لوگ آباد
> ہیں نیم وحشی عادات اور خستہ حال ہیں۔
> (1)''

حیرت ہے کہ ہتورام کو ہر جگہ جغدالی زبان سوجھتا ہے جبکہ ان علاقوں میں جہاں وہ جغدالی زبان کا رٹ لگاتے ہیں جغدالی زبان بولی ہی نہیں جاتی۔ قدیم زمانے میں مندا بریا میں جت (اونٹ پال) آباد رہے ہیں لیکن وہ بھی مکرانی یعنی بلوچی زبان بولتے رہے ہیں جس کا ثبوت اُن کی بلوچی زبان میں شاعری ہے۔ لیکن پھر بھی وہ بات جغدالی کی کرتے ہیں۔ اگر بقول ہتورام ہر ویران اور پہاڑی علاقہ کو جغدالی ہی میں مند کہا جاتا ہے تو لس بیلہ اور کچھی کے ویرانوں کو کیوں مند نہیں کہا جاتا جہاں آبادی

بھی جغدالوں کی ہے اور زبان بھی جغدالی ہے۔ یہ سب ہوائی باتیں اور من گھڑت مفروضے ہیں جن کو تاریخ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

" مند" کا لفظ بلوچی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "چشمہ" کے ہیں۔ مند کی روایتوں کے مطابق اس میدان میں سب سے پہلے ایک قبیلہ بلو آیا جس نے اپنا چشمہ نکالا اور اسی اطراف میں آباد ہوا۔ اور یہ چشمہ "مند بلو" کہلایا۔ دوسری روایت "سورو" قبیلہ کے بارے میں ہے کہ اس نے اپنے لئے چشمہ کھدوایا اور وہ چشمہ "مند سورو" کہلایا۔ ہتورام نے بھی مند میں دو چشموں کا ذکر کیا ہے۔

کچھی اور سبی کے میدانوں میں رندوں اور لاشاریوں کی تیس سالہ تباہ کن لڑائی جس باہوٹ (زیر پناہ) عورت گوہر مہیری پر لڑی گئی وہ گوہر اسی مند کے سرحدی موضع "مہیر" کی رہنے والی تھی۔ یہ موضع آج بھی موجود ہے جہاں پر ایران و پاکستان کے سرحدی محافظوں کی چوکیاں ہیں۔

مذکورہ علاقائی تاریخی روایتوں نے ہتورام کے مفروضے کو غلط ثابت کر کے مسترد کیا ہے۔

1۔ تاریخ بلوچستان، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 2009ء صفحہ 323۔ واضح ہو کہ مند کے قدیم یا اولین آباد کار "مندش" کہلاتے ہیں جو ایک قبیلہ ہے اور مند کی نسبت سے ہے۔

میران شاہ کا خضدار پر حملہ

بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز خضدار میں، تیمور لنگ تاتاری کے بیٹے میران شاہ کا خضدار پر فوج کشی اور حملے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ گزیٹر نے یہ بیان میجر پرائس کی تصنیف "ری ٹراسپکٹ آف محمڈن ہسٹری" کے حوالے سے درج کیا ہے جس میں کہا گیا ہے :

" تیمور لنگ کے بیٹے میران شاہ
نے 1384ء میں ایک فوجی مہم کی بطرف
"کیساد (KESSAUD) سربراہی کی
جو شاید قصدار تھا۔" (1)

میجر پرائس نے خود اس چیز کی تحقیق نہیں کی تھی کہ کیساد خضدار ہے یا کوئی اور مقام، صرف خضدار کا شائبہ کر کے کیساد کو خضدار سمجھا اور لکھ دیا۔ یوروپی مصنفین کا نقص یہی ہے کہ ناموں کی مشابہت سے دھوکہ کھاتے ہیں یا پھر جان بوجھ کر قاری کو دھوکے میں مبتلا کر کے حقیقی تحقیق سے جان چھڑا لیتے ہیں۔ یہ چیز ان کی کتابوں میں قدم قدم پر ملیگی جو متعدد مقامات پر تاریخی واقعات کے پس پردہ رہ جانے کا باعث بنتے ہیں۔ اور قاری صحیح نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا۔ یہاں بھی یہی نقص سامنے آ گئی ہے کہ پرائس

نے ''کیساؤ'' اور ''قصدار'' کے ناموں میں معمولی سے مشابہت دیکھ کر میران شاہ کی لشکر کشی کو خضدار سے منسوب کر دیا۔ اور گزیٹر نے بھی اس پر تحقیق اپنی جگہ سطحی پوچھ گچھ بھی نہیں کی۔ نہ صرف پوچھ گچھ نہیں کی بلکہ اس پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا۔

میجر پرائس کے مذکورہ ''شاید'' والے بیان کے علاوہ کسی تاریخی تصنیف یا حوالے میں خضدار اور اس کے اطراف پر میران شاہ کی فوج کشی کا ذکر نہیں ملتا۔ اور جس ''کیساؤ'' پر اس کی فوج کشی کی بات کی گئی ہے وہ خضدار نہیں بلکہ ''کیساؤ'' ہی ہے جو اس زمانے میں ایک مشہور شہر ہوتا تھا جو اب کسی شمار و قطار میں نہیں ہے۔ یہ قدیم مقام، کوئٹہ پشین کے علاقے شورارود اور شوراوک کے درمیان واقع تھا اور اب بھی اسی نام سے موجود ہے۔ تیمور کے زمانے میں یہ علاقہ خراسان میں ہوتا تھا۔ لہٰذا مصنف مذکور کا خضدار سے متعلق شائبہ غلط ثابت ہوا ہے۔

1۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز، حصہ اول، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 166۔

میروانی، گرگیناڑی وغیرہ

بلوچستان میں میروانی قبیلہ کا شمار قدیم بلوچ قبائل میں ہوتا ہے قبیلہ کے بزرگوں اور اس کے ہم نسل قبائل اسے مکران کے علاقہ زامران سے نقل مکانی کر کے دو مختلف سمتوں میں آنے والا قبیلہ روایت کرتے ہیں جو اپنے ابتدائی محدود خول میں میروزئی کہلاتا تھا۔ اس میروزئی طائفہ کا جدامجد میران رئیس ہوتا تھا جسے عام طور پر میرور ئیس کہتے تھے۔ حاکم پنجگور و سرحد اور فاتح قلات وزہری میر کبر رئیس اور میروزئی طائفے کا جد میران رئیس کا خاندان مشترک ہے۔ میروانی روایتوں کے مطابق میران عرف میرور ئیس، میر کبر رئیس فاتح قلات کے گھرانے سے تھا جسے انہوں نے قلات کی مہم پر آتے وقت اپنا قائم مقام چھوڑا تھا۔ اسی میرور ئیس سے میروزئی طائفہ یا شاخ تشکیل پاتی ہے اور اس کا قبیلائی سلسلہ الگ ہو جاتا ہے۔ براہوجدگال جنگ کی مشہور میروانی نظم میں میروانی قبیلہ کو ''براہیمی گہیں ذات'' کہا جاتا ہے یعنی ''براہیم کی نفیس نسل''۔ وہ نظم میں ''گہرام'' کو بھی اپنا ایک جد بتاتے ہیں جو ابراہیم کا بیٹا تھا۔

مذکورہ روایتیں اور شہادتیں آج سے ایک صدی قبل زیادہ اور وافر دستیاب ہوتی تھیں لیکن اس کے باوجود یورپی سہل کار اور مفروضہ سازوں نے میروانی قبیلہ پر

بات کرتے ہوئے لکھا :

" میرواڑی (1) اور دیگر اصل براہوئی قبائل
جیسے کمبراڑی، گرگناڑی، سمالاڑی، اور رودینی ابتداً
کون تھے؟ یہ سوال ہنوز پردہ ظلمات میں ہے۔
"(2)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

" یہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے، تاریخ
ہمیں کچھ نہیں بتاتی۔ میرواڑی عرب خون کے
دعویدار ہیں اور یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد بھی معلوم نہیں
ہوتا..... خاندان کی بڑی شاخ، جس سے احمدزئی
خوانین قلات ماخوذ ہیں، کے نمائندوں اور خوانین
قلات کی طرف سے سابقہ ایام میں مشکئے اور کولواہ
کے نائبین کی حیثیت سے وہ ہمیشہ کافی اہمیت کے
حامل رہے ہیں"۔(3)

جیسے کہ گذشتہ صفحات میں ہم مسلسل دیکھ رہے ہیں کہ یوروپیوں کا قبائل اور ان کی تاریخ کے بارے میں کسی قسم کی تحقیقی کاوش نہیں ہے اور وہ اپنا سارا انحصار مفروضہ قائم کرنے اور سطحی سنی سنائی باتوں پر کرتے ہیں اور پھر انہیں تاریخ کا حصہ بناتے ہیں۔

آج سے ایک ڈیڑھ صدی قبل اگر وہ تھوڑی سی کاوش کرتے تو انہیں مذکورہ بالا کچھ نہیں لکھنا پڑتا بلکہ ہماری بھی کافی معاملات میں رہنمائی ہوتی۔ وہ جنہیں اصل براہوئی قبائل لکھتے ہیں وہ بھی اندازہ اور قیاس سے لکھتے ہیں۔ متذکرہ بالا (جہلاوان گزیٹر) میں انہوں نے کمبرانی، گرگناڑی، سمالانی اور رودینی کو اصل براہوئی لکھا ہے۔ حالانکہ "براہوئی" ایک اتحادیہ تھا جس نے جدگالوں کے خلاف جنگ لڑی اور اس اتحادیہ کا سرغنہ یا کماندار میرواڑی قبیلہ کا سردار خیل طائفہ "براہو" تھا۔ "براہو" کے اتحادی "براہوئی" کہلائے۔ اور اس میں کوئی خاص وعام کی تخصیص نہیں ہے۔ البتہ اس کا مرکزہ فقط "براہو" طائفہ تھا۔ جس کی شخصیتیں میر بجار براہو، میر عمر براہو، قلندر براہو اور گرگین براہو تھے۔ ان میں سے صرف قلندر براہو اور گرگین براہو کے نام سے بالترتیب قلندرانی اور گرگینانی (جدگالی اثر کی وجہ سے قلندراڑی اور گرگناڑی) قبیلے تشکیل پائے۔ سمالانی قبیلہ کا جدامجد "سماعیل ذگر" تھا جو براہو طائفے سے نہیں تھا۔ اسی طرح "کمبرانی" کا جدامجد "کمبر کہدائی" تھا۔ وہ بھی براہوئی طائفے سے نہیں تھا۔ چونکہ دونوں "براہو" طائفہ کے اتحادی تھے اسی لئے براہوئی کہلائے۔ اور کل اتحادی لشکر اسی اتحادیہ کے رکن ہونے کی وجہ سے جو بیسوں لشکر تھے براہوئی کہلائے۔ بالفرض اگر کسی کو خاص براہوئی کا مقام دینا ہے تو وہ صرف قلندرانی اور گرگناڑی ہوں گے۔ براہو اتحادیہ میں "رودینی" شامل نہیں تھا۔ مشہور "براہو جدگال جنگ کی نظم میں" اس کے جدامجد "رودین" کا نام نہیں آتا۔

خوانین قلات کے دربار میں بھی ایک گروپ "براہوئی سرداران" کا ہوتا تھا۔ جو کسی علاقے جیسے سراوان، جھلاوان، مکران وکچھی وغیرہ سے منسوب نہیں ہوتے تھے۔ وہ پانچ قبیلوں کے سردار ہوتے تھے یعنی کمبرانی، میروانی، قلندرانی، گرگناڑی اور سالانی۔ چونکہ ایک تو میروانی اور اس کے ذیلی قبیلے یعنی قلندرانی اور گرگناڑی، تاریخی جنگ میں جدگال کے خلاف مرکزی طاقتیں تھیں جنکی وجہ سے خوانین قلات کی حکومت مع مزید علاقوں کے انھیں ہاتھ آ گئی تھی اور سالانی کا جد میروانیوں کا داماد اور جنگ کے ابتدائی ایام کا طاقتور اتحادی تھا۔ اور اسی طرح کمبرانی کا جدّ میر کمبر، سابق خوانی قلات کے ایلجا زئی لشکر کا کمانڈر اور ایلجا زئیوں کا داماد تھا۔ جو پھر احمد زئی خوانین کی بلوچی افواج کا کمانڈر اعلیٰ بنا۔ براہو جدگال جنگ میں نمایاں ترین کردار انہی قبیلوں کے جدّ امجدوں کا رہا ہے اسی لئے بیسوں "براہوئی" قبائل میں سے ان پانچ قبائل کے سرداروں کا انتخاب کر کے انھیں بلوچی دربار میں جگہ دیا گیا تھا۔

ان یوروپی مؤلفین کا یہ دعویٰ کہ ان کی اصلیت پردہ ظلمات میں ہے بھی غلط اور ان کی اپنی لاعلمی ہے۔ اس موضوع کے شروع میں ہم بتا چکے ہیں کہ میروانی قبیلہ کے اجداد مکران کے نامور قبیلہ رئیس کی مشہور شخصیتیں رہی ہیں۔ اور خوانین قلات کے جدّی قبیلہ کمبرزئی اور میران رئیس عرف میرو کے میروزئی قبیلہ کے اجداد مشترک ہیں۔ میروزئی، زامران میں آباد تھے، روایتوں کے مطابق میرو خان کی نسل دو پشتوں تک چلی۔ ان میں ایک میر حسن میروزئی ایک نامور شخص ہو گزرا ہے۔ جسے لاولد روایت کیا

جاتا ہے۔ پھر میروزئی سرداری میر کمبر کے خاندان سے ایک شخص میر حسن (دوئم) کی سرپرستی میں پروان چڑھی۔ یہ بڑا جنگجو شخص تھا۔ جو قبائلی جنگوں کے نتیجے میں ملنے والی مقبوضات کے پیچھے میروزئیوں کے ساتھ کولواہ میں آباد ہو چکا تھا۔ کولواہ میں میروزئیوں نے قبیلہ کورنک، کورواہ، گجّروں کے پروار اور کھٹانہ قبائل کے خلاف دیگر ہمسایہ قبائل سے سان (جنگی مدد) لیا۔ اسی سان لینے کے نتیجے میں میروزئی نے وسیع شکل اختیار کر لی اور بلوچی نظام قومداری کے مطابق نئے نام "میروانی" سے متعارف ہوا۔ میر حسن دوئم کے سات بیٹوں میں سے چار سنجر، براہم، شنبہ اور میر دوست تھے۔ براہیم عرف عام میں "براہو" کہلاتا تھا۔ جو میر حسن کا بڑا لڑکا تھا۔ براہو نے کولواہ سے خضدار تک کے درمیانی علاقوں میں گجّروں اور جٹوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ اور بڑا نام پیدا کیا۔ براہیم کے کئی بیٹوں میں سے میرو، کمبر، رودین نام آور ہوئے۔ انہی کے نوجوانی تک میروانی قبیلہ ایک جنگجو قبیلہ کے طور پر جٹ، گجر اور جدگالوں سے لڑتے لڑتے کولواہ سے سوراب تک کے وسیع علاقے تک پھیل چکے تھے۔ براہیم نے اپنی زندگی میں سوراب کے ٹُرک قلعہ نغاڑ پر قبضہ کیا جو جدگالوں کے قبضے میں تھا۔ براہیم (4) نے ایک شادی گجروں میں بھی کی تھی۔ اُن کے بعد اسی گجر خاندان سے میرو براہو نے بھی دوسری شادی رچائی تھی۔ لس بیلہ کے میروانی، میرو کی گجر بیوی سے کہے جاتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے جد مادروں سے رشتہ توڑ لیا تھا اور لس بیلہ جا بسے تھے۔

مکران گزیٹر نے میروانیوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ اپنے کو عرب نسل بتاتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی ان یوروپیوں کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ دراصل عربی نسل ہونے کی بات مذکورہ مصنفین نے میروانیوں کی بلوچی شاعری سے اخذ کیا ہے اور یقینا براہوجدگال جنگ کی منظوم داستان سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے جس میں بعض دیگر بلوچوں کی طرح میروانی نے بھی میر حمزہ کو اپنے اجداد سے بتایا ہے۔ اور اپنے طور پر سمجھا ہے کہ یہ ''میر حمزہ'' امیر حمزہ قریش ہیں جو بنی صلعم کے عم تھے۔ جن کی کوئی نرینہ اولاد بچی نہیں تھی۔ گذشتہ صفحات میں اس موضوع پر بات کی جا چکی ہے۔

یہی گزیٹر میروانیوں کی سماجی اہمیت کی بات کرتے ہوئے خوانین قلات کے قبیلہ احمدزئی کو میروانی شاخ لکھتا ہے جو کہ غلط ہے۔ احمدزئی قبیلہ کا جدّ میر احمد قبیلہ کا لیلتا زئی تھا اور براہوجدگال جنگ میں میر بجار براہو میروانی کا جنگی اتحادی تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ دونوں کا نسلی ماخذ مشترک ہے۔

حواشی:

1۔ اصل لفظ ''میروانی'' ہے۔ جو بلوچی نظام قومداری کے مطابق ''آنی'' کے لاحقہ کے ساتھ تشکیل پاتا ہے۔ ''آنی'' کو جھلکی میں ''آڑی'' تلفظ کیا جاتا ہے۔ چونکہ جہلاوان میں زمانہ قدیم سے جٹ اور جدگال (جھلکی بولنے والے بلوچ) رہتے تھے اس لئے مقامی زبانوں پر اس کا اچھا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے۔ اسی اثر کی وجہ سے قبائلی ناموں میں ''ڑی'' کا تلفظ نظر آتا ہے۔

2۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز: جہلاوان ڈسٹرکٹ مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ۔ 1997ء صفحہ 193۔

3۔ ایضاً: مکران ڈسٹرکٹ، موضوع میروانی۔

4۔ براہیم عرف براہو، جدگالوں کے خلاف ایک لڑائی میں بمقام خاران شہید ہوئے۔ مشہور ہے کہ وہ ایک عبادت گزار شخص تھے، اسی بنا پر خاران میں ہی ان کی زیارت بنائی گئی جو مرجع خلائق بنی۔ لوگ دور دور سے اس زیارت پر آتے تھے اور اپنی مرادیں مانگتے تھے۔ یہ زیارت ''براہو زیارت'' کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ جواب کھنڈر کی شکل میں اور بے نشان ہو گئی ہے البتہ وہ مقام اب بھی ''براہو'' کے نام سے معروف ہے۔

مینگل

بلوچستان میں قبیلہ مینگل دو نسلی گروہوں پر مشتمل ہے۔ ایک وڈھ کے مینگل ہیں جو اپنے مرکزہ شاہی زئی کی نسبت سے شاہی زئی مینگل کہلاتے ہیں۔ اس کے مرکزی طائفے رند الاصل ہیں۔ سردار خیل یا سردار گھرانہ "شاہی زئی" کا جدامجد "شاہی" "شاہی رند" کہلاتا تھا۔ جو میروانی اور مینگلوں کے مابین ہونے والی ایک لڑائی میں مقتول ہوا (1) "تاریخ بلوچستان" میں رائے بہادر ہتورام نے لکھا ہے :

" تمام مینگل جو وڈھ کی طرف رہتا ہے شاہی زئی
کے نام سے پکارا جاتا ہے یہ لوگ اپنے آپ کو رند
بلوچ کہتے ہیں" (2)

" مینگل اصطلاح کے معنی "مین کا لشکر" یا "مین کے لوگ" کے ہیں۔ اس قبیلہ اور اس کے نام کی وجہ تسمیہ کے بارے میں گزیٹر کے مئولفین نے درج ذیل کہانی لکھی ہے :

" جہلاوانی مینگل ماخذ کے لحاظ سے جدگال
بتائے جاتے ہیں۔ (3) ٹیٹ نے اپنی تصنیف
"احمدزئی خوانین قلات کے خاندان اور علاقہ پر ایک
تحقیقی مقالہ" میں لکھا ہے : "خود مینگلوں کا خیال

ہے کہ وہ ابتدا میں سمرقند کے قرب و جوار میں رہنے
والے لوگوں کی اولاد ہیں (4) بلوچی زبان ایران
کی قدیم تہذیب کا اثر باقیہ ہے جب سلطنت ایران
کی حدود مغربی ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس
زبان میں اسمائے جمع اور اسمائے ذات کی جمع عموماً
اسم کے ساتھ "گل" کا لاحقہ لگا کر بنائی جاتی ہے۔
لہذا پورے بلوچستان میں لفظ جدگال کا مطلب ہے
جاٹ آبادی بہ ہیت مجموعی (5) اس طرح لفظ مینگل
محض "مین" قبیلہ کو ظاہر کرتا ہے۔ "من" ایک
مشہور و معروف سیتھین یعنی تورانی قبیلہ تھے اور یہ
نام کتبات بے ستون کی فہرس میں آیا ہے جن میں ان
سیتھی قبائل کے نام درج ہیں جنہیں داریوش نے
ان کی شورش پسندی کی وجہ سے اپنی سلطنت کیانی
(یا ہخامنشی) کی مشرقی سرحد پر جلاوطن کر دیا تھا۔
قلات میں قبیلہ اپنی بہادری کے لئے مشہور تھا اور
مزید مشرق کے راجپوتانہ میں مینا اپنی شورش پسندی اور
ڈاکہ زنی کی وجہ سے مشہور تھے یا ہیں۔" (7)

مذکورہ بالا بیان تمام تر مفروضے ہیں۔ کسی مینگل کو سمرقند کا پتہ نہیں ہے اور مینگلوں سے منسوب کردہ مذکورہ روایت یوروپیوں کا جھوٹ ہے۔ ان مصنفین نے قوموں کی تواریخ کو ایسے سینکڑوں دروغ گوئیوں سے بھر دیا ہے۔ ہر بلوچ یا ہر بلوچستانی قبیلہ کو اپنی اصل ونسل کا علم ہے۔ انگریزی دور سے ایک صدی بعد آج بھی مینگل اپنے بارے میں جانتے ہیں کہ وہ کون ہیں، کہاں سے آئے اور کب آئے۔ انہوں نے آگے ''مینگل'' اور ''جدگال'' کے ''گل'' اور ''گال'' کی مثال میں اپنی لاعلمی اور بلوچی زبان سے ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے اور ''گل'' اور ''گال'' کے معنوں بھی فرق نہیں کر سکے ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ ''گل'' کا لاحقہ جمع کیلئے بولا جاتا ہے لیکن ''گال'' الگ لفظ ہے جس کے معنی ''زبان یا بولی'' کے ہیں۔ مینگل کے معنی وہ نہیں ہیں جو ''جدگال'' کے ہیں اور جدگال کے وہ معنی نہیں ہیں جو مینگل کے ہیں۔ مین اور گل کا مجموعہ مینگل کے معنی ''مین کے لوگ'' یا ''مین کا لشکر'' کے ہیں۔ ''مین'' کے معنی ''دلدل'' کے ہیں۔ یہ ایک ''دلدلی'' رقبہ ہے جو بارشوں میں تقریباً سواریوں کیلئے ناقابل گذر ہوتا ہے۔ یہ ضلع خاران کے میدانی علاقہ رخشان میں واقع ہے اور پنجگور سے کوئٹہ کے راستے پر پنجگور سے ساٹھ ستر کلومیٹر کے فاصلے پر آتا ہے۔ اس میدان میں پندرھویں اور سولہویں صدی عیسوی کے درمیان بیسویں رند قبائل آباد تھے، قرب وجوار میں جتوں کی بھی آبادیاں ہوتی تھیں۔

جب رند قبائل کا قلات وکچھی کی طرف نقل مکانی کا غلغلہ اٹھا تو جدھر سے رند قبائل کے گروہ در گروہ نقل مکانی کرنے لگے تو ''مین'' کے رندوں نے بھی بطرف قلات مہاجرت کی اور دشت گوران (8) میں پڑاؤ کیا۔ یہ گروہ اپنے سابق مسکن ''مین'' کی نسبت سے ''مین گل'' کہلایا یعنی ''مین کے لوگ'' ان میں مختلف رند طائفوں کے لوگ شامل تھے۔ رند قبائل کی نقل مکانی کے بارے میں ایک بلوچی نظم کے ایک مصرعہ میں کہا گیا ہے۔ ''مینگل انت ہژدہ بار''۔ یعنی مینگل قافلہ میں اٹھارہ اونٹوں پر ان کے خیمے اور گھربار لدے تھے۔ رائے ہتورام نے لکھا ہے:

'' یہ لوگ اپنے آپ کو رند بلوچ سے سمجھتے ہیں
کہ جب میر چاکر قلات کی طرف آیا تھا۔ مینگل بھی
اس وقت ہمراہ آیا تھا۔ جب چاکر قلات پر قابض ہوا
تو مینگل نے اس سے صلاح کی اور ملک وڈھ و دوہیر
اقوام بیزنجو سے چھین کر خود قابض ہوا۔''(9)

جہاں تک گزیٹر مؤلفین کا سیتھی قبیلہ ''من'' کو ''مینگل'' بنانے کی بات ہے وہ غلط ہے۔ ''من'' سے ''من گل'' بنتا ہے نہ کہ ''مین گل''۔ اس کے علاوہ بھی بلوچستان میں کہیں بھی سیتھی قبیلہ ''من'' کی آبادکاری کا کوئی ایک نشان بھی نہیں ہے۔ لہذا یہ ان کی اپنی من گھڑت بات ہے جو کوئی تاریخی بنیاد نہیں رکھتا۔ اپنے بیانات میں بھی مؤلفین ایک پیرے میں کوئی بات کہتے ہیں اور دوسرے پیرے میں

کوئی دوسری۔ جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ سیتھی "مِن" سے مینگل کی ترکیب نکالنے کے بعد لکھتے ہیں کہ راجپوتانہ میں "مینا" ڈاکہ زنی اور شورش پسندی میں شہرت رکھتے ہیں یعنی یہاں پر انہوں نے "مِن" سیتھی قبیلہ کو راجپوتانہ کے ہندی "مینا" قبیلہ سے جوڑ دیا۔ جبکہ دونوں قبیلوں کے ماخذ اور ان کے وطن میں برسوں کے فاصلوں کا بُعد ہے۔ اب کوئی بتائے کہ ایسی جماقتوں کا کیا جواب دیا جاسکتا ہے ماسوائے ان پر سر دھننے کے۔

مینگلوں کا دوسرا نسلی گروہ نوشکی کے ذکر مینگل ہیں جو اسی دشت گوران (قلات) میں مینگل رندوں میں پنجگور سے آ کر ملے یہ پنجگور کی وادی گچک کے قدیم باشندے تھے اور اصلی بنیادی اور نسلی بلوچ قبیلہ تھا۔ گچک میں رئیس قبیلہ کی بالادستی ہونے پر یہ قبیلہ اُس کا ایک طائفہ شمار ہوتا تھا۔ جب حاکم پنجگور دوسرحد (10) میر کبر رئیس نے قلات وزہری پر لشکر کشی کی اور ان علاقوں پر بالادستی قائم کی تو ذگر کا ایک طائفہ بھی ساتھ تھا جنہیں میر کبر نے دشت گوران میں اپنے دیگر ذگروں کے پہلو میں آباد کیا اور مقبوضات میں حصہ دیا۔ چونکہ مینگل رند وہاں اکثریت میں تھے اور ذگر رئیس اقلیت میں تھے اس واسطے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان پر بھی نام مینگل کا اطلاق ہوا۔ سترھویں صدی کے وسط میں ذگروں نے نوشکی کی طرف نقل مکانی کی۔ پنجگور کے علاقہ گچک میں ان کا قدیم مسکن "ذگرانی کہور" (ذگروں کی ندی) کے نام سے موجود ہے جہاں پر ان کی قدیم آبادی کے بکھرے آثار موجود ہیں۔

گزیٹر چاغی کے مئولفین نے ایک جگہ انہیں "ذکریا" سے منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ ذکریا، مینا کا لڑکا تھا۔ لیکن یہ نہیں بتایا ہے کہ ذکریا، کون تھا؟ اور اُس کا باپ مینا کون تھا، پھر مینا کو وہ ابراہیم کے لڑکوں میں ایک بتایا ہے لیکن یہ نہیں بتایا ہے کہ ابراہیم کون تھا۔ پھر دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ذگر اپنے کو "زغد" سے آنے والے بتاتے ہیں۔ جبکہ کسی مینگل کو آج تک کسی زُغد کا پتہ نہیں ہے۔ وہ مفروضے پر مفروضے گھڑتے ہیں اور فضولیات لکھ کر اُسے تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ جو درحقیقت کسی غور کے قابل نہیں ہوتے۔ (11)

حواشی:

1۔ ملاحظہ کیجئے موضوع "زرکزئی"۔

2۔ "تاریخ بلوچستان" مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 2008۔ صفحہ 168 اور صفحہ 120۔

3۔ یہ گزیٹر کے مئولفین کا ایک مفروضہ ہے۔ ماخذ رند بلوچ ہے جیسے کہ ہتورام نے لکھا ہے۔ البتہ ان کے طائفوں میں جدگال طائفے ہیں۔ جدگال اصطلاح "جٹ گال" سے مرکب ہے۔ یہ بلوچی زبان کی اصطلاح ہے جس نے قدرے غلط العوام ہوکر "جدگال" کی شکل اختیار کرلی ہے۔ بلوچ سندھیوں کو جٹ کہتے ہیں۔ اور جنوں کی زبان (سندھی یا جھکی) اختیار کرنے والے بلوچ کو "جٹ گال" کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح پہلی بار ایران سے سندھ آنے والے بلوچوں نے اپنے ان بلوچوں کیلئے استعمال کیا جو سندھی زبان اپنا چکے تھے۔ چونکہ ایرانی بلوچ فارسی زبان کے اثر کی وجہ سے "ٹ" نہیں بول

سکتے اور اس کی جگہ ''ت'' اور ''ڈ'' تلفظ کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے جنگال ان کے لہجے میں جگال بنا اور پھر ''جدگال'' کی صورت میں جم گیا۔ اس لئے جدگال کو نسلاً غیر بلوچ سمجھنا ان کی تاریخ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ موجودہ وقت میں اس کے مفہوم میں کچھ وسعت آ گئی ہے۔ وہ یہ کہ اب وہ سندھی نسل کا شخص جو سندھی بولتا ہے اور بلوچستان میں رہتا ہے، بھی ''جدگال'' اور کہیں ''جگدال'' کہلاتا ہے جو جدگال کی بگڑی صورت ہے۔ سندھ میں رہنے والے سندھی بولنے والے کیلئے یہ اصطلاح استعمال نہیں ہوتی بلکہ اُسے حسب معمول جٹ ہی کہا جاتا ہے۔

4۔ یہ روایت مینگلوں کی نہیں یوروپی مصنفین کا گھڑا ہوا جھوٹ ہے آج سے صدی قبل کے مینگل کو سمر قند وغیرہ کا پتہ نہیں ہوتا تھا۔

5۔ اسی خیال کے تحت یوروپین مصنفین نے بلوچی زبان کو قدیم فارسی سے اخذ کردہ بتایا ہے لیکن قدیم فارسی کا تجزیہ زبان کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت وہ نہ کر سکے ہیں اور نہ کہ بلوچی زبان کا قدیم زند اور پہلوی زبانوں کی روشنی میں جائزہ لے سکے ہیں اس ضمن میں ان کی تحریروں میں گہرائی کم اور سطحیت زیادہ نمایاں ہیں۔

اے۔ ڈبلیو۔ ہیوگز اور ہنری پوٹنگر بلوچی زبان کے مکرانی بولی کو فارسی سے ''ناقابل انکار مماثل'' لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ فارسی کی روزمرہ شکل ہے لیکن مشرق کی طرف آتے آتے اس کی فارسیت کمزور پڑتی جاتی ہے۔ اس کا صوتی تاثر درشت اور کرخت ہو جاتا ہے اور یہ کہ یہ قدیم فارسی سے ماخوذ بتائی جاتی ہے۔

ہیوگز لکھتا ہے کہ فارسی اور بلوچی میں جو فرق پڑا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بلوچوں کو الفاظ کے حروف بدلنے کی ایسی عادت پڑی ہے کہ اصل الفاظ اپنی ہیت اور شناخت کھو بیٹھتے ہیں (دی کنٹری آف بلوچستان)۔ ہیوگز کے کہنے کے برعکس مذکورہ خاصیت بلوچوں کی عادت نہیں ہے بلکہ یہ بلوچی زبان کا قدرتی مزاج ہے کہ الفاظ کو اپنے خصوصی قالب میں ڈال کر ان کی غیریت و اجنبیت کو بدل دیتا ہے اور یہ مزاج ہر زبان کی قدرتی میراث ہوتی ہے۔

سار اوان گزیٹر کے مطابق بلوچی زبان تکنیکی اعتبار سے ہند یوروپی زبانوں کے آریازمرہ کی ایرانی شاخ سے متعلق بتائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر گریئرسن بھی اسی نظریے کا حامی ہے۔ میجر مونکلر اور کیل یونیورسٹی کے پروفیسر لسانیات ڈاکٹر اینڈریز کے مطابق یہ زبان ایرانی گروہ کی ایک آریائی زبان ہے اور پہلوی کی بہن معلوم ہوتی ہے یا کم از کم ایسی زبان ہے جو قدیم فارسی سے اُسی وقت علیحدہ ہوئی جب پہلوی الگ ہو چکی تھی۔ اور مکران میں اثر پذیر ہوئی، اس حد تک اسے ایک اوریجنل زبان سمجھا جاسکتا ہے۔ (انٹروڈکشن ٹو اے گرائمر آف دی بلوچی لینگویج، لندن 1897ء)

اکثر تجزیہ نگاروں نے بلوچی اور فارسی الفاظ کی ہمرنگی کو مثال پیش کرتے ہوئے اسے فارسی سے اخذ کردہ بتایا تو ہے لیکن جہاں وہ بلوچی زبان کے قدیمی مزاج کو جو صرف اس کا اپنا ہے زیر بحث نہیں لاتے وہاں وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ بلوچی میں فارسی کے چند الفاظ کا شامل ہونا اس خطے پر صدیوں تک فارسی زبان کی بالادستی کا نتیجہ بھی

ہے۔ ایسے الفاظ اگرچہ کم نہیں جن کی ہئیت بلوچی زبان کے مزاج نے بدل کر انہیں بلوچی میں رنگا ہے لیکن ان مروج الفاظ نے بلوچی کے اپنے قدیمی اور اور بجنل الفاظ کی جگہ لے نہیں سکی ہے اور وہ الفاظ پس پردہ تقریباً غیر مروج مگر موجود ہیں۔ جنہیں تعلیم یافتہ اور شہری تہذیب کے بلوچوں نے متروک کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ لیکن ان کا استعمال دیہاتی، غیر تعلیم یافتہ لوگوں اور خصوصاً تعلیم سے بے بہرہ عورتوں میں چلا آ رہا ہے۔ ان کے علاوہ وہ قدیم الفاظ جو بلوچی اور فارسی دونوں زبانوں میں معمولی تغیر کے ساتھ موجود ہیں جنہیں فارسی دان فارسی کا بتاتے ہیں اور بلوچی اسکالر انہیں بلوچی کا بتاتے ہیں، دراصل قدیم زبان پہلوی سے دونوں نے اخذ کئے ہوتے ہیں اور پہلوی کے بنیادی الفاظ اور ان کی تراکیب فارسی کی نسبت سے بلوچی سے زیادہ قریب ہیں اور زیادہ مماثلت رکھتے ہیں۔ بیشتر شاہی کتبے جو زند یا پہلوی میں لکھے بتائے جاتے ہیں، فارسی میں بیس فیصد بھی پڑھے نہیں جاسکتے جبکہ بلوچی میں اسی فیصد تک پڑھے جاسکتے ہیں۔ ان میں مستعمل تقریباً آدھے کے قریب الفاظ موجودہ بلوچی الفاظ کے مماثل ہیں اور موجودہ مروج بلوچی میں معنے دیتے ہیں۔

6۔ دیکھئے حاشیہ نمبر 3۔

7۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز : جھلاوان ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب، کوئٹہ، 1997، موضوع "مینگل"۔

8۔ "گوران" نامی میدان قلات کے جنوب میں واقع ہے اور ایک وسیع دشت ہے جو

کسی زمانے میں ایک قدیم بلوچ قبیلہ "گوران" کا مسکن اور چراگاہ تھا۔ یہ قبیلہ پنجگور، کوہستان سیوستان اور سیستان کے جنوبی علاقوں میں بھی آباد رہا ہے جس کے نام کے مواضع ابھی تک اس کے نام سے موجود ہیں۔ قدیم ترین نسلی بلوچ قبائل کے صدیوں قبل کے آثار باقیہ کندھار اور ہرات سے لے کر سرحد ترکی و عراق تک کے درمیانی خطے میں موجودگی مصنفین کے اس موقف کو جھٹلانے کیلئے کافی ہیں کہ اس خطے کے مشرقی علاقوں میں بلوچ چودھویں اور پندرھویں صدی میں پہنچے ہیں۔ دراصل وہ بلوچوں سے مراد صرف رند و لاشار قبائل اور ان کے ساتھ نقل مکانی کرنے والوں سے لیتے ہیں۔ جو قدیم بلوچ تواریخ سے اُن کی عدم دلچسپی اور ناواقفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

9۔ "تاریخ بلوچستان" از رائے ہتورام، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 2009، صفحہ 168۔

10۔ "سرحد" کا علاقہ، ایران کے صوبہ کرمان کے مشرقی بلوچ اضلاع پر مشتمل ہوتا تھا جو قفتان کے شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔

11۔ ملاحظہ کیجئے موضوع "میر بجار کا سوراب اور وڈھ....." اور "میر بجار کی رندوں سے لڑائی" کا اشاریہ نمبر 5۔

نال

نال، ضلع خضدار جھلاوان کا ایک مغربی کوھستانی موضع ہے جو قبیلہ بیزنجو کا مسکن ہے۔ بیزنجو قبیلہ پانچ بڑے طائفوں پر مشتمل ہے جس میں حملانی، تندوانی، عمرانی، تمبرانی (اصل لفظ تھمرانی) اور سیاہ پھاد شامل ہیں۔ نسلی بیزنجو حملانی، تندوانی اور بعض عمرانی کو بھی بتاتے ہیں لیکن عمرانی سردار گھرانہ اس سے انکاری ہے۔ بیزنجو سردار گھرانہ حملانی ہے جو میر حمل بن بیزن بلفت کی نسبت سے ہے چونکہ حمل اپنے جمع کردہ اتحادیوں کے ساتھ براہو جدگال جنگ میں میروانی سردار میر بجار براہو کا اتحادی تھا۔ اس لئے اس کا لشکر بلوچی قبیلائی نظام کے تحت حملانی کہلایا۔ براہو جدگال جنگ کی بلوچی نظم میں کہا گیا ہے کہ جدگالوں سے ان کے علاقے فتح کرنے کے بعد مقبوضات کی تقسیم کے موقع پر حمل کو ان کی خدمات کے عوض ''نال'' کا علاقہ دیا گیا۔

جھلاوان گزیٹئر نے اس کی توضیح کچھ اس طرح کی ہے :

" میرواڑی (1) سردار میر بجار کا ایک نعل
میرواڑی جدگال لڑائی کے دن گر گیا جسے بیزن
(2) نے اٹھالیا۔ لہذا علاقہ اُسے دے دیا گیا جو
اب ''نال'' کے نام سے مشہور ہے''(3)

یوروپی مصنفین نے علاقائی وقبائلی اسماء کی وجہ تسمیہ کے ضمن میں جو بے معنی بات کسی چرواہے کی زبان سے سُنی، اسی پر اکتفا کر کے اُسے اپنی تحریروں میں سمو دیا اور اپنی کوئی تحقیق پیش نہیں کی۔ اس طرح ان سہل کاروں نے گزیٹئرز کو ویسے بے سروپا مفروضات سے بھر دیا۔ کوئی نادان سے نادان شخص بھی نال کے نام کے بارے میں مذکورہ انگریزی مفروضہ پر یقین نہیں کر سکتا۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ صرف میر بجار کا (گھوڑے کا) نال میر حمل کو مل جائے جس کو پیش کرنے پر اُسے ایک پورا گاؤں بخش دیا جائے اور اس صورت میں کہ گاؤں پہلے ہی سے بیزنجوؤں کا ہے اور میر بجار کا اپنا کوئی پدری میراث اس گاؤں میں نہیں ہے اور پھر یہ بات کہ نعل کے وجہ سے علاقہ کا نام ''نال'' پڑ جائے۔ کیا گھوڑے کا نعل ملنے سے قبل علاقے کا کوئی نام نہیں تھا؟ یقیناً تھا۔ تو پھر وہ نام کیا تھا؟۔

دراصل مذکورہ کہانی دیگر کئی کہانیوں کی طرح ایک مفروضہ اور بے بنیاد بات ہے۔ ''نال'' ایک قدیم نام ہے اور نال خود ایک قدیم تاریخی مقام ہے جسے بعض مورخین نے قدیم کیکانان کا مرکزی مقام بتایا ہے اس نال کے موضع کے علاوہ بلوچستان میں دیگر دو تین مواضع کے نام بھی ''نال'' ہیں۔ جیسے کہ مری علاقے میں ایک قدیم جگہ کا نام ''نال'' ہے۔ شمال کی سمت سے جب ''گندھار'' ندی اس مقام پر داخل ہو کر آگے بڑھتا ہے تو اسی قدیم غیر آباد مقام کے نام کی نسبت سے اس کا نام بدل کر ''نال کھور'' بن جاتا ہے۔ تو کیا یہاں بھی کسی لڑائی کے دن کسی کو گھوڑے کا نعل ملا تھا؟

بریں عقل ودانش بباید گریست

قیاس یہی ہے کہ یہ "نال" نام بھی کسی ہندی قبیلہ کا نام ہوگا جس کا کوئی گروہ کسی زمانے میں مذکورہ مقامات پر آباد ہوئے ہوں گے۔ بلوچستان کے طول وعرض میں ظہور اسلام سے قبل اور بعد میں بے شمار ہندی قبائلی گروہوں اور طائفوں کی آبادکاری کے آثارات ہیں۔ جن میں نال طائفہ بھی یقینی طور شامل ہوا ہوگا۔

حواشی:

1۔ اصل لفظ "میروانی" ہے۔ "میرواڑی" علاقے میں جتکی (جدگالی) زبان کے اثرات کی وجہ سے ہے۔ جتکی زبان کسی زمانے میں جہلاوان وآدھے سراوان کی زبان ہوتی تھی جس کی جگہ بعد میں بلوچی، کردی (براہوئی) اور فارسی نے لے تھی۔ موجودہ براہوئی اور مشرقی بلوچی پر اس نے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ اسی کے زیر اثر جہلاوان وسراوان کے قبائل کمبرانی، میروانی، سالانی، گرگینانی، رئیسانی ودیگر کمبراڑی، میرواڑی، سالاڑی، گرگیناڑی، رئیساڑی تلفظ کئے جاتے ہیں۔

2۔ "بیزن" اس جنگ کے زمانے میں زندہ نہیں تھا۔ لہذا مذکورہ بیان غلط ہے۔ حمل بیزنجو، میر بجار کا اتحادی تھا۔

3۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز : ڈسٹرکٹ جہلاوان، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 220۔

والدہ میر بجار میروانی

بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر ساراوان میں قبیلہ "دہوار" پر بحث کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ میر بجار میرواڑی (1) جس نے جدگالوں کو نکال باہر کیا زرخیل ماں کے بطن سے تھا۔ اور زرخیلوں نے جدگالوں کے خلاف میرواڑیوں کی مدد کی (2)

مذکورہ بیان یا روایت جسے یقیناً مستونگ کے خواجہ خیلوں نے گزیٹر پارٹی کو لکھوایا ہوگا ایک غیر تاریخی اور بے بنیاد بات ہے۔ میروانی قبیلہ میں یہ روایت کسی بھی جگہ موجود نہیں ہے میروانی سردار مرحوم میر قادر بخش کو جب ہم نے لکھا دکھایا تو ان کو بڑی حیرانی ہوئی تھی۔ اور جب ہم نے دوسری روایت کی تحریر دکھائی جو آخوند محمد صدیق نے "اخبار الابرار" میں لکھی ہے کہ میر بجار کی والدہ، اپنے شوہر میر عمر میروانی کے قتل کے بعد خواجہ خیلوں کی پناہ میں چلی گئی تھی اور ایک خواجہ خیل مرد سے شادی رچالی تھی تو وہ سر بہ گریبان ہوئے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر استغفار کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب جھوٹ ہے اور سچ وہی ہے کہ "گوشوء شیئر" (گوشو کی نظم) میں بیان ہوا ہے۔ گوشو کی نظم دراصل وہی بلوچی رزمیہ داستان ہے جو "براہو جدگال جنگ کی نظم" کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کا تذکرہ ہم نے مختلف موضوعات کی ذیل میں

بار بار کیا ہے۔اس شعری داستان میں کسی بھی مرحلے پر خواجہ خیلوں اور زرخیلوں کا نام یا تذکرہ نہیں آتا۔داستان کا میر بجار کی والدہ سے متعلق حصہ یوں بیان ہوا ہے :

"عومر گوں جدگال آں جتہ تاڑی
چانگرہ جٹ ءُ چینگر میرواڑی
عومر گوں براتاں بوتگ ات گاڑھی
گپتہ جدگال آں عومری ماڑی
بوتگ انت کوش ءُ درشتنت نیاڑی
مہناز گوں بجار خان پما خواری
چو مُرگ پڑانا رفتہ اندازی
گوں خواجہیں مرداں داشتگے سیادی
اچ سیداں مہناز نسب داری
تاں ہشت دہ سال بَرپشنگ نشتہ"

ترجمہ:(جب جدگالوں نے سوراب میں میروانی قلعے پر حملہ کیا) عمر نے جدگال حملہ آوروں کا دوبدو مقابلہ کیا۔ ایک طرف جٹ (3) تھے اور دوسری طرف میروانی تھے۔عمر اپنے بھائیوں کے ساتھ مقتول ہوا۔جدگالوں نے عمر کے قلعے پر قبضہ کیا اور قتل وغارتگری کی۔عورتیں قلعہ سے بھاگ گئیں۔مہناز (میر عمر کی بیوی) اپنے بچے بجار خان کو لیکر کسی چڑیا کی مانند اُڑ گئی تھی۔وہ نسباً سیدزادی تھی اور قبیلہ "خواجہ" کے

لوگوں سے تھی۔(جو پشین میں رہتے تھے) وہ آٹھ+دس (اٹھارہ) سال تک جا کر پشین میں رہی۔"

مذکورہ شعری داستان، جو میروانی شاعر کی کہی ہوئی ہے، واضح طور پر بتاتی ہے کہ میر بجار کی والدہ پشین کے قبیلہ "خواجہ"(4) کی سیدزادی تھی جو مذکورہ قتل وغارتگری سے اپنے کمسن بیٹے بجار کو بچا کر اپنے خواجہ رشتہ داروں کے پاس پشین چلی گئی اور اپنے بیٹے کو باپ اور قبیلہ کا انتقام لینے کیلئے تربیت دینے کے واسطے اٹھارہ سال تک وہیں رہی۔نظم میں موجودہ قبیلائی نام "خواجہ" کو خواجہ خیل صاحبان نے اپنے حق میں موڑنے کی ناکام کوشش کی ہے۔شعری داستان میں نہ زرخیلوں کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ کوئی زرخیل شخص میروانیوں کے سائیڈ پر جدگالوں کے خلاف لڑائی میں شامل رہا ہے۔سب کچھ دروغگوئی ہے۔

حواشی:

1۔اصل لفظ "میروانی" ہے۔جھکی یا جدگالی زبان کے اثر کی بنا پر "میرواڑی" بھی کہلاتا ہے۔

2۔بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز (سراوان ڈسٹرکٹ) حصہ دوئم مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، سال 1997ء صفحہ 938۔

3۔"جٹ" سندھیوں کو کہا جاتا ہے اور جدگال سندھی زبان اپنانے والے بلوچوں کیلئے مستعمل ہے۔نظم میں دونوں کے مشترکہ لشکر کو "جٹ" کہا گیا ہے۔

4۔پشین کے خواجہ سیّد، ہرات کے موضع "چشت" کے بزرگ خواجہ مودود (1039-1133ء) کی زرّیت سے ہیں۔ ان کے دوسرے بزرگ خواجہ معین الدین چشتی تھے جو بارھویں صدی عیسوی کی شخصیت تھے۔ان کے کچھ گھرانے کسی زمانے میں پشین میں منزکی میں آ کر بس گئے تھے۔ اور یہیں سے چند گھرانے مستونگ اور قلات بھی جا کر بس گئے تھے۔

" خواجہ " کے ہی نام سے ایک تُرک قبیلہ بھی رہا ہے۔تُرکی میں یہ قبیلہ اب بھی ہے۔مشہور لطیفہ باز" نُلا نصیر الدین" اسی خواجہ قبیلہ سے رہے ہیں۔ پاکستان کے بعض شہروں میں اس قبیلہ کے گھرانے موجود ہیں لیکن یہ خواجہ سید کہلاتے ہیں۔

یوروپی مصنّفین کے مفروضے

بلوچستان: بلوچ+ستان کے معنی "بلوچ قوم کا وطن یا بلوچ قوم کا علاقہ۔ یہ ترکیب فارسی زبان کی ہے۔ فارسی ترکیب کا استعمال یہ بتاتا ہے کہ بلوچ وطن کو "ستان" اُس دور میں کہا گیا جب فارسی زبان بلوچ خطے تک پہنچ چکی تھی اور مروج ہو چکی تھی۔لیکن بلوچستان لفظ بروقت تحریر میں نہ آ سکا اس سے یہ اخذ کرنا کہ لفظ "بلوچستان" قدیم نہیں ہے ایک جاہلانہ بات ہے۔اس جہالت کا تذکرہ کئی مصنّفین نے کیا خصوصاً یوروپی مصنفین نے۔جنہوں نے لکھا کہ اس بلوچ علاقے کو "بلوچستان" کا نام پہلی دفعہ نادر شاہ افشار نے دیا۔ اور اس مفروضے کو کئی مصنفین نے دھرایا(1) نادر شاہ تو اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط کی حکمران شخصیت ہے۔اس وقت تک تو بلوچستان کا نام پوری دنیا میں متعارف ہو چکا تھا۔گذشتہ صفحات میں حاکم قلات میر مندو رند پر بحث کرتے ہوئے "تاریخ افاغنہ" کا حوالہ دیا گیا جو نعمت اللہ خان کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔اس میں میر مندو کیلئے "بلوچستان کا امیر" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ رائے ہتورام اسے پندرھویں صدی عیسوی کا مروج نام لکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے جس زمانے میں بلوچ سیوستان میں آئے اور قلات وبنجارہ (5) کا نام قلات بلوچ میں بدل گیا تو سیوستان کا نام بھی بلوچستان ہو گیا تھا۔(6)

بلوچ ایک قدیم قوم ہے اور 5800 ق م کی نسل ہے۔ یہ قوم جہاں آباد تھی وہ ایک وسیع علاقہ تھا اور اس قوم کے نام سے تھا یعنی "بلوچ"۔ کسی قوم کے وطن کیلئے یہ ضروری نہیں کہ اُس کے نام کے ساتھ "ستان" کا بھی لاحصہ ہو۔ "ستان" ایران کی فارسی زبان کا لفظ ہے لیکن خود ایران "ایرانستان" نہیں کہلاتا نہ کہ آریاستان کہلاتا ہے۔ تو کیا اس کا مطلب یہی لیا جائے کہ ایران والوں کے وطن کا وجود نہیں ہے قدیم زمانے میں قوموں کے وطن یا مسکن اُس قوم ہی کے نام پر ہوتا تھا۔ اور وہ نام آج تک موجود ہیں۔ اسی طرح بلوچ وطن بھی زمانہ قدیم سے موجود رہا ہے اور ملک بلوچ "بلوچ"، بلوص، بیلوص نام کے علاقے مختلف زمانوں میں وجود رکھتے رہے ہیں اور تاریخی کتابوں میں اگرچہ تفصیل سے نہیں لیکن اشارتاً ان کی نشاندہی ہوتی رہی ہے۔ اور بعض زمانوں میں ان کا جغرافیہ بھی آگے پیچھے ہوتا رہا ہے لیکن اسی ایک ہی خطے ہی کے اندر یا آس پاس اُس کا وجود نظر آتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر موجودہ منقسم مغربی اور مشرقی مکران میں فارس کے پہلو میں ساڑھے چار ہزار سال سے "ملک بلوچ" موجود رہا ہے جس کا مرکزی مقام ضلع گوادر اور ضلع کیچ کے دشت کا "تنٹ سر" رہا ہے جہاں کالدیا کا عظیم بادشاہ نمرود بلوچ (نمرود دوئم) کا تاریخی قلعہ واقع تھا۔ جس کے دیوہیکل ملبہ جاتی آثار آج بھی نمرود کلات کے نام سے موجود ہیں۔ (2) اس "ملک بلوچ" کا تذکرہ ہزاروں سال بعد چھٹی صدی عیسوی سے دسویں صدی عیسوی کے درمیانی عربی تصنیفات میں بھی ملتا ہے۔ شریف ادریسی نے بلوچ قوم کے کوچ قبائل

کے حدود کی نشاندہی میں "ملک بلوچ" کا بھی نام لیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے :

" اُن کے پہاڑ خلیج فارس تک پہنچتے ہیں۔ شمال کی طرف کرمان تک، جنوب اور مشرق کی طرف سمندر تک اور مکران کے صحرا تک، مغرب میں سمندر اور ملک بلوچ، اور ماتبان اور ہرمز تک۔" (کتاب "نزہتہ المشتاق" عربی)

اس کے علاوہ موجودہ ایرانی صوبہ بلوچستان کے علاقہ "سرحد" کے ساتھ والا وسیع و عریض قدیم ہموار خطہ کا نام بھی "بلوچ" ہوتا تھا جس کا تذکرہ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کی نگارشات میں ملتا ہے اور اب بھی ایرانی کتابوں اور نقشوں میں اُسے "بلوچ سطح مرتفع" کہا گیا ہے۔ یہ بھی بلوچوں کے قدیم وسیع و عریض ملک کا ایک شمالی حصہ یا خطہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سن عیسوی کی آٹھویں صدی تک اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک مستونگ کے شمالی خطے میں بھی ایک بلوچ ملک ہوتا تھا جو "بلوص" بیلوص اور کبھی بیلوص " لکھا جاتا تھا۔ ملک محمد سعید دہوار لکھتے ہیں :

" ظہور اسلام کے وقت سندھ میں ایک وسیع سلطنت قائم تھی۔ جو شمال میں کشمیر تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں پنجاب کا ایک بڑا حصہ شامل تھا۔ شمال مشرق میں اس کی سرحدیں ریاست قنوج سے ملتی

تھیں۔ مغرب میں مکران یا کیچ مکران کردان
(کزدار) کیکان یا کیکانان کا وسیع خطہ اس میں شامل
تھا۔ شمال مغرب میں اس وسیع مملکت کی سرحدیں
سجستان کی حد تک اس وسیع علاقے کی حدود کو چھوتی
ہوئی کوہ سیاہ یا مہتر سلیمان کے دامن کے ساتھ پھیلی
ہوئی تھیں، جو بیلوس کے نام سے موسوم تھا۔
(3)"

آگے "عرب دور اقتدار" کے باب میں لکھتے ہیں کہ عربوں نے سیستان ۲۳ ہجری سنہ 644ء میں حملہ کر کے کئی علاقے فتح کیے جو حدود ہند تک تھے اور اس کے ساتھ ہی

" ولایت قندھار کے ایرانی صوبے پر بھی ان کا
تسلط ہو گیا جو اس زمانے میں رخج یا الرخج کے نام
سے موسوم تھا اور جس کو بیلوس کا نام بھی دیا جاتا تھا۔
(4)"

پھر آہستہ آہستہ بلوچوں کا یہ ملک بیرونی یلغاروں کی زد میں آتا گیا اور سکڑتا گیا اور اس سرزمین پر "الرخاج" یا "الرخج" کا نیا نام پڑتا گیا۔ ایک وقت آ گیا کہ "بیلوس" ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود ہو گیا۔ 977ء میں جب سلطان

سبکتگین نے اس خطے پر اپنا قبضہ جمایا تو یہی محدود خطہ "بیلوس" کہلاتا تھا۔ میجر ریورٹی نے اپنی کتاب "نوٹس آن افغانستان اینڈ بلوچستان" میں لکھا ہے کہ 977ء میں سبکتگین نے بُست پر قبضہ کرنے کے بعد جس میں بیلوس یا الرخاج کے تمام علاقے شامل تھے، خضدار پر حملہ کر دیا۔"

مندرجہ بالا جائزہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بلوچ وطن کا وجود قبل مسیح کے زمانوں سے ثابت ہے۔ صرف اس کے ساتھ فارسی کے "ستان" لاحقہ، فارسی زبان کے بلوچستان میں رائج ہونے کے زمانے کا ہے اور اسے نادر شاہ سے منسوب کرنا تاریخ سے لاعلمی اور ایک ذہنی اختراع ہے۔

حواشی:

1۔ اُردو دائرۃ المعارف "1975ء لاہور، جلد چہارم صفحہ 868۔
2۔ ملاحظہ کیجیے گذشتہ صفحات میں "بُرزکوہی" کا اشاریہ نمبر 7۔
3۔ "تاریخ بلوچستان" از ملک محمد سعید دہوار، مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سال 2007ء صفحہ 250۔ نیز دیکھئے موضوع "ریئسانی" کا اشاریہ نمبر 6۔
4۔ ایضاً صفحہ 259۔

5۔یہ نام ''قلات وبنجارہ'' نہیں ہے جیسے کہ ہتورام نے لکھا ہے اور نہ کہ ''قلات بنجارہ'' ہے جیسے کہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں تحریر کیا ہے۔ یہ ''قلات نیچارہ'' ہے جس کا نام آج بھی یہی ہے۔آئین اکبری میں شاید کتابت کی غلطی سے بنجارہ لکھا گیا ہوگا یا پھر انہوں نے بنجارہ سنا ہوگا۔یا پھر اس زمانے میں موجود ایک آوارہ قبیلہ ''بنجارہ'' کو دیکھ کر وہ اسے بھی بنجارہ سمجھتے ہوں گے۔عربوں کی تواریخی کتابوں میں بھی ایسی بیسویں غلطیاں موجود ہیں۔جنہیں بجائے اصلاح کرنے کے اسی حیثیت سے قبول کیا جاتا رہا ہے۔روایتاً نیچارہ ایک قدیم تُرک قبیلہ تھا۔جس کا یہ قلات (قلعہ) تھا۔

6۔تاریخ بلوچستان: ہتورام، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ، 2009ء صفحہ 320۔